بیسویں صدی کے
شعرائے دہلی
(جلد دوم)

مرتّب عظیم اختر

اردو اکادمی دہلی

بیسویں صدی کے

شعرائے دہلی — جلد دوم

(شعرائے متاخرین و معاصرین: ۱۹۵۱ء — ۲۰۰۰ء)

(از سین تا یائے)

مرتّب
عظیم اختر

اردو اکادمی، دہلی

فہرست

(جلد دوم)

(س)

(ش)

(ص)

(ض)

(ط)

(ظ)

(ع)

(غ)

(ف)

(ق)

(ک)

(گ)

(م)

شاعرات

ساحر ہوشیار پوری

ساحر ہوشیار پوری جن کا خاندانی نام رام پرکاش تھا، اسکول رجسٹر کے مطابق ۵/مارچ ۱۹۱۳ء کو ہوشیار پور میں پیدا ہوئے، لیکن ساحر کے آخری مجموعۂ کلام "سحرِ خیال" (مرتبہ نارنگ ساقی) میں شامل ایک قطعہ کے مطابق جو انھوں نے ۱۱/فروری ۱۹۸۷ء کو اپنے ۷۵ ویں یومِ پیدائش کی ایک تقریب کے موقع پر کہا، ان کی صحیح تاریخِ پیدائش ۱۱/فروری ۱۹۱۲ء ہی ہے۔

ساحر ہوشیار پور کے ایک تع [illegible] نہایت ہی متمول خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ شاعری میں ان کو داغ دہلوی۔ [illegible] ر د پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی سے تلمذ حاصل تھا۔ تقسیم سے قبل ہوشیار پور میں ان کے والد ماجد کا بڑا کاروبار تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی اور کوئی فکرِ معاش نہیں تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے آس پاس بھرے پُرے خاندانی کاروبار کو چھوڑ کر ساحر نے دہلی میں بود و باش اختیار کر لی۔ دہلی میں نجی ملازمتیں اور اپنا ذاتی کاروبار کر کے ایک کامیاب زندگی گزاری اور ۱۸/دسمبر ۱۹۸۴ء کو پرلوک سدھار گئے۔

ساحر ہوشیار پوری ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت متحرک اور سرگرم انسان تھے۔ متعدد ادبی انجمنوں اور تنظیموں سے وابستہ تھے۔ تحت اللفظ میں پڑھنے کے باوجود مشاعروں میں مقبول تھے اور ہر جگہ پسند کیے جاتے تھے۔ نعت و سلام بڑے

اہتمام اور عقیدت سے کہتے تھے۔

''سحرِ غزل'' (۱۹۵۹ء)، ''سحرِ نغمہ'' (۱۹۷۰ء)، ''سحرِ حرف'' (۱۹۸۲ء) ساحؔر کے شعری مجموعے ہیں جو ان کی زندگی میں ہی منظرِ عام پر آئے۔ ''سحرِ خیال'' آخری مجموعہ ہے جسے ۱۹۹۰ء میں نارنگ ساقی نے مرتب کیا۔ ان شعری مجموعوں کے علاوہ ساحؔر نے ماہنامہ کتاب نمائی دہلی کا ''یادگارِ جوش ملسیانی نمبر''، ہریانہ پردیش کے شاعروں کا تذکرہ ''بساطِ فکر'' (۱۹۸۸ء) اور ''نقوشِ داغ'' جیسے مجموعے بھی مرتب کیے جن کو ہریانہ پردیش اردو اکادمی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔

ساحؔر نے ۱۹۳۹ء میں بھگوان مہاویر کی زندگی اور تعلیمات کو ''مہاویر مہما'' کے عنوان سے شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

شام کو صبح، اندھیرے کو اُجالا لکھیں
عالمِ شوق میں کیا جانیے ہم کیا لکھیں

مدعا لکھیں، طلب لکھیں، تمنا لکھیں
اتنا کچھ لکھ کے بھی ہم خط کو ادھورا لکھیں

کوئی خوشبو، نہ کوئی رنگ، نہ کوئی آواز
دل کو ہم سنگ نہ سمجھیں تو اسے کیا لکھیں

اک اسی سوچ میں گم ہو گئے کتنے موسم
اُن سے ہم حال زبانی ہی کہیں، یا لکھیں

ہم کو اصرار کہ ظلمت کو ضیاء کیوں مانیں
اُن کا یہ حکم کہ ہر شب کو سویرا لکھیں

مصلحت ہم کو بھی مرغوب ہے لیکن کب تک
خار کو پھول کہیں، دشت کو دریا لکھیں

حسنِ معصوم کو موسوم کریں قاتل سے
اور قاتل کو زمانے کا مسیحا لکھیں

داستانِ دلِ خوں گشتہ کہاں تک ساحرؔ
اب غمِ ذات سے ہٹ کر غمِ دُنیا لکھیں

○

خواب دیکھے تھے سہانے کتنے
جاگ اُٹھے درد پرانے کتنے

ایک جلوے کی فراوانی سے
بن گئے آئینہ خانے کتنے

چال سے حال کی لاتے ہیں خبر
لوگ ہوتے ہیں سیانے کتنے

بوجھ کر بھی نہ بتاؤں تجھ کو
تیری مٹھی میں ہیں دانے کتنے

بے ارادہ جو ہوئے اشک رواں
لُٹ گئے غم کے خزانے کتنے

تم ذرا روٹھ کے دیکھو تو سہی
لوگ آتے ہیں منانے کتنے

ہم نے صرف ایک تبسّم کے لیے
زخم کھائے ہیں نہ جانے کتنے

ڈوب مرنے کا نہیں کوئی جواز
زندہ رہنے کے بہانے کتنے

سرد مہری سے تری محفل میں
جل بجھے لوگ نہ جانے کتنے

یادِ ماضی سے سمٹ آئے ہیں
ایک لمحے میں زمانے کتنے
اک نظر دیکھا تھا اُس نے ساؔحر
گھڑ لیے دل نے فسانے کتنے

○

تیرے محل میں کیسے بسر ہو، اس کی تو گیرائی بہت ہے
میں گھر کی انگنائی میں خوش ہوں میرے لیے انگنائی بہت ہے
اپنی اپنی ذات میں گم ہیں، اہلِ دل بھی، اہلِ نظر بھی
محفل میں دل کیوں کر بہلے، محفل میں تنہائی بہت ہے
غرقِ دریا ہونا یارو! غالبؔ نے کیوں چاہا آخر
ایسی مرگِ لاوارث میں، سوچو تو رُسوائی بہت ہے
دشمن سے گھبرانا عبث ہے، غیر سے ڈرنا بھی لاحاصل
کُل کا گھاتک، گھر کا بھیدی ایک بھبھیشن بھائی بہت ہے
برسوں میں اک جوگی لوٹا، جنگل میں پھر جوت جگائی
کہنے لگا اے بھولے شنکر، شہروں میں مہنگائی بہت ہے
اپنی دھرتی ہی کے دُکھ سُکھ، ہم ان شعروں میں کہتے ہیں
ہم کو ہمالہ سے کیا مطلب، اس کی تو اونچائی بہت ہے
پُرسشِ غم کو خود نہیں آئے، اُن کا مگر پیغام تو آیا
ہجر کی رُت میں جانِ حزیں کو، دور کی یہ شہنائی بہت ہے
دل کی کتابیں پڑھ نہیں سکتا، لیکن چہرے پڑھ لیتا ہوں
ڈھلتی عمر کی دھوپ میں ساؔحر اتنی بھی بینائی بہت ہے

○

غم کا صحرا نہ ملا، درد کا دریا نہ ملا
ہم نے مرنا بھی جو چاہا تو وسیلہ نہ ملا

مدّتوں بعد جو آئینے میں جھانکا ہم نے
اتنے چہرے تھے وہاں اپنا ہی چہرہ نہ ملا
قتل کر کے وہ غنیموں کو جو واپس آئے
اپنے ہی گھر میں انھیں کوئی شناسا نہ ملا
ہم بھی جا نکلے تھے سورج کے نگر میں ک دن
وہ اندھیرا تھا وہاں اپنا بھی سایہ نہ ملا
تشنہ لب یوں تو زمانے میں کبھی ہم نہ رہے
پیاس جو دل کی بجھا دیتا وہ دریا نہ ملا
مل گئے ہم کو صنم خانوں میں کتنے ہی خُدا
ڈھونڈنے پر کوئی بندہ ہی خدا کا نہ ملا
آپ کے شہر میں پیڑوں کا نہیں کوئی شمار
دو گھڑی رُکنے کو لیکن کہیں سایہ نہ ملا
سبز پتّوں سے ملا ہم کو بہاروں کا سراغ
شاخِ نازک پہ مگر کوئی شگوفہ نہ ملا
مستحق ہم تری رحمت کے نہ ہونے پائے
تیری دنیا میں کوئی عذر خطا کا نہ ملا
خودنمائی تھی مجھے بھی اس دور میں ہم کو ساحر
کوئی قاتل نہ ملا، کوئی مسیحا نہ ملا

O

آرزو اظہار تک آتی نہیں
سعیِ دل مشکور ہو پاتی نہیں
گھر سے نکلے تھے جہاں جاننے کو ہم
رہ گزر کوئی وہاں جاتی نہیں

اب جہاں لے جائے پروازِ جنوں
آسماں سے تو نِدا آتی نہیں

ہم نے اتنے گھر جلا ڈالے، کہ اب
اپنے گھر کی یاد تک آتی نہیں

دل وہ صحرا ہے کہ جس میں رات دن
پھول کھلتے ہیں، بہار آتی نہیں

یہ رواں ہے سوئے فردا ہر گھڑی
زندگی ماضی کو دُہراتی نہیں

ہے عروسِ وقت کتنی سخت جاں
ٹھوکریں کھاتی ہے گھبراتی نہیں

خواہشِ جام و سبو، قربِ حبیب
دل کی یہ دیوانگی جاتی نہیں

اِس قدر مانوس ہے ساحؔر سے غم
اب طبیعت غم سے گھبراتی نہیں

○

خدا جانے یہ قہر آلود ہے یا مہر افشاں ہے
کسی کی ہر نظر لیکن سکونِ دل کا ساماں ہے

معمہ ہے نہ گتھی ہے نہ یہ خوابِ پریشاں ہے
کہ پیکر زندگی کا مظہرِ انوارِ یزداں ہے

کوئی ہندو کوئی سکھ ہے کوئی گبرو مسلماں ہے
تری دُنیا میں یارب کوئی ایسا ہے جو انساں ہے

ڈکیتی، قتل، خوں ریزی، فساد، آتش زنی، اغوا
الٰہی! اشرف المخلوق انساں ہے کہ شیطاں ہے؟

یہ کس کے خال و خد بنتے، بگڑتے، مٹتے رہتے ہیں
یہ کیسا شخص ہے جو سامنے ہے اور پنہاں ہے

فصیل احساس کی ہو یا صدائے کربِ خودسوزی
یہی دیوارِ زنداں ہے، یہی زنجیرِ زنداں ہے

نہ گُل مہکے، نہ کاگ اُچھلے، نہ تم آئے نہ ہم بہکے
یہی فصلِ بہاراں ہے تو کیا فصلِ بہاراں ہے

خلوص، احساس، نیکی، صدق، ہمدردی بجا لیکن
محبت ہی نہیں دل میں تو پھر یہ کشتِ ویراں ہے

تتبع میرزا غالب کا ناممکن سہی ساحر
مگر اس کی زمیں میں شعر کہہ لینا تو آساں ہے

□□

ساغر خیامی

ساغر خیامی، جن کا خاندانی نام رشید الحسن ہے، ۷ رجون ۱۹۴۶ء کو لکھنؤ کے ایک ایسے علمی اور دینی گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں شعر و ادب کی جڑیں بہت گہری تھیں اور باپ، بھائی سب شاعر تھے۔ شاعروں کے اس خاندان میں سنجیدہ شاعری کے ساتھ طنز و مزاح کی شاعری کی روایت بھی موجود تھی اور ایک بھائی ناظر خیامی، جو جوانی میں داغِ مفارقت دے گئے، طنز و مزاح کے ایک کامیاب شاعر تھے۔

ساغر خیامی نے گھر کے بڑوں کی شعری روایت کو سنبھالتے ہوئے غزل گوئی سے اپنے شعری و ادبی سفر کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ تک غزل کے گیسو سنوارتے رہے لیکن مزاح گو بھائی کے ناگہانی انتقال کے بعد خاندان میں طنز و مزاح کی شعری روایت کو زندہ رکھنے کے لیے رنگِ سخن بدلا اور پھر طنز و مزاح کے ہی ہو رہے۔

ساغر خیامی کی ابتدائی تعلیم عربی و فارسی سے ہوئی اور اس تعلیم کی رعایت سے مولوی بھی بنے لیکن علم کا شوق انھیں اسکول اور کالج لے گیا، جہاں سے فارغ ہو کر وہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے غیر تدریسی عملے سے وابستہ ہو گئے۔ ساغر اردو طنز و مزاح کے واحد شاعر ہیں جو اردو مشاعروں کی طرح ہندی کے کوی سمیلنوں میں بھی بے حد مقبول ہیں اور اپنے عام فہم، سادہ و سلیس اسلوب کی وجہ سے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غالب اپارٹمنٹس

سالم نہ بام و در ہیں نہ سڑکیں ہیں استوار
چمگادڑوں کے جھنڈ، کبوتر ہیں بے شمار
لاکھوں ہیں مکھیاں یہاں اور چونٹیاں ہزار
دلّی میں ایک اور بھی غالبؔ کا ہے مزار

مرنا مجھے کہاں تھا کہاں جا کے میں مرا
غالبؔ اپارٹمنٹ میں غالبؔ کا مقبرا

روغن نہ بام و در پہ نہ اینٹوں میں جوش ہے
دیوار جھک رہی ہے تو ہر در خموش ہے
ہنگامہ ہائے نوش نہ جوش و خروش ہے
ساقی میکدہ یہاں چائے فروش ہے

ہوتا ہے یہ ہی دوستو جب دن بگڑتے ہیں
مچھوئے یہاں پہ آن کے مچھلی پکڑتے ہیں

برسات میں نکلتے نہیں لوگ دن ڈھلے
کیچڑ کمر کمر ہے تو پانی گلے گلے
رسوائیوں کے ختم نہ ہوں گے یہ سلسلے
دیکھی مکاں کی چھت تو وہ بولے کہ ہم چلے

کیا ہے ضروری دفن ہوں دو اک مزار میں
"اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں"

گر ہو قدِ دراز نہ نکلے جھکے بغیر
بیٹھے ہی بیٹھے کر لے نظر سارے گھر کی سیر

کمرے کشادہ اتنے نہ پھیلیں کسی کے پیر
آجائیں اتفاق سے مہماں جو شب بخیر
سوتے ہیں ہماری رات نشیب و فراز میں
دولھا دُلہن تو میز پہ بچّے دراز میں

مت کیجیے یقین ہماری زبان کا
خود لیجیے آ کے جائزہ شعری بیان کا
کوئی نہیں بھروسہ ہمارے مکان کا
برسات میں مت آیئے خطرہ ہے جان کا

کھایا ہے سب نے مال یہ سب کا خیال ہے
ریتے پہ ہے کھڑی ہوئی بلڈنگ کمال ہے

غالبؔ دلّی میں

غالبؔ نے کی یہ عرض خداوندِ ذوالجلال
جنت سے کچھ دنوں کے لیے کر مجھے بحال
مہ وش مرے کلام کو سازوں پہ گائے ہیں
قسمت نے بعد مرنے کے کیا دن دکھائے ہیں
شاعر جو منحرف تھے وہ مرعوب ہو گئے
ایواں جو میرے نام سے منسوب ہو گئے
خادم کا اس ادارے سے رشتہ ہے باہمی
اک بار میں بھی دیکھ لوں غالبؔ اکادمی
ہر شخص کے حضور میں پھیلائے ہات تھا
ناقدریوں کے دور میں فدوی حیات تھا

حکمِ خدا ہوا کہ ذرا جلد جایئے
دنیا کو جاکے پھر سے ذرا دیکھ آیئے
ساغرؔ بہ احترامِ خدا کے وکیل نے
دلّی میں لاکے چھوڑ دیا جبرئیل نے
اک ساتھ دو بسیں جو بھنا بھن گزر گئیں
حوروں نے جو سنواری تھیں زلفیں بکھر گئیں
کاندھے سے کاندھا مار کے مہ وش نکل گیا
اولیٰ سے ثانی شعر کا میٹر بدل گیا
بیٹھے جو بس میں اور ہوئے ہوش باختہ
جنت کی سمت اُڑتی نظر آئی فاختہ
جھٹکے سے بس کے ریشمی پوشاک پھٹ گئی
جھرمٹ میں لڑکیوں کے تھے اور جیب کٹ گئی
دیکھا جو ہپّیوں کو تو دل شاد ہوگئے
سمجھے کہ قیدی قید سے آزاد ہوگئے
خفیہ پولیس عادت و اطوار دیکھ کر
پیچھے لگی تھی جبّہ و دستار دیکھ کر
غالبؔ کی جو نگاہ اِدھر سے اُدھر گئی
اردو کی اک کتاب نظر سے گزر گئی
اردو کے زرنگار کسی آفتاب نے
طوطے کو 'ت' سے لکھا تھا خانہ خراب نے
غالبؔ یہ سمجھے یار کہیں پوپلا نہ ہو
تصنیف کرنے والا کہیں توتلا نہ ہو

یہ داغ دُھل سکیں گے نہ اشکوں کے دھوئے سے
تا عمر میں نے لکھا ہے طوطے کو طوئے سے
آنے تھے چار روز کو جلدی گزر گئے
غالبؔ وفورِ شرم سے دو دن میں مر گئے
پوچھا خدا نے حال تو غالبؔ نے یہ کہا
جنت سے اب نہ جائے گا یہ بندۂ خدا
جینا زمانے والوں نے دشوار کر دیا
پہچاننے سے بھی مرے انکار کر دیا
آئی صدائے حق کہ یہی بند وبست ہیں
تیرے وطن کے لوگ تو مردہ پرست ہیں

○

اک روز ہم سے کہنے لگی ایک گلبدن
عینک سے باندھ رکھی ہے کیوں آپ نے رسن
ملتا ہے کیا اسی سے یہ اندازِ فکر وفن
ہم نے کہا کہ ایسا نہیں ہے جنابِ من
بیٹھے جہاں حسین ہوں کچھ بزمِ عام میں
رکھتے ہیں ہم نگاہ کو اپنی لگام میں

○

بھارت ہے کبھی بند کبھی کوئی نگر بند
رہتی ہے ہر اک چیز یہاں شام وسحر بند
ریلیں ہیں اگر جام تو ہیں اہلِ سفر بند
ڈھیلے ہوئے جاتے ہیں غریبوں کے کمر بند
دنیا مری تہذیب مٹانے پہ تلی ہے
رہنا تھا جسے بند وہی چیز کھلی ہے

○

ڈھونڈا بہت جناب نہ وحدانیت ملی
انساں ملے ہزار، نہ انسانیت ملی
ہر شے میں اختلاف ملا آپ کی قسم
بس ریلوے کی چائے میں یکسانیت ملی

○

مفلسی کے شکار سوتے ہیں
ایک کمبل میں چار سوتے ہیں
کھینچ لے جائے پانچواں نہ کہیں
سب کے سب ہوشیار سوتے ہیں

○

ہم کو ترقیوں نے یہ کیسا بنادیا
دل سی یتیم چیز کا بھرتا بنادیا
بچوں کو بچپنے میں ہی بوڑھا بنادیا
ڈبوں کا دودھ دینے سے ڈبا بنادیا

چلنے میں بھی لڑھکنے کی آواز تن سے آئے
سر پر چپت لگاؤ تو آواز ٹن سے آئے

عشق کا کھیل کوئی کھیل تماشا بھی نہیں
ایسا عنوان ہے جس کی پریبھاشا بھی نہیں
زندگی چین سے گزرے گی یہ آشا بھی نہیں
حسن تولہ ہے کبھی اور کبھی ماشا بھی نہیں

عشق جو ایک طرف ہو تو مزا دیتا ہے
ورنہ بچوں کی یہ تعداد بڑھا دیتا ہے

□□

ساغر نظامی

اردو دنیا میں مشاعروں سے روزی روٹی کمانے، ادب کو ذریعۂ معاش بنانے اور مشاعروں میں مقبولیت و داد و ستائش کے سحر میں گم ہو کر زندگی کی بنیادی حقیقتوں سے چشم پوشی کرنے والے شاعر ہمیشہ پریشانی، تنگدستی اور اقتصادی بدحالی کا شکار رہتے ہیں اور ایک حرماں نصیب زندگی گزارتے ہیں۔ سردار محمد صمد یار خاں ساغر نظامی کا ذریعۂ معاش بھی شاعری تھا اور مشاعرے بنیاد کا پہلا پتھر ——— آزادیِ ہند سے تقریباً بیس پچیس سال قبل برصغیر کے چھوٹے بڑے مشاعروں میں جن شاعروں کا طوطی بولتا تھا ان میں جگرؔ، جوشؔ اور ساغرؔ نظامی سرِ فہرست تھے۔ صحیح معنوں میں مشاعروں کا وہ دور جگرؔ، جوشؔ اور ساغرؔ سے ہی عبارت تھا۔

مشاعروں میں مقبولیت اور کامیابیوں کے باوجود ساغر نظامی اردو کے وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے داد و ستائش کے اس وقتی سحر میں گم ہو کر زندگی کی بنیادی حقیقتوں سے منہ نہیں موڑا اور مشاعروں سے حاصل ہونے والی فتوحات پر زندگی کا گھروندہ تعمیر نہیں کیا بلکہ عمل اور جہدِ مسلسل کی راہ اختیار کی، طباعت و اشاعت کا کام کیا، خوبصورت ادبی کتابیں چھاپیں، پرنٹنگ پریس لگایا، ادبی رسالے نکالے، فلمی نغمہ نگاری اور مکالمہ نویسی کی۔ باضابطہ تعلیم اور یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریاں نہ ہونے کے باوجود آل انڈیا ریڈیو کے لٹریری ایڈوائزر، پروڈیوسر اور ڈپٹی چیف کے عہدوں پر پہنچے اور اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں ایک نہایت کامیاب اور آسودہ حال زندگی گزاری۔

ساغر نظامی ۲۱ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو علی گڑھ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس گھرانے کے افراد کے ناموں کے ساتھ سردار کا لاحقہ خاندان کے وقار کی علامت تھا۔ ان کے والد سردار احمد یار خاں صاحب ڈاکٹر تھے اور سرکارِ وقت کے ملازم تھے۔ ساغر نظامی نے ہائی اسکول تک تعلیم پائی اور شاعری میں علامہ سیماب اکبرآبادی کی شاگردی اختیار کی۔ ساغر نظامی اردو کے ادبی منظرنامے پر کم و بیش ساٹھ برس تک چھائے رہے۔ آزادیٔ وطن سے پہلے ساغر نظامی نہ صرف مشاعروں بلکہ سیاسی جلسوں میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ ان جلسوں میں ساغرؔ ایک وطن پرست شاعر کے روپ میں انقلابی نظمیں اور حب الوطنی کے نغمے سنا کر ہم وطنوں کے دل گرمایا کرتے۔

ساغر نظامی کے ترنم کی طرح ان کی شخصیت بھی دلکش اور متاثر کن تھی۔ خوبرو، خوش گلو، خوش لباس، نفاست پسند، شائستہ مزاج ــــــ بڑھتی عمر میں گرچہ سامعین پر سحر کرنے والے ترنم نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور ساغرؔ تحت میں کلام سنانے لگے تھے لیکن ان کی شخصیت وہی بے شکن، کھری اور متاثر کن رہی ــــــ کام کرتے رہنے کی لگن ساغر نظامی کے یہاں بے پناہ موجود تھی۔ ان کا تخلیقی عمل زندگی بھر زور و شور سے جاری رہا۔ ریڈیو کی ملازمت اور آزادیٔ ہند سے پہلے انھوں نے اپنی متعدد کتابیں شائع کیں، ایشیا جیسا ادبی رسالہ جاری کیا، فلموں میں گیت، مکالمے لکھے اور ریڈیو کی ملازمت کے دوران آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگراموں کی دیکھ بھال کے علاوہ متعدد منظوم اور نثری ڈرامے، کہانیاں، منظوم فیچر، نثری فیچر، مضامین اور تقریریں لکھیں، گرچہ یہ تمام کاوشیں فرائضِ منصبی کی انجام دہی کا نتیجہ ہیں، لیکن ان میں سے بہت سی کاوشوں کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ شکنتلا کا منظوم ترجمہ اور انارکلی کی کہانی کو اوپیرا کے پیرائے میں نظم کی شکل میں ڈھالنا ساغر نظامی کی ایسی ہی اہم ادبی تخلیقات ہیں۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد حکومت نے ان کی قومی و ادبی خدمات کے پیشِ نظر ''اقامتی شاعر'' (Poet-in-Residence) کے عہدے پر فائز کیا اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کی منظوم تاریخ لکھنے کا فریضہ سپرد کیا گیا جس کی پہلی جلد ''مشعلِ آزادی'' منظرِ عام پر آچکی ہے۔

ساغر نظامی کی دیگر تصانیف میں رُباعیات کا مجموعہ ''شبابیات'' (۱۹۲۵ء)، ایک

طویل افسانہ ''تہذیب کی سرگزشت'' (۱۹۲۷ء)، غزلوں کا مجموعہ ''صبوحی'' (۱۹۳۴ء)، افسانوں کا مجموعہ ''کہکشاں'' (۱۹۳۴ء)، غزلوں، گیتوں اور نظموں کے مجموعے ''بادۂ مشرق''، ''رنگ محل'' (۱۹۴۳ء)، ''موج و ساحل'' (۱۹۴۹ء) ایک طویل نظم ''نہرو نامہ'' (۱۹۶۷ء) شامل ہیں۔ ساغر نظامی نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں بعض ادبی اخبارات و رسائل کی ادارت بھی کی جن میں ماہنامہ ''پیمانہ'' آگرہ (۱۹۲۳ء)، ''علی گڑھ پنچ'' (۱۹۲۹ء) اور ماہنامہ ''ایشیا'' (۱۹۳۴ء) جیسے ادبی جریدے شامل ہیں۔

ساغر نظامی کی طویل ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے جنوری ۱۹۶۹ء میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا۔ حب الوطنی، قوم پرستی اور انسان دوستی کے گیتوں کا یہ مغنّی ۲۷ر فروری ۱۹۸۴ء کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

بدی کو پرکھو ملے گی نیکی، غموں کو سمجھو خوشی ملے گی
جہاں جہاں ہے گھنا اندھیرا وہیں وہیں روشنی ملے گی

خرد کو اپنی جنوں بنا کر جو زندگی کو خراج دے گا
یہاں اسی صاحبِ خرد کو جنوں کی پیغمبری ملے گی

پلائے جا تند و تیز ساقی نہ میں ہوں باقی نہ تو ہے باقی
نہ اجرِ کم ہمتی ملے گی نہ دادِ تشنہ لبی ملے گی

کسے گماں تھا کہ زعمِ خالق کے باوجود آدمِ حزیں کو
نہ عشرتِ خواجگی ملے گی، نہ لذتِ بندگی ملے گی

یہ ناامیدی، یہ بے یقینی تعیین وا سید کی جھلک ہے
انھیں اندھیروں کو پار کر کے تعیین کی روشنی ملے گی

ہزار ہو خاک قلب ساغر مگر اسی خاک میں ہے جوہر
تلاش جب اہلِ دل کریں گے شرر کی دنیا دبی ملے گی

○

پھر رہِ عشق وہی زادِ سفر مانگے ہے
وقت پھر قلبِ تپاں دیدۂ تر مانگے ہے

سجدے مقبول نہیں بارگہہِ ناز میں اب
آستاں حسن کا سجدے نہیں سر مانگے ہے

صرف آنسو نہیں، اب حسن کی محفل میں قبول
حسن نذرانۂ طوفانِ شرر مانگے ہے

ہاتھ کو ہات سجھائی نہیں دیتا ہے یہاں
اور شبِ تار اندھیرے سے سحر مانگے ہے

اب اندھیرا شبِ فرقت کو بھی منظور نہیں
شبِ فرقت بھی اندھیرے سے سحر مانگے ہے

اب کہیں تیرا ٹھکانہ نہیں اے تنگِ جنوں
خانہ ویرانی مری دشت میں گھر مانگے ہے

کس نے پہنچا دیا اس ہوش رُبا وادی میں
کہ جہاں وحشتِ دل زادِ سفر مانگے ہے

کوئی بیزاری سی بیزاری ہے اے بابِ قبول
جو دعا ہے وہ نیا بابِ اثر مانگے ہے

کب تک آخر انھی فرسودہ ستاروں کی ضیا
میری دھرتی نئے خورشید و قمر مانگے ہے

میری دنیا کے تقاضوں ہی پہ موقوف نہیں
دین بھی ایک نیا فکر و نظر مانگے ہے

عشق کو زاویۂ دید بدلنا ہوگا
جلوۂ حسن نیا ذوقِ نظر مانگے ہے

قرض تو قرض ہے اور قرض چکانا ہوگا
ہر شبِ تار اندھیرے سے سحر مانگے ہے

سب کی آنکھوں سے بچا کر جو کبھی لوٹے تھے
وقت ہر چور سے وہ لعل و گہر مانگے ہے
دین و دُنیا ہو کہ ہو عشق و ہوس اے ساغر
ہر کوئی خونِ جگر ، خونِ جگر مانگے ہے

○

کہیں نفاق و جنگ میں نجاتِ کائنات ہے
اگر کہیں نجات ہے تو عشق میں نجات ہے
سوادِ شہرِ عشق میں نہیں ہے موت کا گزر
حیات ہی حیات ہے حیات ہی حیات ہے
سزا جزا کی قید سے بری ہے پیار کی نظر
نجات ہی نجات ہے نجات ہی نجات ہے
تمام کائنات میں لُٹا دے پیار کی نظر
کہ پیار کی نگاہ میں نجاتِ کائنات ہے
ہم اک زمین پر اُگے ہم اِک زمین پر کھلے
زمیں ہی میری ذات ہے زمیں ہی تیری ذات ہے
نہ جانے کتنوں کی ہے خاک اس زمین کی گود میں
جو ذرّہ ہے تمدنوں کی ایک کائنات ہے
غرور میں قدم اُٹھا، مگر ذرا یہ سوچ کر
تہہِ زمیں بسی ہوئی اک اور کائنات ہے
خوشی خوشی سے ساتھ ساتھ زندگی گزار دے
نہ یاں مجھے ثبات ہے نہ یاں تجھے ثبات ہے
جگاؤ رہنماؤں کو ، اٹھاؤ رہنماؤں کو
بڑی گھنیری صبح ہے بڑی اندھیری رات ہے
تغیّرات کا جلوس آ چکا ہے شہر میں
خبر کرو انھیں، جنھیں غمِ تغیّرات ہے

○

اے ہم نوا خودی کو کروں کس طرح بلند
جکڑا ہوا ہے جبرِ مشیّت سے بند بند
اِک جانِ زار اور دو عالم کی قید و بند
دُنیا بھی اک کمند مشیّت بھی اک کمند
ان کا مقام صوفی و شاعر سے ہے بلند
جو رِند ڈالتے ہیں مہ و مہر پر کمند
جیسے یہ کائنات ہے اک طنزِ مستقل
ہر وقت زندگی کے لبوں پر ہے زہر خند
ہو اس سے کس طرح مرے دل کا معاملہ
دنیا خرد پرست ، محبت جنوں پسند
دشمن سے بھی گمان نہیں اُس گزند کا
ہوتا ہے آدمی کو خود اپنے سے جو گزند
تمئیز نیک و بد ہی اٹھی جب تو کیا کہیں
کیا شے ہمیں پسند ہے اور کیا نہیں پسند
آئینِ مے کشی میں طلب اک گناہ ہے
پیتے نہیں ہیں مانگ کے زندانِ سر بلند
عشقِ شرابِ کہنہ پرستاریِ جمال
سُن اے مریضِ غم کہ یہ نسخہ ہے سود مند
یاں دورِ جام نغمۂ مطرب، ہجومِ حسن
ناصح کے پاس کیا ہے فقط اک خروشِ پند
اے تلخیِ حیات، سراپا نہ اس کا پوچھ
رفتار موجِ مے ہے تو گفتار جامِ قند
سر جس کی آرزو میں جھکانا پڑے مجھے
وہ تاج بھی نہیں ہے مری جاں مجھے پسند

طوفانِ زندگی سے تعلق کی شرط ہے
نم ہو ذرا تو خلد بنے خاکِ دیوبند
جس میں نہ ہو حیات کی تلخی کی چاشنی
وہ عیشِ جاوداں بھی نہیں ہے مجھے پسند
میری نوا کی گونج ہے از شرق تا بہ غرب
کیرو ہو، ماسکو ہو وہ پیرس کہ تاشقند
یوں ہے کسی کی یاد تصور میں پُرفشاں
جیسے گھٹا کی گود میں اک سیم گوں پرند
اب تک کسی کے ہات نہیں نبضِ وقت پر
ساغر وہ "جامعہ" ہو، "علی گڑھ" کہ "دیوبند"

دُعا

ہم دُعا کرتے ہیں داتا کاش یہ مقبول ہو
التجا کرتے ہیں آقا کاش یہ مقبول ہو
تو نے آزادی کی دولت گر عطا کی ہے ہمیں
اس کی عزّت اور تحفظ کا ہمیں جذبہ بھی دے
زہر صدیوں کی غلامی کا ہے رگ رگ میں رواں
جو بنا دے زہر کو تریاق وہ نسخا بھی دے
راستہ تاریک ہے اور پیچ و خم تاریک تر
عزمِ محکم بھی عطا کر دیدۂ بینا بھی دے
آنکھ دے، جو رحم اور انصاف کی ڈالے نظر
سب سے جو انصاف برتے وہ دلِ دانا بھی دے
ہے نہ دنیا کا ہمیں عرفاں، نہ روحِ دین کا
ہم تو نابینا ہیں یارب دیدۂ بینا بھی دے

ہم کہ بوسیدہ روایاتِ کُہن کی خاک ہیں
خاک کو تازہ کوئی فکرِ حکیمانہ بھی دے

سب کے چہروں کے ہر اک خط میں ہے چہروں کا ہجوم
خود شناسی جس کا جوہر ہے وہ آئینا بھی دے

گر نہیں فکرِ حکیمانہ تو سب کچھ خام ہے
سلطنت بخشی ہے تو فکرِ حکیمانہ بھی دے

کھیت یہ سوکھے ہوئے، یہ باغ سنولائے ہوئے
ان کو پھر شاداب کرنے کا ہمیں جذبہ بھی دے

تو نے جس کشتی کو طوفانوں سے بخشی ہے نجات
اُس شکستہ کو سکونِ ساحلِ دریا بھی دے

وادیاں کُہسار کی گردن میں بانہیں ڈال دیں
ریگِ صحرا کو پیامِ موجۂ دریا بھی دے

خانۂ دہقاں کی تاریکی کو دے قندیلِ نور
کامگاروں کو چراغِ عشرتِ دنیا بھی دے

آہ بے پایاں یہ پستی، یہ بلندی کے پہاڑ
تو نے آنکھیں دیں تو ہم کو فطرتِ بینا بھی دے

سب جسے مل کے گائیں، ایک لے ہو ایک دُھن
اتحاد و امن کا دل دوز وہ نغما بھی دے

روشنی دی ہے تو وجدِ جاں فشانی بھی سکھا
شمع بخشی ہے تو ہم کو ذوقِ پروانا بھی دے

تو نے ہر دولت سے بڑھ کر ہم کو دولت بخش دی
قلبِ غیر آگاہ کو ظرفِ فقیرانہ بھی دے

نغمۂ ارتقا

ہے جس کی تخریب عینِ تعمیر وہ قیامت کا زلزلہ ہوں
کبھی میں لمحے چھلانگتا ہوں، کبھی میں صدیوں کو پھاندتا ہوں
کبھی پہاڑوں کو توڑتا ہوں، کبھی سمندر اچھالتا ہوں
میں ارتقا ہوں، میں ارتقا ہوں
میں فکرِ انساں کا آفریدہ
شعور کی گود سے اُٹھا ہوں
میں ارتقا ہوں
میں انقلابات کا خدا ہوں
میں تاج اور تخت کی چتا میں نظامِ کہنہ کو پھونکتا ہوں
ضعیف تہذیب کو کچل کر جواں تمدن اُبھارتا ہوں
میں ارتقا ہوں
میں انقلابات کا خدا ہوں
کبھی مرے قافلے کا ریلا سماج پر ٹوٹتا ہے ایسے
کہ جیسے جوالا مکھی کا ملبہ بھری پُری بستیوں پہ ٹوٹے
اثر ہے مجھ پر نہ آندھیوں کا
نہ بجلیوں کا نہ زلزلوں کا
نہ اس زمیں کا نہ آسماں کا
نہ اِس جہاں کا نہ اُس جہاں کا
نہ مجھ پہ قابو ہے آنسوؤں کا
نہ شیر خواروں کی سسکیوں کا
نہ بھوک سے خشک انتڑیوں کا
نہ خشک سیلابِ تشنگی کا

نہ بے بسی کا نہ بے کسی کا
بوڑھاپے کا اور نہ بال پن کا
نہ بچیوں کا نہ کنواریوں کا
نہ حسن کے بین اور بکا کا
نہ عشق کی سینہ کوبیوں کا
نہ مسجدوں کا نہ مندروں کا
کنشت کا اور نہ ہیکلوں کا
نہ کچھ صحیفوں کی آیتوں کا
نہ منتران کا نہ منتروں کا
نہ یوگیوں کا نہ تپسیوں کا
نہ دیوتاؤں نہ دیویوں کا
نہ صوفیوں کا نہ تپسّیوں کا
نہ مجھ پہ قابو ہے بندگی کا
نہ بے خودی کا نہ کچھ خودی کا
نہ موت کا اور نہ زندگی کا
زمین پر میں ہی ایک حق ہوں، نہ صرف حق بلکہ حق نما ہوں
تمام سچ میرے زیرپا ہیں، ہر اک صداقت سے ماورا ہوں
میں ارتقا ہوں
میں انقلابات کا خدا ہوں
پرانا سنگیت خاک کرتا ہوں، تازہ سنگیت ڈھالتا ہوں
قدیم سازوں کی خاک سے میں نیا ترنم ابھارتا ہوں
سلگ رہے ہیں جو ڈھول سُلگیں
جھلس رہے ہیں نقّارے جھلسیں
نفیری ارناہ قرنا تاشے

سرود و سارنگی اور طنبورے
یہ جانجھ سنتوک طبل و وینا
دف اور بربط ستار و ڈھولک
یہ بانسری جل ترنگ گھونگرو
یہ طبلہ شہنائی ، تاشنائی
پکھاوج ، اسراج اور پیانو
یہ وائلن دلربا و چیلو
یہ زمپلو فون اور مردنگ
ہیں یہ سب آتش کدے کا ایندھن
یہ میرے آتش کدے کا ایندھن
میں ان کے شعلوں کی لو سے ہر سو چراغِ فردا اُجالتا ہوں
اور ان کی گاتی ہوئی لپٹ سے نئے مزامیر ڈھالتا ہوں
میں ارتقا ہوں
میں انقلابات کا خدا ہوں
جو نیزہ و تیغ کے سہارے ہی مردِ میدانِ زندگی ہیں
میں اُن سے تلوار چھین لیتا ہوں، توڑ دیتا ہوں ان کے نیزے
میں توڑ دیتا ہوں ان کے خنجر
میں چھین لیتا ہوں تاج اُن سے
میں پھونک دیتا ہوں تخت اُن کے
میں کاٹ دیتا ہوں ہات اُن کے
میں تیغ و خنجر کی خاک سے تازہ توپ و بندوق ڈھالتا ہوں
جو حال و ماضی کا فاصلہ ہے اُسے میں جدت سے پاٹتا ہوں
میں ارتقا ہوں
میں انقلابات کا خدا ہوں

بصیرتِ زنگ خوردہ کو میں نئی بصیرت میں ڈھالتا ہوں
قدیم اسرارِ زندگی کو نئی صداقت میں ڈھالتا ہوں
جمی جمائی ، سجی سجائی
سرورِ مے سے رچی رچائی
حسین محفل اُجاڑتا ہوں
پُرانے فانوس توڑتا ہوں
جدید فانوس اُجالتا ہوں
اٹے ہوئے طاق سے اُٹھا کر
کتابِ کُہنہ کو پھاڑتا ہوں
تمام میراثِ کرم خوردہ
دہکتے شعلوں میں ڈالتا ہوں

فنون کی پُستکوں کے ملبے سے غارِ ماضی کا پاٹتا ہوں
علوم کے مسوّدوں کے شعلوں سے وقت کے ہات تاپتا ہوں
میں ارتقا ہوں
میں انقلابات کا خدا ہوں

□□

(ڈاکٹر) سجّاد سیّد

سیّد سجّاد حسین جو دہلی کی شعری و ادبی دنیا میں ڈاکٹر سجاد سیّد کے نام سے مشہور ہیں قصبہ اُلدھن، ضلع میرٹھ کے ایک ذی علم، معزز اور زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور نجیب الطرفین سیّد ہیں۔

پیشے کے لحاظ سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر اور ایم ڈی (میڈیسن) ہیں۔ کچھ عادتاً اور کچھ پیشے کے تقاضوں کی وجہ سے کم گو اور خاموش طبع انسان ہیں۔ شاعری میں پروفیسر عنوان چشتی صاحب سے تلمذ حاصل ہے۔ اپنی خاموش طبیعت اور کم گوئی کی وجہ سے عام ادبی سرگرمیوں سے دور رہتے ہیں لیکن ادبی رسائل و جرائد میں باقاعدگی سے چھپتے ہیں۔

ڈاکٹر سجاد سیّد کے اب تک دو شعری مجموعے ''بے زبانی کا ہنر'' (۱۹۹۶ء) اور ''درد کو لفظ کیا ہے'' (۲۰۰۱ء) شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

خاکِ وحشت سر پہ ڈالوں میں پاگل ہو جاؤں
یا پھر ظرف کا ساگر چھوڑوں اور بادل ہو جاؤں
میری قسمت کی تاریکی کچھ تو رنگ دکھائے
اُس کی آنکھوں میں جا بیٹھوں میں کاجل ہو جاؤں
ہجر کی تپتی دھوپ نے مجھ کو اک صحرا کر ڈالا
قرب کا بادل آئے برسے میں جل تھل ہو جاؤں
زہر جو لے کے آئے کوئی اُس کو پاس بٹھاؤں
اپنے من کی خوشبو بانٹوں میں صندل ہو جاؤں
مالی میری شاخیں میرے پتّے کاٹ رہا ہے
باغیچہ کی حد سے نکلوں پھر جنگل ہو جاؤں
لوٹوں سیّد اُس نگری کو جس کا ہوں باشندہ
آج سے رشتہ ناتا توڑوں پھر سے کل ہو جاؤں

○

پھول ہونٹوں کے نہ گیسو کی صبا مانگتے ہیں
ہم وہ پاگل ہیں جو کچھ اس سے سوا مانگتے ہیں
کب سے برسا نہیں پانی ہوئی صحرا آنکھیں
غم کی پُروائی تو یادوں کی گھٹا مانگتے ہیں
ہم کو یوں چین سے جینا نہیں اچھا لگتا
زندگی کے لیے زخموں کی قبا مانگتے ہیں
درد جتنے ہیں پرانے وہ دوا ہونے لگے
وحشتِ دل کے لیے درد نیا مانگتے ہیں
دولتِ عشق سے محروم ہیں سیّد جو لوگ
اُن غریبوں کے لیے ہم بھی دعا مانگتے ہیں

○

آرزوؤں کا حسیں پیکر تراش
اک سرابِ صبح کا منظر تراش
اک گھروندا ریگِ ساحل سے بنا
برف کے پتھر سے اک دلبر تراش
دیدۂ نمناک سے دریا بہا
آہِ شعلہ بار سے محشر تراش
اس حصارِ ذات سے باہر نکل
گنبدِ بے در میں تو اک در تراش
بحرِ عشرت میں صدف ملتا نہیں
قطرۂ خوناب سے گوہر تراش
رہ نما کی کج روی کا غم نہ کر
خود غبارِ راہ سے رہبر تراش
تیغِ زنگ آلود کو پھر آب دے
جبر و استبداد کے پھر سر تراش
طائرِ خواہش کی ہے لمبی اُڑان
اس کے بال و پر کو تو اکثر تراش

○

یاد چمکی ہے داغ میں دل کے
آئے جگنو سراغ میں دل کے
غنچۂ جاں خموش ہے کب سے
پھر صبا آئے باغ میں دل کے
گل نہ ہو جائیں آنسوؤں کے دیے
خون کم ہے چراغ میں دل کے

مے نہایت سرور چاہتے ہیں
مے انڈیلو ایاغ میں دل کے
جانے کب یہ خموش ہوجائے
دم نہیں اب چراغ میں دل کے

راہِ الفت سے باز آئے کیوں
دل ہی دل ہے دماغ میں دل کے

○

کچھ شوقِ سخن اور تو کچھ کارِ قلم اور
کرلے ابھی کچھ دیر یہ دلداریٔ غم اور
دیکھیں گے سحر ہم کہ نہ دیکھیں گے سحر ہم
شاید کہ نہ آئے گی کوئی شامِ الم اور
اے راہِ روِ جادۂ شب چل کہ ابھی تو
روشن تجھے کرنے ہیں یہاں نقشِ قدم اور
شوریدہ سری چھوڑ تو یہ تیشہ گری چھوڑ
سامانِ جنوں اب کے تو کرنے ہیں بہم اور
کچھ قطرۂ خوناب نکالو تہ دل سے
پلکوں پہ سجانے ہیں ابھی گوہرِ غم اور

اے راحتِ جاں بھول چلا ہے تجھ یہ دل
کر نظرِ کرم اور بڑھا جور و ستم اور

○

نویدِ دید کی امّید ، گفتگو کی طلب
سرابِ شوق سے تکمیلِ آرزو کی طلب
کہیں ہے لطف مسلسل کہیں عذاب ہے جاں
دریدہ دامنِ دل کو کہیں رفو کی طلب

ہر ایک ذرّہ کے ماتھے پہ لکھ کے حرفِ فنا
ہر ایک دانے کے دل میں رکھی نمو کی طلب

نگاہ اُس سے ملی تو نہیں رہی ہم کو
سرورِ بادہ کی ، پیمانہ و سبو کی طلب

مرے مقام کی خواہش نہ میرے تاج کا شوق
مرے حریف کو بس ہے مرے لہو کی طلب

سنانِ جبر کی تشنہ لبی پرانی ہے
سدا ہی اس کو رہی ہے رگِ گلو کی طلب

بڑے خلوص سے برتا ہے میں نے شعروں کو
مرے سخن کو نہیں ہے کسی غلو کی طلب

ہے اُس مقام پہ سیّد مزاجِ آوارہ
نہ اب کسی سے مراسم نہ اب کسو کی طلب

سلاؔم مچھلی شہری

اردو نظم میں اپنی ذہنی واختراعی کاوشوں اور وجدان کی روشنی میں بےشمار اور نت نئے ہیئتی تجربے کر کے شعری وادبی منظرنامے پر اپنے وجود کا احساس کرانے، مشاعروں میں خوابوں میں ڈوبی ہوئی آواز سے سننے والوں کو اپنی گرفت میں لے کر اپنے تخیلات کی رومانوی فضاؤں میں بہا لے جانے والے سلاؔم مچھلی شہری کا خاندانی نام عبدالسلام تھا۔ اردو کا یہ البیلا شاعر یکم جون ۱۹۲۱ء کو مچھلی شہر، ضلع جونپور، کے ایک دیہی، قدامت پرست اور مذہبی روایتوں کے پاسدار خاندان میں پیدا ہوا۔ اقتصادی اور تعلیمی طور پر بھی شامِ اودھ کے اس شہزادے کا خاندان زیادہ خوش حال نہیں تھا۔

سلاؔم نے جب ہوش سنبھالا تو تعلیم کے نام پر حفظِ قرآن کے لیے مسجد کے مکتب میں بٹھا دیے گئے۔ اُن کے والد عبدالرزاق صاحب چوں کہ خود حافظِ قرآن تھے، اس لیے عبدالسلام کو بھی حافظ اور مولوی بنانا چاہتے تھے۔ قصباتی اور روایتی ماحول میں پرورش پانے والے عبدالسلام نے والدین کی خواہش کے مطابق حفظِ قرآن شروع کر دیا لیکن پندرہ سیپاروں کے بعد عبدالسلام کا ذہن مزید حفظ کا متحمل نہیں ہوسکا، چنانچہ حفظِ قرآن کو خیرباد کہہ کر دنیوی تعلیم کا رُخ کیا۔ اسکول کے کھلے ماحول میں عبدالسلام کو ذہنی آزادی ملی۔ ذہنی آزادی نے شاعر سلاؔم مچھلی شہری کو جنم دیا۔ ان کی پہلی نظم ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ

"نیرنگِ خیال" لاہور کے ایک شمارے میں اُس وقت شائع ہوئی جب وہ فیض آباد کے فاربس اسکول میں آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔

ابتدائے شاعری میں جنابِ متین مچھلی شہری کا تلمذ اختیار کیا۔ عام شہروں کے ادبی ماحول کے مطابق اُس وقت مچھلی شہر کی شعری روایت بھی قطعی کلاسیکل شعری نظریات پر مبنی تھی اور قصبے کی سماجی، اقتصادی، ادبی اور سماجی زندگی فرسودہ روایتوں کی اسیر تھی۔ سلام کو ان روایتوں کی فرسودگی کا اوائلِ عمر میں ہی احساس ہو چکا تھا، چنانچہ انھوں نے مچھلی شہر کی گھٹن سے باہر آ کر اپنے عہد کے تازہ بہ تازہ حالات سے خود کو جوڑ لیا اور پوری ذہنی سنجیدگی کے ساتھ اپنے عہد سے آخر عمر تک نباہ کرتے رہے۔

سلاؔم مچھلی شہری زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ تعلیم صرف ہائی اسکول تک تھی۔ الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر امرناتھ جھا صاحب کی نظرِ کرم سے یونیورسٹی کی لائبریری میں ملازمت مل گئی۔ لائبریری کی ملازمت کے دوران سلاؔم کو ہندی اور انگریزی کے اعلیٰ ادب کو پڑھنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۳ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر مسودہ نویسی پر مامور ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں اسسٹنٹ پروڈیوسر بنا کر سری نگر ریڈیو اسٹیشن بھیج دیے گئے، کچھ عرصہ وہاں رہے پھر دہلی ریڈیو اسٹیشن میں آ گئے اور ترقی کر کے پروڈیوسر بن گئے۔

سلاؔم مچھلی شہری کی شاعری اپنے عہد کی سب سے مضبوط ادبی تحریک "ترقی پسند تحریک" کے ساتھ پروان چڑھی۔ وہ اس تحریک کے حامی ادب برائے زندگی کے قائل تھے، لیکن انھیں اس تحریک کے امپورٹڈ نظریات اور سیاسی عقیدے سے اختلاف تھا۔ ان اختلافات نے سلاؔم کو اس تحریک کا نقیب نہیں بننے دیا جس کی پاداش میں انھیں ادبی طور پر بے توجہی اور بے اعتنائی کی سزا بھگتنی پڑی اور اس تحریک سے وابستہ ناقدین کی دیدہ و دانستہ عدم توجہی کا شکار ہوئے۔ لیکن ان تمام ادبی ناانصافیوں، بے اعتنائیوں اور بے توجہی کے باوجود انھوں نے اپنے اختراعی ذہن کے مصرف میں ذرا بھی کمی نہیں آنے دی اور کلاسیکیت سے ترقی پسندی تک اور ترقی پسندی سے رومانیت تک کا سفر نظریات کے حصاروں سے دور رہ کر پورا کیا اور اپنی شعری شناخت پر کسی لادی ہوئی فکری مہر کو ثبت نہیں ہونے دیا۔

سلاؔم مچھلی شہری کے تین شعری مجموعے ''میرے نغمے''، ''وسعتیں'' اور ''پائل'' ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء کے درمیان شائع ہوکر مقبولِ عام ہو چکے تھے۔ ان شعری مجموعوں کی اشاعت کے بعد بھی سلاؔم مچھلی شہری کا شعری اور تخلیقی سفر تقریباً ۲۸ برس تک جاری رہا، لیکن کوئی اور شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔

سلاؔم کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ انھوں نے غزلیہ شاعری بھی کی ہے اور ریڈیو کی ملازمت کے تقاضوں کے پیشِ نظر غنایئے اور متعدد منظوم ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ اوپیرا لکھنا ایک مشکل امر ہے، سلاؔم نے ریڈیو کے لیے ایسے اوپیراز بھی تخلیق کیے جن کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

''بازو بند کھل کھل جائے'' ناول کی شکل میں سلاؔم کی ایک خوبصورت نثری کاوش ہے۔

سلاؔم کی ادبی و شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومتِ ہند نے انھیں ''پدم شری'' کے اعزاز سے نوازا۔

سلاؔم کا انتقال ۱۹ر نومبر ۱۹۷۳ء کو دہلی میں ہوا۔

نمونۂ کلام:

مشورہ

تم سرِ شاخِ سمن باغ میں آیا نہ کرو
باغ میں منچلے بھنورے بھی اڑا کرتے ہیں
وہ ہدف تم کو بنالیں گے، تو پھر کیا ہوگا

بار بار آئینے کے پاس بھی جایا نہ کرو
بعض آئینے بھی جاں دار ہوا کرتے ہیں
وہ جو سینے سے لگالیں گے، تو پھر کیا ہوگا
تم کھلی چھت پہ شبِ ماہ میں گایا نہ کرو

رات میں چند فرشتے بھی پھرا کرتے ہیں
وہ اگر ساز اُٹھالیں گے، تو پھر کیا ہوگا

اپنی سکھیوں کو بھی ہر خواب سنایا نہ کرو
ان کی آنکھوں میں بھی کچھ خواب بسا کرتے ہیں
خواب سے خواب مزالیں گے،تو پھر کیا ہوگا

میرے احباب سے بھی ہاتھ ملایا نہ کرو
آستینوں میں بھی کچھ سانپ پلا کرتے ہیں
اپنا سر گر وہ اٹھالیں گے تو پھر کیا ہوگا

تنبیہ

دوستو! میرے ہمالہ کی طرف مت آنا
ورنہ برف آگ کے شعلوں میں بدل جائے گی
شاخِ گل زہر کی شمشیر میں ڈھل جائے گی

میرے پھولوں کے شوالے کی طرف مت آنا
شدتِ نور سے بھی ورنہ پگھل جاؤ گے
میرے مندر میں قدم رکھتے ہی جل جاؤ گے

مادرِ ہند کے اس تاج کو اب مت چھونا
ہم نے آکاش سے دھرتی پہ اُتارا ہے اسے
دیوتاؤں کی دعاؤں سے سنوارا ہے اسے

میری گمبھیر سی یہ شمعِ طرب مت چھونا
ورنہ پتھر میں بھی پوشیدہ شرر ہوتے ہیں
دیوتاؤں ہی میں "شنکر" بھی مگر ہوتے ہیں

میرے آدرش کی نرمی سے نہ تم ٹکرانا
ورنہ آدرش میں طاقت بھی ہوا کرتی ہے
دلِ الفت ہی میں نفرت بھی ہوا کرتی ہے

تم تشدّد کے ارادے سے ادھر مت آنا
ورنہ گوتم کی زمیں آگ بھی بن سکتی ہے
شمع پاکیزہ کی لو ناگ بھی بن سکتی ہے

مجھے وہ نظم لکھنی ہے

مجھے وہ نظم لکھنی ہے
کہ ہر اندازِ موسیقی سے دہرایا کروں جس کو
مگر اکتا نہ جاؤں بار بار اپنے ہی گانے سے
یونہی بس زندگی کے ساز پہ گایا کروں جس کو
مگر گھبرا نہ جاؤں زندگانی کے فسانے سے
مجھے وہ نظم لکھنی ہے
کہ جس میں زہرہ وناہید سب رقصاں تو ہوں، لیکن
کبھی مزدور کے اندوہ گیں رخسار بھی دیکھوں
ہزاروں رقص ہائے دل نشیں پنہاں تو ہوں، لیکن
کبھی تلوار کی ہیبت فزا جھنکار بھی دیکھوں
مجھے وہ نظم لکھنی ہے

کہ جس کو موت کی آواز سے نفرت تو ہو، لیکن
پیامِ زندگی کچھ حوصلہ ساماں بھی ہوتا ہو
بہارِ زندگی غیرت وہ جنت تو ہو، لیکن
غریب انسان اس جنت سے کچھ شاداں بھی ہوتا ہو

اگر غنیم کی ضد ہے

یہی غنیم کی ضد ہے تو جنگ جاری ہے
ہمیں وطن کے لیے ہوشیار رہنا ہے
ہر اک محاذ پہ سرگرمِ کار رہنا ہے

زمینِ ہند کے آدرش کی بقا کے لیے
حیات بخش محبت بھری فضا کے لیے
چراغ ہائے چمن زارِ ایشیا کے لیے

ہمیں ہے اپنے چراغوں کی روشنی محبوب
ہمیں ہے اپنے تمدن کی دلکشی محبوب
ہمیں ہے اپنی یہ مشترکہ زندگی محبوب

کوئی بھی ان کی طرف آنکھ اٹھا نہیں سکتا
ہمیں کبھی کوئی دھوکے میں لا نہیں سکتا

یہی غنیم کی ضد ہے تو جنگ جاری ہے
نہ جب تلک وہ پشیماں ہو اپنی حرکت پر
کبھی نظر نہ اٹھائے ہماری جنت پر

؟

وہ مجھ کو جانتی ہیں اور میری قدر کرتی ہیں
مری بدنامیوں پر غم سے ٹھنڈی سانس بھرتی ہیں
بہ ایں جذبات پختہ آئینے میں جب سنورتی ہیں
تو گویا سرخ ساغر میں پری بن کر اُترتی ہیں
وُہ دوشیزہ نہیں، کمسن نہیں، بھرپور عورت ہیں
بہ ہر عالم شراب و شعر سے مخمور عورت ہیں

نئی کلیوں کی معصومی مجھے بھی بار ہوتی ہے
نہ جانے ان سے کیوں میری نظر کی ہار ہوتی ہے
مری جنت وہ صورت ہے جو پختہ کار ہوتی ہے
پرانے ساز میں اکثر حسیں جھنکار ہوتی ہے
میں ان سے مل نہیں پایا مگر یہ بھی حقیقت ہے
مجھے ان کے گدازِ حسن کی عظمت سے الفت ہے

انھیں ہم شاعروں میں زینتِ اشعار کہتے ہیں
ادیبوں، ناقدوں میں ان کو اک فن کار کہتے ہیں
گل افشاں محفلوں میں ملکۂ گل نار کہتے ہیں
ضرورت مند طالب علم پالن ہار کہتے ہیں
اب آگے مصلحت کی سرحدوں سے آ نہ پاؤں گا
کوئی گر نام پوچھے گا تو میں بتلا نہ پاؤں گا

بہت دن سے تمنا تھی کوئی ایسی بھی عورت ہو
کہ جس میں حسن کی عظمت ہو فن کاروں سے شفقت ہو

وہ جس میں پھول کے شعلے ہوں شعلوں کی نزاکت ہو
مجھے اس سے عقیدت ہو تو اس کو مجھ سے الفت ہو

بہ ایں خوش بختی، حالات کچھ آرام مل جائے
سہانی صبح مل جائے گلابی شام مل جائے

کمندِ شوق لے کر چاند سے الجھا ہے دلّی میں
خبر کردو کہ اک خانہ بدوش ایسا ہے دلّی میں
خرابِ حسن ہے، میخوار ہے رسوا ہے دلّی میں
مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ تنہا ہے دلّی میں

اب آجائیں کہ اک خوابِ دل فن کار باقی ہے
نہ جانے کتنی نظمیں ہو چکیں شہ کار باقی ہے

یہ برہم نئی نسل

یہ برہم نسل بھی روشنی ہے
خیالوں کی سب کھڑکیاں کھول رکھو
سلام! اپنی نظموں سے کہہ دو، سنور لیں
کہو کاغذوں سے کہ وہ رنگ بھر لیں
کہو ان گلابوں سے
آنگن کے ان جاوداں ماہتابوں سے
ان کی صدی ہے

جواب سامنے ہے
وہی زندگی ہے

یہ برہم نئی نسل بھی روشنی ہے
خیالوں کی سب کھڑکیاں کھول رکھو

(۲)

اگر صبحِ نو کا ہے پرچم ضروری
تو پھر اس کا ہے خیر مقدم ضروری
مقفل ہوئے تو
اندھیرے میں تنہائی کا ناگ ڈسنے لگے گا
تمھارے تخیّل کے فردوس میں
قافلہ ایسی روحوں کا بسنے لگے گا
جو تم سے کہیں گے
سلام! اپنی نظموں کے درپن میں دیکھو
تمھارا تخیّل وہ تربت ہے جس پر
فریب خودی کی بھی چادر نہیں ہے
نتیجہ؟
وہی،
آج تک جو ہوا ہے

(۳)

یہ برہم نئی نسل زندہ حقیقت ہے
افسانۂ خواب پامال کر دو!!
یہ مانگی ہوئی بوتلوں کی حسینہ
یہ عشرت محل

اور عشرت محل میں یہ نشے کا جادو!
یہ نشہ اندھیرا
اندھیرا، اندھیرا، اندھیرا
اگر روشنی کی ضرورت ہے تم کو
تو پھر سگریٹوں کے دھوئیں کا بنایا
یہ مدقوق مہتاب پامال کر دو!

یہ برہم نئی نسل بھی روشنی ہے
خیالوں کی سب کھڑکیاں کھول رکھو

□□

سلیم شیرازی

دہلی کی شعری اور صحافتی دنیا میں سلیم شیرازی کے قلمی نام سے جانے پہچانے جانے والے جہانگیر میرزا ۱۴ ارجنوری ۱۹۴۹ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے اور انٹر میڈیٹ تک تعلیم حاصل کی۔ انٹر کرنے کے بعد روزگار کی تلاش میں دہلی آ گئے۔ چھوٹی موٹی نوکریوں کے ساتھ تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور دہلی یونیورسٹی سے اردو آنرز میں ڈگری لے کر صحافت کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔

لکھنؤ کی شعری فضا میں ذوقِ شعر گوئی پیدا ہوا جو دہلی کے معرکہ آرا ادبی ماحول میں تیزی سے پروان چڑھا۔ لیکن صحافتی اور دفتری ذمہ داریوں نے ان کی تیزی سے پروان چڑھتی ہوئی شاعری کو کافی متاثر کیا ہے۔

سلیم شیرازی غزل کے شاعر ہیں۔ ان کا تا حال کوئی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

بے بسی کا تماشہ اگر دیکھنا
آ نہ جائے ہتھیلی پہ سر دیکھنا
شہر و بازار مقتل میں ڈھل جائیں گے
سرفروشی کا اب کے ہُنر دیکھنا
خیر سے ہم تو مجبور ٹھہرے مگر
اپنا گھر بھی کبھی پھونک کر دیکھنا
جال زخمی پرندو ! اُڑا لے چلو
بعد میں قوتِ بال و پر دیکھنا
چاہو حق کی انا کا تحفظ اگر
پہلے نیزے پہ خود اپنا سر دیکھنا

O

زد پہ آجائے نہ دستار جناب
تیز آندھی ہے خبردار جناب
چھوڑیے بھی یہ غم بُت شکنی
ذہن بھی ہوتے ہیں بیمار جناب
مُڑ کے اس نے جو ذرا دیکھ لیا!
جسم میں کھل اٹھے گلزار جناب
دھوپ کھیتوں میں اُگا کرتی ہے
فصل سب کھا گئے ہتھیار جناب
سب سے چھپ چھپ کے انا بیچتے ہیں
ہم بھی کچھ کم نہیں خوددار جناب
قرض مٹّی کا چکاؤں سر سے
پھر بھی کہلاؤں میں غدّار جناب

○

ہم کو ہمدردی کے الفاظ بھی ڈس جائیں گے
ہم وہ گُل ہیں کہ پھواروں سے جھلس جائیں گے
ہم کو معلوم نہ تھا شور میں تنہائی کے
اپنی آواز بھی سننے کو ترس جائیں گے
سنگ اٹھاتے ہوئے پھرتی ہیں یہاں بھی گلیاں
ہم نے سوچا تھا اسی شہر میں بس جائیں گے
بن کے بادل کسے معلوم تھا ہم آج سلیم
پھر اُسی شوخ کے آنگن میں برس جائیں گے

○○

سلیم صدیقی

سلیم صدیقی جن کا اصلی نام سلیم احمد صدیقی ہے ۳؍جنوری ۱۹۶۲ء کو دہلی کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب قاضی شمیم احمد صدیقی مرحوم صوم وصلوٰۃ کے پابند ایک دیندار انسان تھے۔ اس قاضی گھرانے میں گرچہ کوئی ادیب و شاعر نہیں تھا اور شعر وادب کا کوئی چلن نہیں تھا لیکن سلیم صدیقی کو بچپن میں شعری وادبی ماحول ملا۔ اس ادبی ماحول اور شاعر دوستوں کی صحبت اور رفاقت نے ان کی موزوں طبیعت کو تحریک دی۔

دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد صحافت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ ملکی، ملّی معاملات اور سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آج کل روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' میں سب ایڈیٹر ہیں۔ شاعری میں جناب وقار مانوی کے شاگرد ہیں۔ اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ کونسل کے ممبر رہ چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

نام حق دنیا میں روشن کرگیا
طشت میں سج کر جو میرا سر گیا
کتنے ہی چہرے سوالی ہوگئے
لوٹ کر جلدی جو اپنے گھر گیا
جرم کے احساس کا مارا گیا
رات اپنے سائے سے بھی ڈر گیا
گردشِ ایام تیرا شکریہ
مجھ میں اک انسان تھا سو مرگیا
ظلم و تانا شاہی اب بھی عام ہے
کون کہتا ہے کہ ہٹلر مرگیا
مجھ سے برہم ہے امیرِ شہر پھر
ایسا لگتا ہے کہ اب کہ سر گیا
بعد مدت کے سلیم اک روز جب
آئینہ دیکھا تو خود سے ڈر گیا

○

خط میں آپ نے لکھا ہے ہم کیسے ہیں
شہر دل ویران ہے لیکن اچھے ہیں
رحم نہیں کھاتے ہیں یہ ناداروں پر
پیسے والوں کے دل کتنے چھوٹے ہیں
شاید پھر پردیس سے کوئی خط آیا
رُک رُک کر برہن کے آنسو بہتے ہیں

وقت پڑا تو یہ بھی کام آ جائیں گے
کر لیجیے محفوظ جو کھوٹے سکے ہیں
اک جملہ میں چار زبانیں بولے ہیں
اپنے دور کے کیا کمپیوٹر بچے ہیں
بیٹے بوجھ سمجھتے ہیں اب ماؤں کو
کیسے کہہ دوں خون کے رشتے سچے ہیں
ہو جاؤ گے زخموں سے تم چور سلیم
سچ کے رستے مشکل ہیں پتھریلے ہیں

○

دشمن بھی کبھی دوست سے اچھا نہیں لگتا
سچ بولیے کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا
کہنے کو تو اپنوں کی یہاں بھیڑ ہے لیکن
اس بھیڑ میں اک شخص بھی اپنا نہیں لگتا
نس نس میں بسالی ہے ترے پیار کی خوشبو
تو مجھ سے بہت دور ہے ایسا نہیں لگتا
چرچا جو ہوا ترکِ تعلق کا جہاں میں
کیا اُس میں قصور آپ کو اپنا نہیں لگتا
دعویٰ تو وہ کرتا ہے مسیحائی کا لیکن
کردار و عمل سے وہ مسیحا نہیں لگتا
چالوں میں تُرپ چال بھی اک چال ہے یارو
نہلے پہ ہر اک بار ہی دہلا نہیں لگتا
کیا کرتے سلیم اس سے جفاؤں کا گلہ ہم
جو قول و عمل میں کبھی سچا نہیں لگتا

○

کبھی جو تفرقہ ہوتا نہیں ہے
وہ اپنوں کو کبھی کھوتا نہیں ہے
ستارے توڑ لانا دل بچھانا
کہا جاتا تو ہے ہوتا نہیں ہے
صبح کی فکر میں مزدور اکثر
سنا ہے رات بھر سوتا نہیں ہے
ہزاروں غم مرے دل میں مکیں ہیں
ترا غم ہی تو اکلوتا نہیں ہے
مرا بچہ سیانا ہے ابھی سے
کھلونوں کے لیے روتا نہیں ہے
یہ کیسا دور ہے کہ اب تو قاتل
لہو شمشیر سے دھوتا نہیں ہے
سلیم اس دورِ نو میں اب کوئی بھی
کسی کے بوجھ کو ڈھوتا نہیں ہے

○

مجھ کو اس بات کا بڑا غم ہے
قد مرا میرے سائے سے کم ہے
کس لیے تیری آنکھ پرنم ہے
بے وفا کیا تجھے مرا غم ہے
کوئی طوفان آنے والا ہے
شور ساحل پہ آج کچھ کم ہے
اپنے چھپّر سنبھال کر رکھنا
اس برس آندھیوں کا موسم ہے

بے بسی اضطراب و محرومی
ہر طرف زندگی کا ماتم ہے
جس کو بھی دیکھیے پریشاں ہے
چار سو بے کسی کا عالم ہے
وقت کا انتظار ہے ہم کو
لوگ کہتے ہیں وقت مرہم ہے
بہہ گیا جو ندامتوں میں سلیم
اشک وہ اشک آب زم زم ہے

○

املاک کیا بٹی ہے کہ جذبات بٹ گئے
محسوس ہورہا ہے مرے ہاتھ کٹ گئے
اک پل سکون ہم کو میسّر نہ ہوسکا
شہرت کے سانپ جب سے بدن پر لپٹ گئے
پتھر کسی نے پھینکا تھا بس اتنی بات پر
اکثر قبیلے والوں کے سرتن سے کٹ گئے
منصف کا کیا قصور ہے قانون کیا کرے
سارے گواہ اپنی گواہی پلٹ گئے
اترا رہے تھے لوگ سہاروں پہ کس قدر
سورج جو سر پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے
ماں باپ کی نصیحتیں سب رائیگاں ہوئیں
بچے جوان کیا ہوئے آنگن سمٹ گئے
مجبوریاں تھیں زیست کی کچھ اس لیے سلیم
ہم بھی حصارِ ذات کے اندر سمٹ گئے

□□

سہیل احمد فاروقی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے والے ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی ۷رمئی ۱۹۵۱ء کو تحصیل شاہ گنج ضلع جونپور کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو دینی اور دنیوی تعلیم سے بہرہ مند تھا۔ ان کی شاعری ان کے والدِ مرحوم شیخ نظام الدین صاحب کے شعری وادبی ذوق کی دین ہے جو گرچہ خود شاعر نہیں تھے لیکن اردو، فارسی شاعری پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مشاعرے سننا ان کا شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے نہ صرف شاہ گنج بلکہ قرب وجوار کے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے اور کمسن سہیل احمد کو اپنے ساتھ ضرور لے جاتے تھے۔

کم سنی میں مشاعروں کی شرکت نے نہ صرف ان کی ذہنی تربیت کی بلکہ تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بھی بخشی۔ طالب علمی کے زمانے میں موزوں شعر کہنے لگے لیکن ۱۹۷۵ء میں باقاعدہ شاعری شروع کی اور ادبیاتِ عربی کے مشہور اسکالر پروفیسر زبیر احمد فاروقی صاحب کا تلمذ اختیار کیا۔ سہیل احمد فاروقی کا کوئی شعری مجموعہ ابھی منظرِ عام پر نہیں آیا لیکن ان کی نو دس نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو تراجم پر مشتمل ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

تمام تاب و تپش آفتاب رکھ دے گا
جبیں پہ ہاتھ جو اک ماہ تاب رکھ دے گا

الجھ رہے ہو یہ کس سے، سوال سے پہلے
کوئی نہ کوئی نیا اک جواب رکھ دے گا

سنا سنا کے کہانی وہ سبز لمحوں کی
تمھاری آنکھوں میں بس ایک خواب رکھ دے گا

ورق ورق پہ مرا نام جب بھی دیکھے گا
خجل سا ہو کے خود اپنی کتاب رکھ دے گا

اٹھا، اتار دے دل میں کہ سوچتا کیا ہے
مرا لہو ترے خنجر پہ آب رکھ دے گا

میں جانتا تھا کہ اک دن مری نظر کا فریب
سمندروں کے بھی آگے سراب رکھ دے گا

○

یہ دعا مانگ کہ میں رات کا چہرہ دیکھوں
آنکھ لگ جائے تو خود کو نہ اکیلا دیکھوں

تجھ کو دیوانہ بنادے گا یہ نرگس کا چلن
خود سے باہر بھی کبھی تجھ کو نکلتا دیکھوں

اب وہ دن پھر سے نہیں لوٹ کے آنے والے
میں جدھر جاؤں اُدھر چاند کو چلتا دیکھوں

لُٹ چکی پاس سے اپنے تو متاعِ دل و جاں
زندگی اور میں کب تک ترا رستہ دیکھوں

تشنگی مجھ کو بلاتی ہے عجب حیلوں سے
پہلے صحرا کی طرف جاؤں کہ دریا دیکھوں
ایک ہی چہرہ لیے پھرتا ہوں دنیا میں سہیلؔ
اور دنیا کا تقاضہ ہے کہ دنیا دیکھوں

○

ہمیں پتہ نہ چلا خون کی روانی میں
کہ آنکھ ڈوبنے والی ہے کتنے پانی میں
ہمیں تو جرعۂ غم میں وہ کیف ملتا ہے
نہ مل سکے گا کبھی جامِ ارغوانی میں
اسی نے لوٹے ہیں اُس بت سے گفتگو کے مزے
سخن کی داد ملی جس کو بے زبانی میں
ابھی فراق کی منزل بھی آنے والی ہے
نہ بھول جائیں کہیں فرطِ شادمانی میں
تو شاہزادی یہ یوں داستاں تمام نہ کر
ابھی تو کتنے ہی کردار ہیں کہانی میں
ہوا تھا فرش پہ خورشید کوئی جلوہ فگن
مہ و نجوم تھے ہر لمحہ پاسبانی میں
عروسِ فن کو سنواریں گے آپ خاک سہیلؔ
کہ ایک عمر گزاری قصیدہ خوانی میں

○

جس گھنے پیڑ کے سائے سے نکل کر آئے
کیا تعجب کہ اسی سمت سے پتھر آئے
خشک ہونٹوں پہ زباں رینگ رہی ہے اب تک
رات آنکھوں میں کئی بار سمندر آئے

آئینہ پھر بھی حقیقت کا نگہدار رہا
میرے احباب کئی روپ بدل کر آئے
دن کو تپتے ہوئے سورج میں رہے دست بدست
شام کو دل کی طرف درد کے لشکر آئے
جب کبھی وہم و حقیقت میں ہوئی ہے چشمک
پہلے ہم اپنے ہی سائے کے برابر آئے
اس کے ہی ہاتھ سے زنجیرِ وفا چھوٹ گئی
وہ جو کہتا تھا کہ الزام نہ تم پر آئے

○

کھینچتی ہے کیوں ہوا نقشِ کفِ پا کی طرف
کیا گئے ہیں ہم سے پہلے لوگ صحرا کی طرف
مہرِ آوارہ صفت پر گھر کے دروازے ہیں بند
شام جب ہوئی تو ہم جائیں گے دریا کی طرف
اپنی بربادی کا دل میں اک جہاں آباد ہے
مُڑ کے دیکھیں کس لیے شہرِ تمنا کی طرف
اے خدا اس خواب کی تعبیر کچھ برعکس ہو
اک ہجومِ تشنگاں آتا ہے دریا کی طرف
تنگ ہو جائیں گی جب تم پر خلا کی وسعتیں
لوٹ ہی آؤ گے آخر اپنی دنیا کی طرف
قلب و جاں فکر و نظر منسوب اُس سے ہیں سہیلؔ
ہم نے بس پل بھر کو دیکھا روئے زیبا کی طرف

○

غم کے سائے اپنی قامت سے سوا کیسے ہوئے
شہرِ غم میں اتنے ہنگامے بپا کیسے ہوئے

خواب ان آنکھوں سے یارب کون چن کر لے گیا
عکس ہر منظر کے محرومِ حنا کیسے ہوئے

آپ کے دامن سے کیوں آئی کفِ قاتل کی بو
آپ منصف تھے تو موضوعِ سزا کیسے ہوئے

حلقۂ زنجیر ٹوٹا صورتِ آبِ رواں
پھول جیسے ہاتھ خنجر آزما کیسے ہوئے

نا سپاسی دل کی فطرت تھی مگر حیرت میں ہوں
ہاتھ اپنے آج مصروفِ دعا کیسے ہوئے

لوگ اپنی کج کلاہی پر بہت سرشار تھے
مصلحت کے سامنے بے دست و پا کیسے ہوئے

دیکھنا یہ صیقلِ غم کا کرشمہ ہے سہیلؔ
زنگ آلودہ تھے رشکِ آئینہ کیسے ہوئے

□□

سیف سحری

سیّد سیف الحسن سیفؔ سحری ۱۶؍جون ۱۹۵۳ء کو میرٹھ کے قصبہ جڑودہ میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے شاگردِ رشید ہیں اسی لیے سحری لکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں مشاعروں کے مقبول شاعر تھے، لیکن اب مشاعروں اور ادبی سرگرمیوں سے دور رہ کر شعر و ادب کی خاموش خدمت کر رہے ہیں۔

پہلا شعری مجموعہ ''گلاب چہرے'' فروری ۲۰۰۲ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

یہ کس نے کہہ دیا ہم آندھیوں سے ڈرتے ہیں
ہمیں تو ہیں جو ہواؤں کے پَر کترتے ہیں

چراغ جب بھی جلاتے ہیں روشنی کے لیے
مخالفین، ہواؤں کے کان بھرتے ہیں

نظر میں رکھتے ہیں خوش رنگ جھیل کے منظر
پرندے خشک زمیں پر کہاں اُترتے ہیں

کہاں سے حوصلہ آیا اُڑان بھرنے کا
سنا ہے آپ ہواؤں سے بات کرتے ہیں
سلیقہ جن کو نہیں سیفؔ غم اٹھانے کا
وہ آئنے کی طرح ٹوٹ کر بکھرتے ہیں

○

آفتاب و ماہ انجم کہکشاں ہونے لگے
خاک کے ذرّے حریفِ آسماں ہونے لگے
جاگ اٹھا ہے دلوں میں جب سے احساسِ انا
فاصلے اُن کے ہمارے درمیاں ہونے لگے
اب کسی نا اہل کی تقلید کے قائل نہیں
اہلِ گلشن واقفِ سود و زیاں ہونے لگے
اے مرے معبود کوئی راستہ تو ہی دِکھا
کل کے رہزن، آج میرِ کارواں ہونے لگے
وہم ہوتا ہے، کہیں یہ بھی کوئی سازش نہ ہو
سیفؔ جو نامہرباں تھے، مہرباں ہونے لگے

○

موسمِ گل، رنگ و نکہت، چاند تارے جائیں گے
آپ جائیں گے تو یہ دلکش نظارے جائیں گے
اپنا گھر روشن نہیں کرتے اُجالے مانگ کر
ہم خودی کا چاند آنگن میں اتارے جائیں گے
اپنا حق لینے کا جب تک حوصلہ ہوگا نہیں
دوسروں کے سامنے دامن پسارے جائیں گے

ٹوٹ جاتے ہیں شجر، آندھی میں جو جھکتے نہیں
اِس کا یہ مطلب نہیں ہم جنگ ہارے جائیں گے
جو بھی جاتا ہے وہاں، سیراب ہو جاتا ہے سیفؔ
ایک دن ہم بھی سمندر کے کنارے جائیں گے

○

بیشک ہمارے ہاتھ سے تلوار چھین لے
ممکن نہیں کہ جرأتِ اظہار چھین لے
اپنوں سے دشمنی، کبھی غیروں سے اختلاف
طرزِ عمل نہ آپ کا معیار چھین لے
جس کو بھی دیکھیے، وہ اسی جستجو میں ہے
جیسے بھی، جس طرح بھی ہو دستار چھین لے
اجڑی ہے ماں کی گود، لُٹا ہے کہیں سہاگ
کیوں کر سکوں نہ سرخیِ اخبار چھین لے
کشتی بڑھا رہا ہے جو منجدھار کی طرف
اے سیفؔ اس کے ہاتھ سے پتوار چھین لے

○

کبھی آنگن، کبھی در کاٹتا ہے
شبِ ہجراں مجھے گھر کاٹتا ہے
پہنچنا ہے مجھے اُس پار، لیکن
مرا رستہ، سمندر کاٹتا ہے
حسد اہلِ ہنر میں توبہ، توبہ
سخن ور کو، سخن ور کاٹتا ہے

کہیں بھی مطمئن ہوتا نہیں دل
مجھے منظر بہ منظر کاٹتا ہے
سکوں دل کو نہ ہو جب سیفؔ حاصل
تو پھولوں کا بھی بستر کاٹتا ہے

○

ضبط کی حد سے گزر جاتا ہے کیوں
ٹوٹ کر غم سے بکھر جاتا ہے کیوں
جب کسی بستی سے اٹھتا ہے دُھواں
رنگ چہروں کا اُتر جاتا ہے کیوں
ماجرا کیا ہے ہمیں کچھ تو بتا
اپنے ہی سائے سے ڈر جاتا ہے کیوں
ہم تو دیوانے ہیں، دیوانوں کا کیا
تو ہماری بات پر جاتا ہے کیوں
سیفؔ سحری دیکھتے ہی، دیکھتے
زہرِ نفرت کام کر جاتا ہے کیوں

□□

سیمابؔ سلطانپوری

دھرم ویر دھیر جو دہلی کی ادبی و شعری دنیا میں سیمابؔ سلطانپوری کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں گرچہ عام ادبی و شعری سرگرمیوں سے دور رہتے ہیں لیکن حلقۂ تشنگانِ ادب کے پلیٹ فارم سے دہلی کی دور دراز کالونیوں میں شعری و ادبی نشستیں اور مشاعرے منعقد کر کے اردو کی خاموش خدمت کر رہے ہیں اور ان آبادیوں میں رہنے والے اردو شاعروں کو حلقہ سے جوڑے ہوئے ہیں۔

دھرم ویر دھیر ۷ رجولائی ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیمی زندگی میں سائنس اور انجینئرنگ کے طالب علم تھے لیکن شعر گوئی کے شوق نے ان کو انجینئر کے ساتھ سیمابؔ سلطانپوری بھی بنادیا۔ شاعری میں جناب ڈی۔ راج۔ کنولؔ کے شاگرد ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ ''عکس برآب'' (۱۹۹۶ء) میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ سیمابؔ نے ''ساز و نوا'' (۱۹۷۵ء) اور ''سفر جاری ہے'' (۱۹۹۸ء) کے عنوانات سے حلقۂ تشنگانِ ادب کے شعراء کے تذکرے شراکت میں مرتب کیے۔ اسی طرح ۱۹۷۶ء میں بزمِ سیمابؔ کے شاعروں کا تذکرہ ''شعر اور شاعر'' کے نام سے مرتب کیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

یہ دیکھنا تھا کہ دوں گا میں وُسعتیں کیسی
قلم نے سونپ دیں مجھ کو وراثتیں کیسی

مری انا کو مرے خوں سے تولنے والے
لگا رہے ہیں مرے سر کی قیمتیں کیسی

بڑے سلیقے سے ان کو کتاب میں رکھ کر
وہ کررہا تھا گلوں کی حفاظتیں کیسی

ہزار چہروں کو یکجا کرو تو پھر دیکھو
دکھائی دیتی ہیں گھل مِل کے صورتیں کیسی

میں دشتِ جاں کا مسافر ہوں روزِ اوّل سے
بدن بدن یہ ملی ہیں مسافتیں کیسی

تحفظات کی خاطر جو سر پہ رکھی تھیں
بنی ہیں بارِ گراں اب وہی چھتیں کیسی

چراغِ صبر جلایا تو گھر میں اے سیمابؔ
بکھر گئی ہیں ہر اک سمت برکتیں کیسی

○

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہوں دیپک کی تان بھی
پھولوں سا نرم دل ہوں تو شعلہ بیان بھی

آنکھوں کی ٹہنیوں پہ نہ اشکوں کے گل کھلے
حال آں کہ موتیوں کا کیا ہم نے دان بھی

نازک نگاہ ہم سا نہیں کوئی دہر میں
پھولوں پہ دیکھ لے جو ہوا کے نشان بھی
منہ سے نکل گیا ہے اچانک کسی کا نام
دل کی طرح دھڑکنے لگی ہے زبان بھی
اوڑھی ہیں جب سے ہم نے سروں پر قناعتیں
آساں بھی ہوگیا ہے سفر بے تھکان بھی
چلنے کا حوصلہ بھی وہ دیتا رہا مجھے
رکھتا رہا قدم بہ قدم امتحان بھی
آواز کو سنیں کہ سنیں اُس کے شعر ہم
سیمابؔ خوش گلو بھی ہے اور خوش بیان بھی

○

عکس پانی پر ہے چھونے کے لیے بیکل نہ ہو
چاند کو ہاتھوں میں آیا دیکھ کر پاگل نہ ہو
ڈالنے دریا میں جس کو چل پڑے بستی کے لوگ
ڈر رہا ہوں وہ مری ہی نیکیوں کا پھل نہ ہو
یہ دعائیں مانگتے ہی کٹ گئی عمرِ طویل
ہو نہ کل سا آج میرا آج جیسا کل نہ ہو
سر پٹکتی ہے مسلسل ہر در و دیوار پر
بے غرض اندھی ہوا میری طرح پاگل نہ ہو
جینے مرنے کے لیے کچھ تو بہانہ چاہیے
ڈھونڈ لا ایسی پریشانی کہ جس کا حل نہ ہو
ڈھونڈتے ہیں ہم بہاروں کی خبر اخبار میں
چاہے سوکھی ڈالیوں پر ایک بھی کونپل نہ ہو
ہر بلندی پر رہے باقی بلندی کی طلب
یا خدا سیمابؔ دوئم ہو کبھی اوّل نہ ہو

○

یا خدائی میں تھا خدا تنہا
یا کوئی مجھ سا سر پھرا تنہا
سب کے ہمراہ تھی غرض اُن کی
بے غرض میں تھا رہ گیا تنہا
ساتھ میرے ضمیر تھا میرا
میں کسی کام میں نہ تھا تنہا
تیرگی میں تو سب اکیلے تھے
روشنی میں تھا اک دِیا تنہا
بے وفاؤں کے ساتھ تھی دنیا
باوفا جو ملا ، ملا تنہا
چھوڑ دے ساتھ دنیا و دیں کا
وصل کا شوق ہے تو آ تنہا
سب کو گھیرے ہوئے تھا وہ سیماب
در حقیقت تھا دائرہ تنہا

○

بہت چھوٹا سا مٹی کا دِیا ہوں
میں سورج ڈوبنے پر جاگتا ہوں
مری آواز پر چونکی ہے دُنیا
جہاں ہنسنا تھا مجھ کو رو پڑا ہوں
پرندہ ہوں حدِ پرواز کیسی
میں اُڑنے کے لیے آکاش جیا ہوں
یہاں پتھر کے بت تو بولتے ہیں
میں انساں ہو کے بے حس ہو گیا ہوں

نفس کی ڈوبتی کشتی میں بیٹھا
بہت خوش ہوں میں کیسا ناخدا ہوں
مری آنکھیں ہیں سطحِ آب جیسی
میں ہر منظر کو اُلٹا دیکھتا ہوں
مری پہچان ہے تجھ سے مکمل
بچھڑ کر تجھ سے میں سیماؔب کیا ہوں

○

دِن ہنس کے نہ جو گزرے وہ رو کے گزارے ہیں
جیسے بھی ہوا سر سے کچھ بوجھ اُتارے ہیں
جو چاہو سو تم رکھ لو، جو چاہو مجھے دے دو
خوشیاں بھی تمھاری ہیں، یہ غم بھی تمھارے ہیں
مقتول میں قاتل میں، کچھ فرق نہیں باقی
سینے بھی ہمارے ہیں خنجر بھی ہمارے ہیں
جب چاہے مٹا دے گا وہ دستِ ہوا اِن کو
ٹھہرے ہوئے پانی پر، کچھ نقش اُبھارے ہیں
آئینوں کو دھونے سے چہرے تو نہیں دُھلتے
جو داغ نمایاں ہیں چہروں پہ ہمارے ہیں
روئے ہیں بہت پہروں، میں اور انا میری
اللہ کے آگے بھی، جب ہاتھ پسارے ہیں
بن مول جو پایا تھا، سیماؔب اُسی غم کے
کچھ قرض بقایا ہیں، کچھ قرض اُتارے ہیں

□□

سیّد احمد چشتی دہلوی

سیّد احمد چشتی ۱۸۹۷ء میں دہلی کے ایک ذی علم اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد میر کبیر علی صاحب شعر و ادب کے دلدادہ تھے، تفننِ طبع کے لیے شعر کہا کرتے تھے اور کبیر تخلص رکھتے تھے، لیکن ان کی شاعری ان کی ذات تک ہی محدود رہی۔ سیّد احمد چشتی بھی بذاتِ خود ایک گوشہ نشین شاعر تھے اور یہ گوشہ نشینی گمنامی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔

سیّد احمد چشتی شاعری میں میر شرافت علی خاں صاحب گستہؔ اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد شاعرانہ صلاح و مشورے کے لیے حضرتِ نوحؔ ناروی سے رُجوع کیا اور ۱۹۲۰ء میں باقاعدہ ان کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ جناب نوح ناروی داغؔ دہلوی کے تلامذہ کے ایک ممتاز اور قادرالکلام شاعر تھے۔ سید احمد چشتی قدیم انداز کے غزل گو شاعر تھے۔

سیّد احمد چشتی نے اپنی حیات میں ''سرمایۂ ہستی'' یعنی ریاضِ چشتی کے عنوان سے اپنا دیوان مرتب کیا تھا جو عدمِ اشاعت کی وجہ سے تقریباً طاقِ نسیاں ہو چکا تھا لیکن ایک اردو دوست جناب سید ظفر حسین دہلوی کی ذاتی دلچسپی اور کوششوں کی وجہ سے ''سرمایۂ چشتی'' کے نام سے سیّد احمد چشتی کی شاعری کا ایک مختصر انتخاب منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ چشتی دہلوی کی شاعری اور غزلوں کا یہ انتخاب مشہور تبصرہ نگار جناب انور کمال حسینی نے کیا ہے۔

سیّد احمد چشتی کا انتقال ۷ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو ستر برس کی عمر میں دہلی میں ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

یہ ضد ہے میری حسرت کی تقاضا ہے یہ ارماں کا
رہے پہلو میں کوئی شوخ چنچل چلبلا بانکا

نقابِ رُخ الٹ کر آرہے تھے وہ سرِ محفل
ہوئیں جب مجھ سے چار آنکھیں تو جھٹ شرما کر منہ ڈھانکا

ذرا سی بات پر اُس نے مری آنکھیں نکلوادیں
خطا اتنی ہی تھی کیوں روزنِ دیوار سے جھانکا

ابھی اک برق سی کوندی مگر کھلتا نہیں مجھ کو
خدا جانے یہ کس نے چھپ کے چلمن سے کسے جھانکا

تصدق اس حیا کے آنکھوں ہی سے کچھ اشارہ ہو
پیامِ شوق پر میں منتظر ہوں اب تری ہانکا

ہمیشہ اک نہ اک اندازِ رعنائی تھا ظالم میں
وہ بچپن میں رہا بھولا جوانی میں ہوا بانکا

خدا کے روبرو جاتے ہوئے دنیا سے اے چشتی
جب آئی شرمِ عصیاں تو کفن سے ہم نے منہ ڈھانکا

○

پہلو سے دل کے ساتھ ہی میرا جگر گیا
انجام کارِ عشق میں مرنا تھا مرگیا

کوئی نظر ملا کے چرا کر نظر گیا
میں دل کو ڈھونڈتا ہوں مرا دل کدھر گیا

اقرار مجھ سے کر کے نہ آیا وہ میرے گھر
وعدہ جب اس کو یاد دلایا مکر گیا

مجھ کو جواب نامہ سے اُس نے کیا نہ یاد
خط لے کے رکھ لیا جو کبھی نامہ بر گیا
عذرِ حنا اُسے تھا مجھے بھی تھا عذرِ ضعف
آیا نہ میرے گھر وہ نہ میں اُس کے گھر گیا
اچھا کسی طرح نہیں ہوتا مریضِ عشق
تقدیر سے دوا و دعا کا اثر گیا
فرماتے ہیں وہ میّتِ چشتی پہ ناز سے
ناشاد و نامراد محبت میں مرگیا

○

اُجاڑا نشیمن تو کیا شاخ گل پر نہ چھوڑی نشست اپنا مسکن نہ چھوڑا
سہے لاکھ جور و ستم باغباں کے مگر پھر بھی بلبل نے گلشن نہ چھوڑا
یہ کی التجا میں نے کچھ اور ٹھہرو مرے ساتھ کچھ اور آرام لے لو
رُکا جب نہ منت خوشامد پہ کوئی تو یوں میں نے روکا کہ دامن نہ چھوڑا
مرا دل مسلتے ہیں وہ چٹکیوں سے ڈراتے ہیں شکووں پہ وہ جھڑکیوں سے
تعجب ہے مجھ کو کہ آئی جوانی مگر کیا غضب ہے لڑکپن نہ چھوڑا
کیے اس لیے سینکڑوں ظلم مجھ پر وہ سمجھا تھا مرجائے گا اب تڑپ کر
یہ ارماں اس کے بھی دل سے نہ نکلا مری روح نے بھی مرا تن نہ چھوڑا
نکلتا اگر حلق سے پار ہوکر نکلتی تڑپ کر مری جانِ مضطر
نشانہ لگاتے ہوئے تیر افگن کوئی تیر کیوں سوئے گردن نہ چھوڑا
نشاں اس کا باقی نہیں اب چمن میں نہیں ذکر اس کا کہیں اب صحن میں
اِدھر باغباں نے نہ بلبل کو چھوڑا اُدھر بجلیوں نے نشیمن نہ چھوڑا
وہ فریاد پر مجھ سے فرما رہے ہیں یہ دھمکی غضب کی دیے جارہے ہیں
ستاؤں گا اس سے سوا اور چشتی اگر تو نے ہر دم کا شیون نہ چھوڑا

○

تھام لو اپنا کلیجہ کرتے ہیں فریاد ہم
سہہ چکے بس جور ہم اب سہہ چکے بیداد ہم

کیا غضب ہے وہ عدو کو یاد فرماتے ہیں روز
آٹھویں دسویں اُنھیں آتے نہیں ہیں یاد ہم

یاد آجاتا ہے فوراً وہ تمھارا سرو قد
دیکھ پاتے ہیں کبھی جب باغ میں شمشاد ہم

رشکِ لیلیٰ آپ ہیں تو ہم جوابِ قیس ہیں
رشکِ شیریں آپ ہیں تو غیرتِ فرہاد ہم

کیا ضرورت دستِ نازک کو ترے تکلیف ہو
لا ہمیں دے پھیر لیں خود خنجرِ فولاد ہم

چار دن کی زندگی ہے چار دن کی ہے بہار
لے کر آئے ہیں ازل سے عمرِ بے بنیاد ہم

حوصلہ افزائی ہوجاتی ہے چشتی بزم میں
پاتے ہیں احباب سے اپنے سخن کی داد ہم

○

آیا نظر کہاں مجھے آئی نظر کہاں
اُن کا دہن نہیں تو ہے اُن کی کمر کہاں

چھپ چھپ کے لاکھ جائیں وہ میرے عدو کے گھر
پوشیدہ رہ سکے گی بھلا یہ خبر کہاں

میں سوچتا رہا مہِ کامل کو دیکھ کر
پہنچا ہے میرا پرتوِ داغِ جگر کہاں

گھبرا کر اپنے گھر کا پتہ میں نے دے دیا
پوچھا تھا اُس نے مجھ سے عدو کا ہے گھر کہاں

وعدہ کیا تھا شام کا دن نکلے آئے ہو
یہ تو ذرا بتاؤ رہے رات بھر کہاں
تم آئے ہو تو رات بھر آرام سے رہو
جاتے ہو میرے پاس سے قبل از سحر کہاں

پہنچا جو کوئے یار میں بولی مری قضا
کیوں خیر تو ہے آئے ہو چشتی اِدھر کہاں

○

خلوت میں کام رُخ پہ نہیں اب نقاب کا
یہ ہے نہ شرم کا نہ یہ موقع حجاب کا
جب دل جلا کے دے کوئی ساغر شراب کا
پھر کیوں مزا نہ آئے زباں پر کباب کا
ثابت کسی کے بندِ قبا بھی نہ رہ سکے
اللہ رے یہ زور یہ عالم شباب کا
سن کر پیامِ شوق کو دیتے ہو جھڑکیاں
یہ کیا طریق تم نے نکالا جواب کا
ڈھاتی ہے فتنے ان کی جوانی نئے نئے
گویا ہے رشکِ حشر زمانہ شباب کا
پانی بھرے نہ کس لیے خود تیرا حسن بھی
دیکھا نہ خوب رو کوئی اس آب و تاب کا

ہوتے ہی وہ ضعیف ہوا زار اس قدر
چشتی سے بار بھی نہیں اٹھتا خضاب کا

□□

سیّد غلام سمنانی

ایک نہایت ہی ذی علم، ممتاز اور صاحبِ طریقت خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔
جونپور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ دہلی میں جماعتِ اسلامی کے انگریزی ہفت روزہ Radiance سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہو گئے۔
ماہرِ لسانیات اور وسیع المطالعہ انسان تھے۔ اردو اور انگریزی کے علاوہ ہندی، فارسی اور عربی زبان و ادب پر کافی عبور حاصل تھا۔ شاعری میں فنِ عروض پر گہری نگاہ تھی۔
۲۳؍اپریل ۱۹۹۹ء کو ۶۵ سال کی عمر میں مختصر سی علالت کے بعد دہلی میں انتقال ہوا اور ۲۵؍اپریل ۱۹۹۹ء کو جونپور کے خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

نمونۂ کلام:

غزل

ہے یہ وہ دور کہ طوفاں کو بھی ساحل کہیے
آ پڑے گر کوئی مشکل تو نہ مشکل کہیے

اس قدر فتنے بپا کیوں ہیں مرے قتل کے بعد
بات یوں ہے، کسی قاتل کو نہ قاتل کہیے

دیجیے ہجر کے آزار کو بھی وصل کا نام
شورِ فریاد کو گلبانگِ عنادل کہیے

حق کا اعلان ہی کافی نہیں اے شیخ زماں
حق کو حق کہیے تو باطل کو بھی باطل کہیے

شاخ ٹوٹے تو اسے کہیے شکستِ امید
کوئی بھی شمع بجھے اس کو مرا دل کہیے

گر فغاں سنیے اسے کیجیے جرس سے منسوب
گر غبار اٹھے اسے پردۂ محمل کہیے

زخمیٔ ناوکِ مژگاں کو نہ کہیے زخمی
کشتۂ تیغِ تغافل کو نہ بسمل کہیے

بات کہنے نہیں آتی تو نہ کہیے صاحب
کیا ضروری ہے کہ صحرا کو بھی محفل کہیے

کہیے ہر ذرۂ بے مایہ کو رشکِ خورشید
بد گہر ہو تو اُسے جوہرِ قاتل کہیے

○

وہ تمکنت وہ آپ کا پندار کیا ہوا
یعنی فسونِ نرگسِ بیمار کیا ہوا

ہر شہر دیکھ آئے ہیں ہم آپ ہی کہیں
جس جا بکے ہے بخت وہ بازار کیا ہوا
جو غم کی تیز دھوپ میں بخشے ہمیں سکوں
اے ہم نفس وہ سایۂ دیوار کیا ہوا
یوں تو ہر ایک ذرّہ، چمن زارِ حسن ہے
جس جا ملے وہ گل وہ چمن زار کیا ہوا
کیا ہو گئیں وہ آنکھوں کی انجم فشانیاں
یعنی چراغِ بزمِ شبِ تار کیا ہوا
دیر و حرم کا جس سے تقدس تھا برقرار
وہ ارتباطِ سبحہ و زنّار کیا ہوا
اب تم بھی بھول جاتے ہو اپنی کہی ہوئی
تم نے کیا تھا رات جو اقرار کیا ہوا

○

ہیں کب سے بھولے ہوئے گیسوئے دوتا مجھ کو
نہ دے سکی کوئی پیغام بھی صبا مجھ کو
زہے وہ خارِ تمنّائے آرزو، جس نے
تمام عمر ہی رکھا برہنہ پا مجھ کو
رہی ہے وہ نگہِ ناز ملتفت لیکن
ملی نہ لذتِ بیداریِ وفا مجھ کو
مژہ کشا تو مری سمت وہ ہوئے لیکن
زفرق تا بہ قدم کردیا فنا مجھ کو
ہمیشہ قلب و جگر کو مرے نوازا ہے
تلاش کیوں نہ کرے ناوکِ بلا مجھ کو

ہزار رنج و مصیبت ہزار درد و الم
یہی ملا ہے وفا کا مری صلا مجھ کو
کنشت و دیر و حرم بھی ملے تہی دامن
کہیں تو ملتا کوئی رمز آشنا مجھ کو

○

یہ تو کچھ بھی نہیں دامان و گریباں شکنی
دیکھ لوگے ابھی کہتے ہیں کسے جاں شکنی
رسمِ پابندیِ آئینِ وفا ہے ہم سے
آپ سے سیکھے کوئی جرأتِ پیماں شکنی
بن گئی مژدۂ بیداریِ اربابِ جہاں
وہ مری دیدۂ بے خواب کی مژگاں شکنی
اب کہاں زُہد، کہاں حرمتِ تقویٰ یارو
غمزۂ دوست کی اللہ رے ایماں شکنی
آج پابندیِ زنجیر و سلاسل ہی سہی
کل سمجھ جاؤ گے کیا ہوتی ہے زنداں شکنی
تلخی و تیرگیِ زیست میں یاد آتی ہے
ان کے لب ہائے شکر ریز کی مرجاں شکنی
لعل و گوہر شکنی کوئی بڑی چیز نہیں
ہے بڑا جرم عزیزو دلِ انساں شکنی

□□

شاد فدائی

مرزا محمد ادریس شاد فدائی میر امّن دہلوی کی اصطلاح میں دلّی کے روڑے اور پُرانی دہلی کے کرخنداروں کی زبان میں کھرے کے کھرے دلّی والے ہیں۔ ایک دو دن سے زیادہ کے لیے دلّی سے باہر کبھی قدم نہ نکالا۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا اسی شہر کی گلیوں اور کوچوں میں گزارا اور اس طویل مدت میں بہ مشکل ایک سو پچاس دہلی سے باہر کی ہواؤں میں سانس لیا۔

شاد فدائی ۴ر مارچ ۱۹۲۵ء کو حاجی عبدالغنی صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اُس زمانے کے مروجہ طریقے کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ گھر کا ماحول خالصتاً غیر ادبی اور کاروباری تھا۔ دوستی اور بے تکلفی بھی غیر ادبی اور کاروباری لوگوں سے تھی، لیکن ایک ''حادثے'' نے ان کو شاعری کے کوچے میں پہنچا دیا۔

شاد فدائی نے گرچہ حضرتِ فدا خالدی دہلوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو کر اوائلِ عمر سے ہی شاعری شروع کر دی تھی لیکن دلّی کے ادبی منظر نامے پر ۱۹۵۰ء کے بعد ہی اُبھرے۔ شاد فدائی نے دس پندرہ سال تک دلّی اور اس کے قرب و جوار کے مشاعروں میں خوب دھوم مچائی لیکن ۱۹۶۴ء کے آس پاس مشاعروں اور نشستوں کی دنیا سے اچانک غائب ہو گئے۔ مشاعروں اور نشستوں کے سامعین تو کجا شاد فدائی کے ہم عصر شعراء بھی ان

کو ان کی شاعری کو بھول چکے تھے کہ ۲۰۰۱ء میں پرانی دلّی کے ادبی حلقوں اور شعری نشستوں میں شاد کا نام دوبارہ سنائی دینے لگا۔ شاد فدائی پندرہ سولہ سال کی خاموشی کے بعد اپنا شعری مجموعہ ''آواز کی لکیریں'' لے کر دنیائے ادب کے سامنے آئے ہیں، لیکن وقت ان کو بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

کیوں فضا میں دل کشی تھی رات کیا تم آئے تھے
روشنی ہی روشنی تھی رات کیا تم آئے تھے

ایک خوشبو سی اُڑی تھی رات کیا تم آئے تھے
روح تک مہکی ہوئی تھی رات کیا تم آئے تھے

ایک آہٹ تو سنی تھی رات کیا تم آئے تھے
دل پہ دستک بھی ہوئی تھی رات کیا تم آئے تھے

کس کے استقبال کو بے جان منظر جاگ اٹھے
روح کس نے پھونک دی تھی رات کیا تم آئے تھے

ہاتھ کس نے رکھ دیا تھا مضطرب دل پر مرے
چین سے نیند آگئی تھی رات کیا تم آئے تھے

اک کرشمہ ہے مریضِ عشق کا اٹھ بیٹھنا
نبض تو ڈوبی ہوئی تھی رات کیا تم آئے تھے

کیف میں ڈوبی ہوئی تھی وجد میں تھی کائنات
کس کے نغمے گا رہی تھی رات کیا تم آئے تھے

ذرّہ ذرّہ نور کے ٹکڑوں میں جیسے بٹ گیا
چاندنی بکھری ہوئی تھی رات کیا تم آئے تھے

دیکھنے والوں میں ہوں گے شادؔ بھی ناشاد بھی
مجھ پہ طاری بیخودی تھی رات کیا تم آئے تھے

○

تو رفیق جاں ہے عذر کیا مرے ساتھ چل مرے ساتھ آ
مرا ہم سفر بھی تو بن ذرا مرے ساتھ چل مرے ساتھ آ

مرے دوست جانبِ میکدہ مرے ساتھ چل مرے ساتھ آ
میں دکھاؤں رِندوں میں پارسا مرے ساتھ چل مرے ساتھ آ

یہ ہے کھیل تیرہ نصیب کا جو ہر ایک چھوڑ کے چل دیا
مرا سایہ بھی تو نہ کہہ سکا مرے ساتھ چل مرے ساتھ آ

مری وحشت اور بڑھا گیا وہ بگولہ کہتا گزر گیا
تجھے صحرا صحرا گھماؤں گا مرے ساتھ چل مرے ساتھ آ

میں فریبِ دہر میں آ گیا تو مرا ضمیر پکار اٹھا
تو زمانہ ساز نہ بن سکا مرے ساتھ چل مرے ساتھ آ

یہ مری خودی یہ مری انا میں جہاں کھڑا تھا وہیں رہا
مجھے وقت کہتا ہی رہ گیا مرے ساتھ چل مرے ساتھ آ

وہاں ذکرِ فکر و الم نہیں وہاں حادثوں کا گزر نہیں
یہ کسی نے شاؔد نہیں کہا مرے ساتھ چل مرے ساتھ آ

○

ابھی جھگڑنا ابھی منانا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا
جہاں کا احساس کچھ تو ہوتا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

اٹھا نہ اب ہاتھ اے مسیحا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا
ہوا نہ تجھ سے مرا مداوا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

جو تھے پیمبر مسرتوں کے جو روشنی سب کو بانٹتے تھے
انہی کے گھر میں ہے اب اندھیرا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

کبھی زبانوں پہ ہے لڑائی کبھی عقیدوں پہ ہاتھا پائی
یہ حال ہے گھر میں بھائیوں کا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

کہیں نہ انگلی اٹھے جہاں کی ملو نہ دل سے ہمیں گوارہ
مگر تعلق نہ توڑ دینا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

بنی ہے میری نظر سوالی جواب بھی تم نظر سے دینا
یہ سوچ کر اپنے لب ہلانا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

میں جانتا ہوں میں مانتا ہوں کسی سے دُکھ بانٹنا ہے اچھا
سوال تو ہے مری انا کا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

بتاؤ اے شاؔد راز کیا ہے یہ بہکی بہکی تمھاری باتیں
یہ سر پھروں جیسا بڑ بڑانا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

□□

شاہد انور

شاہد انور ۱۸؍جولائی ۱۹۶۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ فتح پوری مسلم اسکول میں تعلیم پائی، ذاکر حسین کالج سے بی۔اے کیا۔ شاعری میں حضرتِ مشیر جھنجھانوی کے شاگرد ہیں۔ مزاج میں قلندری اور بے نیازی ہے جس کی وجہ سے ادبی سرگرمیوں اور مشاعروں سے دور رہتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

اپنی آواز کو اوروں سے ملانے والے
تیری پہچان مٹا دیں گے زمانے والے

میرے خوابوں سے ترا کوئی تعلق ہی نہیں
کیوں پریشان ہے تعبیر بتانے والے

مکڑیاں اب نہ دہانوں پہ بُنیں گی جالا
غیر محفوظ ہیں سب غار میں جانے والے

اپنے ورثے کے چراغوں کو جلاتے ہی نہیں
خواہشِ نور بھی رکھتے ہیں زمانے والے
سانحہ ایک ہی لمحہ کے لیے آتا ہے
عمر کٹ جائے گی وہ لمحہ بھلانے والے
اس کی پلکیں نہ چھلک آئیں جواباً شاؔہد
اس لیے اشک چھپاتے ہیں ہنسانے والے

○

ایک مدت سے ہے درکار دلِ وحشی کو
غم کوئی قابلِ آزار دلِ وحشی کو
اک گزارش مرے حالات بدل سکتی تھی
بس! گوارہ نہیں اِنکار دلِ وحشی کو
چند لمحات ہی ٹھہرا تھا انا کا موسم
دے گیا کچھ نئے اشعار دلِ وحشی کو
اپنے کردار میں یکتا ہے زمانے بھر میں
غم گوارہ ہے نہ غم خوار دلِ وحشی کو
چوٹ سہنے کے بھی آداب ہیں لیکن شاؔہد
کون بتلائے یہ اسرار دلِ وحشی کو

○

ہمارے شہر کی خاموشیاں نرالی ہیں
سکون بخش ہیں چہرے مگر سوالی ہیں
کچھ ایسے فن سے مری جرأتوں کو چھینا ہے
شکایتیں جو مرے لب پہ ہیں خیالی ہیں

زمانے والے عجب امتحان لیتے ہیں
جنون دے کے مرے ضبط کے سوالی ہیں
میں اپنے سر کو بچانے کہاں کہاں جاؤں
یہ راہیں ساری ہی مقتل کو جانے والی ہیں
ہم اپنے ذہن پہ وہ زخم سہہ چکے شاہد
دوائیں جن کی زمانے نے اب نکالی ہیں

□□

شاہد ماہلی

شاہد حسین جو اردو دنیا میں شاہد ماہلی کے نام سے مشہور ہیں یکم مارچ ۱۹۴۳ء کو اعظم گڑھ کے قصبہ ماہل میں سید امیر حسن رضوی مرحوم کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے مولد میں ہی حاصل کی۔ گورکھپور یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد آگرہ یونیورسٹی سے اردو ادبیات میں ایم۔ اے کی ڈگری لے کر مرزا پور میں بی ایل جے کالج کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوگئے۔ لیکن بہتر مستقبل کا خواب شاہد ماہلی کو دہلی کھینچ لایا۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۸ء تک شاہد ماہلی آل انڈیا کانگریس کمیٹی نئی دہلی کے مرکزی دفتر میں شعبۂ اردو سے وابستہ رہے۔ اس زمانے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا شعبۂ اردو بڑا فعال تھا، اور ''سب ساتھ'' نامی اخبار باقاعدہ شائع ہوتا تھا لیکن جب شعبۂ اردو پر برا وقت آیا تو شاہد ماہلی ۱۹۷۸ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہوگئے اور آج کل ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔

شاہد ماہلی پندرہ سال کی عمر سے شاعری کر رہے ہیں اور تلمیذ الرحمٰن ہیں۔ اب تک دو شعری مجموعے ''منظر پس منظر'' ۱۹۷۷ء اور ''اُداسیاں'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان شعری کاوشوں کے علاوہ شاہد ماہلی نے ''انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ'' مرتب کی جو اردو میں اپنی نوعیت کی ایک اہم کتاب ہے۔ شاہد ماہلی کی دوسری نثری تالیفات میں ''نئی نظم، نئے

دستخط''، ''پاکستانی ادب اور کلچر کا مسئلہ''، ''فیض احمد فیض: عکس اور جہتیں''، ''کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں'' اور'' اختر الایمان: عکس اور جہتیں'' شامل ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے شاہد ماہلی'' غالب نامہ'' کی ادارت کے ساتھ ساتھ سہ ماہی جریدہ ''معیار'' بھی شائع کرتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

جنسِ گراں تھی خوبیِ قسمت نہیں ملی
بکنے کو ہم بھی آئے تھے قیمت نہیں ملی

ہنگامِ روز و شب کے مشاغل تھے اور بھی
کچھ کاروبارِ زیست سے فرصت نہیں ملی

کچھ دور ہم بھی ساتھ چلے تھے کہ یوں ہوا
کچھ مسئلوں پہ ان سے طبیعت نہیں ملی

اک آنچ تھی کہ جس سے سلگتا رہا وجود
شعلہ سا جاگ اٹھے وہ شدّت نہیں ملی

وہ بے حسی تھی خشک ہوا سبزۂ امیّد
برسے جو صبح و شام وہ چاہت نہیں ملی

خواہش تھی، جستجو بھی تھی، دیوانگی نہ تھی
صحرا نورد بن کے بھی وحشت نہیں ملی

وہ روشنی تھی، سائے بھی تحلیل ہو گئے
آئینہ گھر میں اپنی بھی صورت نہیں ملی

○

کچھ درد بڑھا ہے تو مداوا بھی ہوا ہے
ہر سو دلِ بیتاب کا چرچا بھی ہوا ہے
پُرزے بھی اُڑے ہیں مری وحشت کے سرِ راہ
نظروں میں ہماری یہ تماشا بھی ہوا ہے
پھوٹے ہیں کہیں آہ بھرے دل کے پھپھولے
پامال کوئی شہرِ تمنّا بھی ہوا ہے
مانا کہ کڑی دھوپ میں سائے بھی ملے ہیں
اس راہ میں ہر موڑ پہ دھوکا بھی ہوا ہے
روشن تو ہے یخ بستہ فضاؤں میں کوئی آگ
تاریکیِ زنداں میں اجالا بھی ہوا ہے
ہر لمحہ کوئی حادثہ روکے ہے مرے پاؤں
ہر پل کسی خواہش کا تقاضا بھی ہوا ہے
کس موڑ پہ آپہنچا ہے شاہدؔ یہ زمانہ
رفتار قیامت کی ہے، ٹھہرا بھی ہوا ہے

○

پھیلا ہے فضاؤں میں اک آواز کا جادو
بج اٹھتے ہیں رہ رہ کے مرے کان میں گھنگھرو
اک چہرہ کہیں دل کے نہاں خانے میں گُم ہے
اک سایہ لرز اٹھتا ہے ہر گام پہ، ہر سو
ہر شام سنور جاتی ہیں اشعار کی زلفیں
ہر صبح بکھر جاتے ہیں افکار کے گیسو
کھل جاتے ہیں ہر رات کو خوابوں کے دریچے
در آتی ہے چپکے سے تری یاد کی خوشبو

دریا کے کناروں کی طرح ساتھ چلے ہم
میں آج تلک میں ہی رہا، تو بھی رہا تو
وہ ناز نہ انداز ، نہ تیور ، نہ وہ چِتون
سب چھین لیا وقت نے باقی ہے مگر خو
پامال ہیں سب مدح کے الفاظ لکھوں کیا
گل جیسے یہ لب، نرگسی آنکھیں، رمِ آہو

O

سانسوں میں، رگ و پے میں سمایا ہے کوئی اور
ہے زیست کسی اور کی جیتا ہے کوئی اور
آنکھوں نے بسائی ہے کوئی اور ہی صورت
اس دل کے نہاں خانے میں ٹھہرا ہے کوئی اور
کیا طرفہ تماشا ہے کہ اِس دل کی صدا کو
سنتا ہے کوئی اور سمجھتا ہے کوئی اور
اک آگ ہے جو دل میں بجھی جاتی ہے ہر پل
خرمن سے جو اٹھتا ہے وہ شعلہ ہے کوئی اور
لاشے ہیں کنارے پہ پڑے تشنہ لبوں کے
جو پیاس بجھاتا ہے وہ دریا ہے کوئی اور
ہر صبح پہ سایہ سا ہے کچھ تلخیِ شب کا
ہر شام کو اندیشۂ فردا ہے کوئی اور
اک بوئے رفاقت سی فضاؤں میں ہے شاہدؔ
اس کوچۂ بیگانہ سے گزرا ہے کوئی اور

عظمتیں

عظمتیں
اپنے سینوں پہ
کتبوں کے تمغے لگائے
بڑی دیر تک
میری حیرت پہ ہنستی رہیں
جانے کتنی فتوحات کو داستاں
پتھروں کی زبانی
سناتی رہیں
گنگناتی رہیں
جانے کتنے شب و روز کے
رنگ، صد رنگ نغمے
دکھاتی رہیں
دُھند میں جب کوئی قافلہ
آ کے ٹھہرا
نکلتی رہی صف بہ صف
آتی جاتی رہی
لشکروں کی کمک
وہ چمک چمک
چیخ، للکار، چھنکار
آہ و بکا
خون کی ندیاں
عظمتیں دھند میں

سب دکھاتی رہیں
مسکراتی رہیں
گنگناتی رہیں
عظمتیں میری کتبوں کی تحریر
پڑھنے کی لاحاصلی دیکھ کر
روپڑیں
عظمتیں روپڑیں۔

ایک لمحے کا خوف

شب وروز کے مشغلوں سے پرے
کوئی ایسا بھی لمحہ ہے
جس کے تصور میں
کتنے شب وروز
بے چین گزرے
دھڑکتی ہوئی نبض ڈوبی
آتی جاتی ہوئی سانس
راہوں میں رکنے لگی
اندھیروں کے طوفان میں
ایک کشتی بھی
ساحل سے اوجھل ہوئی
کوئی جگمگاتا ستارہ
فلک کی بلندی سے گر کر

کہیں کھو گیا
سرد سارا بدن ہو گیا
اور پھر
جیسے تاریک گوشے میں
کوئی کرن مسکرائی
کوئی آرزو ہنس پڑی
گرمیٔ حسرت دل بھی
ٹھٹھرے ہوئے جسم میں
تازگی بھر گئی
چل پڑی
پھر شب و روز کے مشغلوں سے لدی
زنگ آلود گاڑی۔

□□

شجاع خاور

شجاع الدین (ساجد) جو اردو دنیا میں شجاع خاورؔ کے نام سے مشہور ہیں، خالص دہلی والے ہیں۔ ۲۴ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو پرانی دہلی، کے ایک شریف اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اینگلو عربک اسکول اور مرحوم دہلی کالج جیسے قدیم اور تاریخی درسگاہوں میں تعلیم پائی۔ دہلی یونیورسٹی میں درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ کل ہندسول سروسز کے مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی حاصل کر کے انڈین پولس سروس میں شمولیت اختیار کی۔ دہلی اور یونین ٹریٹریز کے علاقوں میں پولس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ڈپٹی کمشنر آف پولس (دہلی) کے عہدے پر پہنچ کر طویل علالت اور ناسازیٔ طبع کی وجہ سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیا۔

شجاع خاور اوائلِ عمر سے شاعری کر رہے ہیں اور دہلی کی سرزمین سے ابھرنے والے شاعروں میں ایک اہم اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں ''اردو شاعری میں تاج محل'' کے عنوان سے تاج محل پر مختلف شعراء کی نظموں کو مرتب کر کے اور ان کا مختصر تنقیدی جائزہ لے کر اپنے تصنیفی سفر کا آغاز کیا۔ اب تک کئی شعری مجموعے اردو دنیا کو دے چکے ہیں جن میں ''واوین'' (۱۹۸۲ء)، ''دوسرا شجر'' (طویل نظم) ۱۹۷۰ء، ''مصرعِ ثانی'' ۱۹۸۷ء اور ''اللہ ہو'' شامل ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

اِس سر کی ضرورت کبھی اُس سر کی ضرورت
پوری نہیں ہوتی مرے پتھر کی ضرورت

تخئیل کو ہر دم ترے پیکر کی ضرورت
مفلس کو رہے جیسے سدا زر کی ضرورت

بند آنکھیں کیے رہتے ہیں بینائیوں والے
دِکھتا ہو تو پھر کیا کسی منظر کی ضرورت

دل اوپری تسکین پہ راضی نہیں ہوتا
اور لوگ سمجھتے نہیں اندر کی ضرورت

ایمان بھی ہے ختم نبوّت پہ ہمارا
محسوس بھی کرتے ہیں پیمبر کی ضرورت

ویسے تو سبھی کچھ ہے مگر بہرِ نمائش
قطرے کو ہے بس ایک سمندر کی ضرورت

پھر دشت نوردی کا چلن عام ہوا ہے
پھر ہوتی ہے محسوس ہمیں گھر کی ضرورت

اب کس کے وسائل ہیں کہاں تک یہ الگ ہے
اظہار کی سب کو ہے برابر کی ضرورت

دُشمن کو شجاعؔ آپ کا اسلوب بہت ہے
برچھی کی ضرورت ہے نہ خنجر کی ضرورت

○

کیا فکر جو دشمن ہیں مرے یار غزل کے
مدّاح بھی مل جائیں گے دو چار غزل کے

اسلوب کے طوفان میں مضمون کی کشتی
اللہ اُتارے گا مجھے پار غزل کے
طوفان ہو سینے میں مگر لب پہ خموشی
حضرات یہی ہوتے ہیں آثار غزل کے
دُنیا کی عنایت ہو کہ ہو تیری نوازش
خالی نہیں جاتے ہیں کبھی وار غزل کے
دونوں میں حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے
ہوتے ہیں سخن فہم طرفدار غزل کے
الفاظ کے الفاظ معانی کے معانی
ہُشیار بڑے ہوتے ہیں فن کار غزل کے
وہ میر کا اسلوب وہ غالب کا سلیقہ
پہلے نہ تھے انداز دل آزار غزل کے
وہ بحر و قوافی وہ ردیفیں وہ زمینیں
دلچسپ بڑے ہوتے ہیں کردار غزل کے
سو بار یہ سوچا کہ بس اب نظم لکھیں گے
چکّر میں مگر آ گئے ہر بار غزل کے
بازار میں ہر شخص قصیدے کا طلب گار
ہم ہیں کہ لیے پھرتے ہیں اشعار غزل کے

○

پاؤ گے بڑی شہرت گر کام یہ کر جاؤ
جینا نہیں آتا تو خاموشی سے مر جاؤ
یوں ٹوٹنا ویسے تو اچھا نہیں ہوتا ہے
اب ٹوٹ گئے ہو تو ہر سمت بکھر جاؤ

یہ حال ہوا ہے تو کس کام کا مستقبل
ماضی کے سمندر میں چپکے سے اُتر جاؤ
تبدیلیٔ موسم کو جائیں تو کہاں جائیں
سب ایک سا موسم ہے اس وقت جدھر جاؤ
جب آہی گئے اس کے کوچے سے گزر کر اب
جلدی سے لگے ہاتھوں جاں سے بھی گزر جاؤ
ویسے تو مضر ہوگا خوابوں کی طرف جانا
پھر لوٹ کے مت آنا بالفرض اگر جاؤ
یوں آ کے فلک پر تم خاموش شجاعؔ کیوں ہو
یا توڑ لو تاروں کو یا لوٹ کے گھر جاؤ

○

فرسودہ قارئین کو چکّر میں ڈال دے
تاریکیوں کو صبح کے منظر میں ڈال دے
آسیب ہے سخن پہ بڑا لفظیات کا
مفہوم لفظ لفظ کے پیکر میں ڈال دے
موسم کا ظلم پھیلتا جاتا ہے ہر طرف!
عرضی اک آسماں کے دفتر میں ڈال دے
غرقاب ایک جام میں سب آنسوؤں کو کر
دریا تمام ایک سمندر میں ڈال دے
پہچان میری شہرِ حقیقت میں کچھ تو ہو
دشتِ خیال! خاک مرے سر میں ڈال دے
دُشوار ہے شراب میں ساغر کو ڈالنا
اے مجتہد! شراب ہی ساغر میں ڈال دے
قبضہ ہمارے گھر پہ اُداسی کا ہے شجاعؔ
خوابوں کا مال اور کسی گھر میں ڈال دے

○

یہ لفظ یہ لہجہ یہ زباں ، کون سنے گا
کیوں دشت میں دیتے ہو اذاں کون سنے گا
موضوع بھی یوں کون سا اچھا ہے ہمارا
اور اس پہ یہ انداز، اماں کون سنے گا
ساری ہی زمیں پر ہے ستم کرب و بلا کا
اک میری شہادت کا بیاں کون سنے گا
اوّل تو ہم اب کہتے نہیں کچھ بھی کسی سے
اور ہم نے کہا بھی تو یہاں کون سنے گا
کیوں خواب سناتے ہو شجاؔع اپنے ہر اک کو
بیکار کی باتیں یہ میاں کون سنے گا

○

نادیدنی ہر بزم کا منظر ہے مگر دیکھ
تنہائی سے بچنا ہے تو یہ کام بھی کر دیکھ
ہوتا نہیں کچھ اپنی دعاؤں کا اثر دیکھ
جا آرزوئے وصل کوئی دوسرا گھر دیکھ
خاموشی اب اچھی نہیں اے لمحۂ اظہار
لے آ گیا جذبات کی دیوار میں در، دیکھ
دیکھا تو بہت کچھ ہے شجاؔع شہر میں تو نے
اِس شہر میں زندہ ہیں ہمارا بھی ہنر دیکھ

□□

شعیب مرزا

اوائلِ عمر سے ہی شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے اور طالب علمی کے زمانے کے دوران صحافت کی طرف مائل ہونے اور شعور سنبھالنے کے بعد بلڈنگ کنسٹرکشن اور کاشتکاری جیسے غیر ادبی اور غیر شاعرانہ پیشوں سے وابستگی اختیار کرنے والے شعیب مرزا ان شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے بڑی سبک روی کے ساتھ دہلی کے شعری و ادبی منظرنامے پر اپنے شعری وصحافتی وجود کا احساس کرایا ہے۔

شعیب مرزا یکم جولائی ۱۹۶۷ء کو ضلع بجنور کے ایک چھوٹے سے قصبے شیرکوٹ کے ایک علم دوست اور شعر و ادب کے دلدادہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرحوم ڈاکٹر مرزا محمد تحسین بیگ صاحب خود شاعر تھے اور اپنے ضلع کی ادبی دنیا میں کلیم شیرکوٹی کے طور پر خاصے جانے پہچانے جاتے تھے۔ شعیب مرزا کی ابتدائی تعلیم و تربیت شیرکوٹ ہی میں ہوئی۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم دہلی کی مختلف دانش گاہوں میں حاصل کی۔ انگلش لٹریچر میں ایم۔اے کرنے کے علاوہ جدید فارسی اور جدید عربی کی بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

تعلیمی زندگی کے ابتدائی دور میں بچوں کے لیے نظمیں لکھ کر شعری سفر کا آغاز کیا لیکن جب با قاعدہ شاعری شروع کی تو کسی استادِ فن کی انگلی پکڑ کر چلنے کی بجائے شعر و ادب کے گہرے مطالعے اور وجدان کو اپنا رہبر بنایا۔ اسی طرح صحافتی دنیا میں اپنی راہ خود بنائی

ہے۔ کئی اخبارات و رسائل کی مجلسِ ادارت سے وابستہ ہیں اور ایک ہفت روزہ اخبار ''تصویرِ وطن'' کے ایڈیٹر ہیں۔
آج کل اردو اکادمی، دہلی کی مجلسِ عاملہ کے ممبر ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

کبھی بیاں تو کبھی ترجماں بدلتا ہے
ستم شعار ارادہ کہاں بدلتا ہے

وہ بات بات پہ اپنی زباں بدلتا ہے
بدل بدل کے زباں بھی، کہاں بدلتا ہے

وہ چاہتا ہے مری داستاں مٹا ڈالے
اسی سبب سے مری داستاں بدلتا ہے

وفا کا لفظ میں اپنے لہو سے لکھتا ہوں
مرا ہی خون سدا سرخیاں بدلتا ہے

غرورِ وقت کبھی یہ خیال بھی کرنا
بس ایک لمحہ، نظامِ جہاں بدلتا ہے

○

چاہت کا کوئی دام نہیں ہے
عشق لہو آشام نہیں ہے

آنکھوں پر بہتان سراسر
دل کے سر الزام نہیں ہے

خیر سے اُن کا طرزِ تکلّم
دشنہ ہے دُشنام نہیں ہے

ان کے لبوں پر نام ہی آنا
کوئی کم انعام نہیں ہے
غم کا مداوا ڈھونڈنے والے
غم کا مداوا جام نہیں ہے

○

زد پہ آجائے تو کہسار میں کیا رکھا ہے
اور مینار میں ! مینار میں کیا رکھا ہے
میں فلک بوس تکبر کا تماشائی ہوں
کیسے کہہ دوں یدِ نادار میں کیا رکھا ہے
جذبۂ غیرتِ مظلوم ہی بیدار نہیں
ورنہ ظالم! کسی یلغار میں کیا رکھا ہے
یہ نہ سمجھا کبھی گرتی ہوئی سرکاروں نے
ہم سنبھل جائیں تو سرکار میں کیا رکھا ہے
اب تو معیارِ صحافت ہی نہیں پہلے سا
چھوڑ اخبار کو اخبار میں کیا رکھا ہے

○

پست ہمت سے کہاں معرکہ سر ہوتا ہے
سر کو ٹکراؤ تو دیوار میں در ہوتا ہے
اپنی ہستی سے جب اپنا ہی گزر ہوتا ہے
طے کہیں تب یہ محبت کا سفر ہوتا ہے
لاکھ محروم رہوں باعثِ یلدا لیکن
میری آنکھوں کا ہدف نورِ سحر ہوتا ہے
یہ ضروری تو نہیں شعر کہا بھی جائے
شعر پڑھنے میں ہی اعجازِ ہنر ہوتا ہے
ذکر اپنا بھی محبان و عزیزاں میں شعیب
ہو تو جاتا ہے باندازِ دِگر ہوتا ہے

○

اہلِ فن دیکھ لیں اچھا کہ برا کہتے ہیں
ہم سخنور تو نہیں اپنا کہا کہتے ہیں
اپنا ہر طور زمانے میں جداگانہ ہے
شعر یوں سارے زمانے سے جدا کہتے ہیں
غم گساروں پہ کہاں غم کا مداوا کوئی
اہلِ غم ضبط کو ہی غم کی دوا کہتے ہیں
نغمہ و مے کا فسوں اپنی جگہ ہے لیکن
چشمِ قاتل کو ہی اندوہ رُبا کہتے ہیں
عمر بھر چین سے جینے تو نہیں دیتے شعیبؔ
بعد مرنے کے سبھی سب کو بھلا کہتے ہیں

○

بھولوں بھی کس طرح سے بھلا بے وفا کو میں
اس کو جفا عزیز ہوئی ہے، جفا کو میں
آنکھوں میں کوئی اور سمایا نہیں کبھی
آنکھیں سفید ہیں تو ملا ہوں قضا کو میں
رنج و خوشی کا ساتھ میسّر ہوا مجھے
ہر دو گھڑی میں بھول نہ پایا خدا کو میں
لاریب تو ہے علّتِ تجسیم سے بری
دیکھوں درونِ قلب ترے نقشِ پا کو میں
دیکھا سنا نہیں، نہ پڑھا ہے بہت شعیبؔ
لیکن خراج پیش کروں گا رسا کو میں

□□

شمس رمزی

شمس رمزی کا خاندانی نام جمیل احمد ایوبی انصاری نورالقادری ہے۔ ماہرِ عروض جناب احسن گنوری مرحوم کے ہم وطن ہیں۔ تاریخ پیدائش خود شمس رمزی کو معلوم نہیں لیکن سالِ پیدائش ۱۹۶۰ء ہے۔ ان کے والد جناب نبی بخش ایوبی انصاری مرحوم گنور کے کافی آسودہ حال اور متمول لوگوں میں سے تھے۔ لیکن وہ آسودہ حالی ''ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے'' کی تفسیر بن گئی اور شمس رمزی کو حصولِ معاش کے لیے دہلی کو اپنا وطنِ ثانی بنانا پڑا۔

۱۹۸۰ء سے دہلی میں مستقل سکونت پذیر ہیں اور مشرقی دہلی کی ادبی و شعری سرگرمیوں کے روحِ رواں ہیں۔ اوائلِ عمر سے شاعری شروع کی لیکن ۱۹۷۶ء سے باقاعدہ شاعری کررہے ہیں۔ علامہ رمز آفاقی گنوری کے شاگرد ہیں اور استاد کی طرح عروض پر اچھی نگاہ رکھتے ہیں۔ ''غبارِ شمس'' شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۹۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے علاوہ '' آئینہ در آئینہ'' ایک نثری تصنیف ہے جس کے تحت ہندوستان و پاکستان کے کچھ ممتاز شعراء کی غزلوں کا عروضی جائزہ لے کر شمس رمزی نے علمِ عروض سے اپنی بھرپور واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ ''کفیل آزر: فن و شخصیت'' (مطبوعہ ۲۰۰۰ء) شمس رمزی کی دوسری نثری تصنیف ہے جس میں کفیل آزر کی شاعری اور شخصیت کو موضوعِ قلم بنایا ہے۔ '' کائنات در کائنات'' جناب رمز آفاقی گنوری مرحوم کا شعری مجموعہ ہے جسے شمس

رمزی نے مرتب کر کے ۲۰۰۰ء میں اردو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔
شمس رمزی کے یہاں عام مشاعروں کے سامعین کی تسکینِ طبع کا سامان بھی ہے اور سنجیدہ شاعری کے قارئین کے لیے بھی بہت کچھ موجود ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

غزل دیار میں ہوں نغمۂ دمیدہ میں
یہ اور بات کہ ہوں حرفِ نارسیدہ میں

یہ شہرِ جسم میں نشتر سے کون توڑتا ہے
یہ کس کے واسطے رہتا ہوں دل کبیدہ میں

یقین رکھ کہ فلک دسترس سے دور نہیں
بہ احترامِ بزرگاں ہوں سر خمیدہ میں

میں فرشِ خار سے گزرا ہنسی خوشی لیکن
ہوا ہوں پھول کی پتی سے آبدیدہ میں

شگاف دل میں لیے جی رہا ہوں مدت سے
نہ پوچھو مجھ سے کہ کب سے ہوں دل دریدہ میں

مسرتوں پہ لکھا میں نے مرثیہ اکثر
غموں کا لکھتا رہا ہوں سدا قصیدہ میں

شکست لشکرِ دشمن کو دے تو دی لیکن
محاذِ جنگ سے لوٹا ہوں سربریدہ میں

اسے پسند بھی آئے ہوں کیا ضروری ہے
سنا کے شعر تو آیا ہوں چیدہ چیدہ میں

مری جبیں پہ نشانِ شکن نہ پاؤ گے
فضائے گلشنِ ہستی میں ہوں دمیدہ میں

ورق ورق پہ پڑھو نور جیسی تحریریں
صداقتوں کا درخشندہ اک جریدہ میں
کسی نے پڑھنے کی زحمت نہ کی کتابِ انا
یہی سبب ہے رہا حرفِ ناشنیدہ میں
کسی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
کہ اپنے وقت سے ہوں دوستی گزیدہ میں
طوافِ شمس میں رہتے ہیں لفظ روز و شب
کہ شاہ راہِ ادب میں ہوں برگزیدہ میں

O

آمد و رفت کے رستے ہیں زمین و افلاک
ہم نے پیروں تلے روندے ہیں زمین و افلاک
از زمیں تا بہ فلک تیری حکومت اب تک
تیری انگلی کے اشارے ہیں زمین و افلاک
انگنت بار کیا ان کو مسخر تو نے
تیرے قد سے ابھی بونے ہیں زمین و افلاک
تیرے کردار کی عظمت ہے نمایاں ان پر
تیرے کردار سے چھوٹے ہیں زمین و افلاک
ہیں بغیر در و دیوار کے قائم اب تک
تیری قدرت کے کرشمے ہیں زمین و افلاک
لعل و یاقوت سے ہیں اپنی جگہ پر روشن
جیسے خاتم کے نگینے ہیں زمین و افلاک
حکم کن سے جو نمودار ہوئے ہیں اس کے
کتنے تابندہ شمارے ہیں زمین و افلاک

روزِ اول سے انھیں دیکھ رہا ہے انساں
جیسے انساں کے کھلونے ہیں زمین و افلاک
ایک پل میں یہ بلندی سے گرادیتے ہیں
رنگ جب اپنا بدلتے ہیں زمین و افلاک
ہیں شب و روز بھی محتاج، کرم کے تیرے
تیرے انداز نرالے ہیں زمین و افلاک
روزِ اول سے درخشندہ ہیں انساں کے لیے
شمسؔ یہ کیسے ستارے ہیں زمین و افلاک

○

نے محبت سے ہمیں ہے نہ مروّت سے گریز
عمر بھر ہم نے کیا صرف عداوت سے گریز
صرف تکمیلِ ہوس، عشق کا مقصود نہیں
یہ محبت ہے تو پھر ایسی محبت سے گریز
تیرے لہجے میں خدا بول رہا تھا بیشک
کون کرتا ترے لفظوں کی صداقت سے گریز
دوستوں کے لیے اشکوں کو کہاں تک پیتے
ہو کے مجبور، کیا ہم نے شرافت سے گریز
اس جفاکار کے غم میں یہ برستیں کب تک
چشمِ گریاں نے کیا اب تو بصارت سے گریز
یہ الگ بات کہ اک فاصلہ رکھا ہم نے
ہم نہ کر پائے مگر اس کی رفاقت سے گریز
یہ ضروری ہے کہ جدّت میں کوئی فکر بھی ہو
ذہنِ تابندہ کریں خوب روایت سے گریز

کوئی احسان نہ تھا اپنی خودی کو منظور
عمر بھر ہم نے کیا اس کی عنایت سے گریز
اس گلِ رعنا کو ایماں پہ نہ دوں گا ترجیح
کیوں کروں اس کے لیے شمسؔ عبادت سے گریز

○

بسی ہوئی ہے یہ کیسی خوشبو مجھ میں
شاید آ کر بیٹھ گیا ہے تو مجھ میں
ظلمت میں یہ نور کہاں سے پھیلا ہے
بول رہا ہے کون یہ اللہ ہو مجھ میں
تیری طلب میں جانِ تمنا ہر شب کیوں
جلتے بجھتے رہتے ہیں جگنو مجھ میں
دل پاگل کیوں ناچ رہا ہے سوچتا ہوں
ٹوٹ رہے ہیں یہ کیسے گھنگھرو مجھ میں
تم میری تعریف کے پُل کیوں باندھتے ہو
نکلیں گے تضحیک کے بھی پہلو مجھ میں
غم میں کسی کے آنکھیں بہتی رہتی ہیں
جذب کہاں ہو پاتے ہیں آنسو مجھ میں
جان لیا ہے میں نے ہر شے فانی ہے
اے دنیا پھر کیوں ہو تیری خو مجھ میں
شاعر ہوں کیا ایرا غیرا سمجھا ہے
ڈھونڈ رہے ہو کیوں نتھو خیرو مجھ میں
شمسؔ میں خود یہ راز نہ اب تک جان سکا
میں اردو میں ضم ہوں یا اردو مجھ میں

○

پہلے صحرا میں کریں ہم ریت کے گھر کی تلاش
پھر کریں گے ہم سرابوں کے پیمبر کی تلاش

سب غیور انساں بھکاری بن گئے اس دور میں
اب کسی بھی پیٹ پر مت کرنا پتھر کی تلاش

میں نے ہر جنگل میں کھیلا جا کے ہرنی کا شکار
کر گئی قاتل مجھے بھی مشک و عنبر کی تلاش

ہم چراغِ زندگی ہیں ہم سے مانگو روشنی
تم عبث کرتے ہو یارو ماہ و اختر کی تلاش

سر سے پا تک جو وقارِ آدمی کو ڈھانپ لے
نا مکمل ہے ابھی تک ایسی چادر کی تلاش

ماسوا میرے جسے دیکھو وہ ہے افلاک پر
اس نئی پیڑھی میں مت کر مجھ سے کمتر کی تلاش

اب دعا کے نام پر الفاظ کا مت کر زیاں
بے عمل ہو کر ابابیلوں کے لشکر کی تلاش

ہم ابھی واقف نہیں اس شہر کے ماحول سے
دستکوں سے پہلے ہونی چاہیے گھر کی تلاش

بو علی کا ذکر کیا بوئے وفا تک بھی نہیں
چھوڑ دیجے شمسؔ رمزی اب قلندر کی تلاش

○

دوستی کے سارے لمحے تیرے نام
یعنی اپنے خواب سنہرے تیرے نام
مہکی خوشبو، کھلتے غنچے تیرے نام
کاہکشاں تک مہکے رستے تیرے نام

کالی راتیں صرف ہمارے حصّے میں
صبحِ مسرت نور کے تڑکے تیرے نام
لمحہ لمحہ عمر کی میری سانسوں تک
دل کے سب پاکیزہ رستے تیرے نام
پت جھڑ موسم دھوپ ہمارے حصّے میں
سبز رُتوں کے سارے سائے تیرے نام
میرے مقدر میں آئی ہے تشنہ لبی
بہتے دریا میٹھے چشمے تیرے نام
کانٹے، پتھر، خاک ہمارے حصّے میں
جگنو، سورج، چاند، ستارے تیرے نام
آنکھوں سے جو یاد میں تیری نکلے ہیں
میرے یہ نایاب نگینے تیرے نام
ہر آئینہ عکس ہے تیرے چہرے کا
روزِ ازل کے سارے جلوے تیرے نام
خوشبو کو دامن میں لے کر جو آئیں
بادِ صبا کے وہ سب جھونکے تیرے نام

O

جنگ کے میدان میں کھیلیں گے کیا تلوار سے
وہ جنھیں فرصت نہیں پازیب کی جھنکار سے
لفظِ ہمدردی و ہجرت سب ہوئے بیکار سے
خوف کھاتا ہے مہاجر آج بھی انصار سے
کتنا شرمندہ کرے گی آج پھر بچوں کی بھوک
اشک لے کر آج بھی لوٹا ہوں میں بازار سے

ہم فقیرِ وقت ہیں صبرو قناعت آشنا
ہم کو کیا لینا کسی نوّاب سے زر دار سے
ڈوبنے والے کی قسمت میں لکھا تھا ڈوبنا
کیا شکایت کشتی و ملاح سے پتوار سے
ہر قدم پر ظلم کو، ظالم کو دیتا ہے شکست
آپ واقف ہی نہیں ہیں صبر کے معیار سے
شام سے پہلے چلو گھر خیریت سے لوٹ لیں
آج کچھ چہرے نظر آئے ہیں پُراسرار سے
ہر یزیدِ وقت کا ہم صبر سے دیں گے جواب
کربلا پیدا کریں گے آج پھر انکار سے
اب ضرورت ہے کہ تو اسلاف کی تاریخ پڑھ
تو بھی اپنی جیت لکھ اخلاق کی تلوار سے
لائقِ تحسین ہیں اے شمسؔ وہ شاگردِ رمزؔ
رمزؔ صاحب نے نوازا ہے جنھیں دستار سے

○

نواغم تھے مرے اور خوشی شکستہ پا
قدم قدم پہ ملی زندگی شکستہ پا
تمام شہرِ وفا تیرگی میں ڈوبا تھا
وہ آگئے تو ہوئی تیرگی شکستہ پا
شکم کی آگ بجھانا بہت ضروری تھی
نہ چاہ کر بھی ہوئی ہے خودی شکستہ پا
جواں لہو میں دہکتے تھے عشق کے شعلے
ڈھلی جو عمر ہوئی شعلگی شکستہ پا

محبتوں کے جو معنی سمجھ لیے جائیں
ضرور ہوگی میاں دشمنی شکستہ پا

بچھڑتے وقت کا منظر نہ پوچھیے ہم سے
بس ایک پل میں ہوئی ہر خوشی شکستہ پا

کچھ اور دیر جلے دوستو دعا مانگو
چراغِ کہنہ کی ہے روشنی شکستہ پا

یہ کس نے آکے رکھے ہاتھ میری آنکھوں پر
یہ کون کر کے گیا ہے نمی شکستہ پا

تمام شہر تری جستجو میں چھانا ہے
نہ کرسکی مجھے آوارگی شکستہ پا

ہر ایک روز نیا اک عذاب جھیلا ہے
جہاں جہاں بھی ہوئی آ گہی شکستہ پا

کسی بھی تیشے سے اٹھتا نہیں شرارۂ سنگ
ہوا ہے جب سے فنِ آزری شکستہ پا

یہ کون شمسؔ یہاں آئینہ بدست آیا
کری ہے کس نے یہ بے چہرگی شکستہ پا

□□

شمیم عثمانی

شمیم عثمانی ۱۹۴۲ء میں دیوبند کے ایک متوسط مگر علمی اور مذہبی خانوادے میں پیدا ہوئے تھے اور دہلی کی قدیم ترین اور تاریخی درسگاہ اینگلو عربک اسکول میں انگریزی زبان کے استاد تھے۔

علم و ادب اور مذہب سے دلچسپی خاندان کے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی اور شاعری کی روایت عامر عثمانی مرحوم جیسے صاحبِ طرز ادیب و شاعر سے پہنچی تھی۔ عامر عثمانی مرحوم ان کے عمِ زاد بھائی اور دیوبند سے شائع ہونے والے ماہنامہ "تجلّی" کے مدیر اور اپنے بے لاگ تبصروں اور ادبی محاسبہ آرائی کے لیے اردو دنیا میں مشہور تھے۔

شمیم عثمانی کافی وسیع المطالعہ انسان تھے۔ مختلف زبانوں کے ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ نہایت فنکارانہ انداز سے اور نوک پلک درست کر کے شعر کہا کرتے تھے لیکن مزاج کی غیر معمولی شرافت کی وجہ سے شاعرانہ نام و نمود سے گھبراتے تھے۔

فروری ۱۹۵۵ء میں مختصر سی علالت کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا اور دہلی گیٹ کے گورِ غریباں میں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کے بعض مخلص دوستوں کی کوششوں کے باوجود ورثاء کے تساہل کی وجہ سے مجموعۂ کلام ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا۔

نمونۂ کلام:

غزل

ہے شکست آمادہ ایوانِ سیہ آثارِ شب
چڑھتے سورج کا پجاری بن گیا معمارِ شب

یہ تماشا کب تلک اے محرمِ اسرارِ شب
صبح دم ہے کشتنی ہر زندہ و بیدارِ شب

تھا چراغِ شعلہ رو سے روشنی کا کچھ بھرم
آفتاب زرد رو سے بڑھ گیا پندارِ شب

اے تنک گوشو یہ تم نے کاٹ دی کس کی زباں
تھا نقیبِ صبحِ معنی، صاحبِ گفتارِ شب

کون ہے جو اپنی وحشت سے نہیں آشفتہ جاں
تیرگی ہے آج خود ہی درپئے آزارِ شب

اے تہی کیسہ کہیں سے نقدِ خواب آشوب لا
سرد پڑتی جا رہی ہے گرمیِ بازارِ شب

چشمِ تر کوتاہ بیں تھی ورنہ یہ بھی دیکھتی
تھا پسِ دیوارِ گریہ خندۂ ہشیارِ شب

کھو گیا آخر کہاں تو اے حریفِ دوست کام
جی جلاتا ہے بہت ہم مشربِ اغیارِ شب

اپنی اس بے چارگی کا ذکر کیا کیجیے شمیم
قاتلِ احساس نکلا مونس و غمخوارِ شب

○

مجھ سے دنیا آشنا اور خود سے میں نا آشنا
دور باش اے خوش فریبی کون کس کا آشنا

عہدِ ظلمت میں دلوں کے حال سے واقف تھے ہم
روشنی کے دور میں ہیں صرف چہرا آشنا

کچھ نہیں اس کے سوا صحرا گزینی کا سبب
ظرف اپنا قطرہ ساماں پیاس دریا آشنا

کون ہے میرے سوا آئینہ بردارِ سحر
میں چراغِ آخرِ شب کا ہوں تنہا آشنا

کچھ نہ کچھ تو تیرگی پر آنچ آتی دوستو
کاش ہوتے یہ خس و خاشاک شعلا آشنا

ایک دن آجائے گی میری زباں پر دل کی بات
ایک دن ہوجائے گا ہر آشنا نا آشنا

صرف تم سے ہی نہیں خود سے بھی میں بیزار ہوں
میری مشکل یہ ہے یارو میں ہوں اپنا آشنا

چاک داماں ہیں سبھی بازارِ شہرِ حسن میں
کس کا دامن ہے مگر دستِ زلیخا آشنا

کتنے دربانوں کا درماں بے نیازی تھی شمیم
بن گیا آزارِ جاں دردِ مسیحا آشنا

○

میں شعلہ نفس سوختہ جاں مجھ کو نہ چھیڑو
جل جائیں گے یہ کون و مکاں مجھ کو نہ چھیڑو

تم ریگِ رواں ہو کے بھی پابوسِ ہوا ہو
میں سر بہ فلک کوہِ گراں مجھ کو نہ چھیڑو

مقتل کو عدالت نہ کہا ہے نہ کہوں گا
فریاد رساں داد گراں مجھ کو نہ چھیڑو

میں نعرۂ مصلوب ہوں تاریخِ انا کا
اے تاجورِ خوش سخناں مجھ کو نہ چھیڑو

تم شیشہ بدن آزر فرہاد کے وارث
میں شیشہ شکن سنگِ گراں مجھ کو نہ چھیڑو

میں منتظرِ نوکِ سناں غنچۂ دل گیر
ممنونِ صبا، گل بدناں مجھ کو نہ چھیڑو

میں آتشِ رفتہ کا ہوں خاکسترِ حساس
اٹھتا ہے مرے دل سے دھواں مجھ کو نہ چھیڑو

الفاظ تو خوش رنگ نقابوں کی طرح ہیں
پڑھتا ہوں میں چہروں کی زباں مجھ کو نہ چھیڑو

کیا میرؔ کا دیوان شمیمؔ آئے ہو پڑھ کر
ہر شخص سے کہتے ہو میاں مجھ کو نہ چھیڑو

○

کیا بتاؤں کون دامن گیرِ قاتل ہے یہاں
خونِ ناحق تشنۂ شمشیرِ قاتل ہے یہاں

جانتے ہیں خوب یہ حلقہ بگوشانِ وفا
ہر قدم پر حلقۂ زنجیرِ قاتل ہے یہاں

آئینے جھوٹے ہیں یا آنکھیں منافق ہو گئیں
پیکرِ معصومیت تصویرِ قاتل ہے یہاں

کون دیکھے خواب کس کو سر نہیں اپنا عزیز
خواب بھی شرمندۂ تعبیرِ قاتل ہے یہاں

بے نیازِ سرد و گرم و کامیابِ رزم و بزم
خندہ زن تقدیر پر تدبیرِ قاتل ہے یہاں

نوکِ خنجر نے لکھی ہیں سب کی تقدیریں مگر
خود نوشتہ صرف اک تقدیرِ قاتل ہے یہاں

خلوتیں برباد لیکن محفلیں آباد ہیں
باعثِ تخریبِ دل، تعمیرِ قاتل ہے یہاں

کوچۂ قاتل میں وضعِ بندگی ہے کافری
اصلِ ایماں جرأتِ تکفیرِ قاتل ہے یہاں

یہ قلمرو منصفِ خنجر بکف کی ہے شمیمؔ
معتبر کچھ ہے تو وہ تحریرِ قاتل ہے یہاں

□□

شمیم کرہانی

ڈاکٹر فضل الٰہی مخمور دہلوی کی طرح جناب شمیم کرہانی بھی اپنی خوبصورت غزلوں اور دردانگیز ترنم کی وجہ سے ہندوستان گیر شہرت کے مالک اور سامعین کے پسندیدہ شاعر تھے، ہر جگہ عزت و احترام سے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے اور مشاعروں کی کامیابی کے ضامن سمجھے جاتے تھے۔

سیّد شمس الدین حیدر شمیم کرہانی ۱۸ رجون ۱۹۱۳ء کو موضع پارہ ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد محمد اختر صاحب مرحوم شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔ خاندان کے کچھ بزرگ باقاعدہ شاعری کرتے تھے اس لیے ادبی اور شاعرانہ ماحول میں پرورش پائی۔ ابتدائے شاعری میں کچھ نظمیں اور غزلیں علامہ آرزو لکھنوی کو دکھائیں۔ لیکن علامہ نے یہ کہہ کر اس سلسلے کو منقطع کر دیا کہ "ان کی فکر ایک بحرِ رواں ہے یہ آپ اپنی راہ نکال لیں گے"۔ علامہ آرزو لکھنوی کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور شمیم صاحب اپنے دور کے نظم و غزل کے معتبر و مستند شاعر تسلیم کیے جانے لگے۔

شمیم کرہانی نے مولوی، کامل اور منشی کے امتحانات پاس کر کے علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ اعظم گڑھ کے ڈی۔ اے۔ وی کالج میں اردو، فارسی کے معلم کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۵۰ء میں شمالی ہند کی قدیم ترین و تاریخ ساز

تعلیمی ادارے اور دہلی کے مشہور اینگلو عربک اسکول کے تدریسی عملے میں شامل ہو گئے اور تا دمِ آخر یعنی ۱۹ر مارچ ۱۹۷۵ء تک اسی ادارے سے وابستہ رہے۔

شمیم صاحب کی حیات ہی میں ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو کر اردو دنیا میں مقبول ہو چکے تھے۔ لیکن ان میں سے بیشتر مجموعے اب دستیاب نہیں ہیں۔

(الف) شاعری: (۱) برق و باراں (نظموں کا پہلا مجموعہ: ۱۹۳۹ء)، (۲) ترانے (گیتوں کا مجموعہ: ۱۹۴۴ء)، (۳) روشن اندھیرا (۱۹۴۲ء کی 'ہندوستان چھوڑو تحریک' سے متعلق نظموں کا مجموعہ: ۱۹۴۶ء)، (۴) تعمیرِ نو (قومی نظموں کا مختصر مجموعہ: ۱۹۴۸ء)، (۵) بڑھ چل رے ہندوستان (قومی نظموں پر مشتمل کتابچہ: ۱۹۴۸ء)، (۶) عکسِ گل (غزلیں رنظمیں: ۱۹۶۲ء، اشاعتِ ثانی: یو پی اردو اکادمی، ۱۹۸۴ء) (۷) انتخاب کلام شمیم کرہانی (انجمن ترقی اردو ہند: علی گڑھ: ۱۹۶۳ء، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء)، (۸) ذوالفقار (مسدّس) ۱۹۶۴ء، (۹) ''حرفِ نیم شب'' (دیوانِ غزلیات: ۱۹۷۲ء)، (۱۰) جانِ برادر (پروفیسر احتشام حسین کی رحلت پر طویل نظم: ۱۹۷۳ء)، (۱۱) صبحِ فاراں (حضرت محمد ﷺ کی سیرتِ پاک نیز مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل سے متعلق مسدّس: ۱۹۷۴ء)، (۱۲) میں بوترابی (نعت، سلام، منقبت، قصائد اور نظموں کا مختصر مجموعہ: ۱۹۷۴ء)، (۱۳) کلیدِ انشا (اردو گرامر سے متعلق کتاب)، (۱۴) پشپ چھایا (ہندی رسمِ خط میں ''عکسِ گل'' کی نظموں/غزلوں کا انتخاب)۔

(ب) منظوم تراجم: (۱) ''رنگا کے گیت'' (بچوں کے لیے انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ) (۲) ''رنگا کے اور گیت'' (ایضاً) مئی ۱۹۶۵ء، ناشر: پبلی کیشنز ڈویژن، وزارتِ اطلاعات ونشریات، حکومتِ ہند۔

نمونۂ کلام:

غزل

فاصلہ تو ہے مگر کوئی فاصلہ نہیں
مجھ سے تم جدا سہی دل سے تم جدا نہیں

کاروانِ آرزو اس طرف نہ رُخ کرے
ان کی رہ گزر ہے دل عام راستہ نہیں

آیئے چراغِ دل آج ہی جلائیں ہم
کیسی کل ہوا چلے کوئی جانتا نہیں

اک شکستِ آئینہ بن گئی ہے سانحہ
ٹوٹ جائے دل اگر کوئی حادثہ نہیں

کس لیے شمیمؔ سے اتنی بدگمانیاں
مل کے دیکھیے کبھی آدمی برا نہیں

○

جام چلنے لگے، دل مچلنے لگے، انجمن جھوم اٹھی، بزم لہرا گئی
بعدِ مدت جو محفل میں تم آ گئے جیسے بیجان قالب میں جان آ گئی

وہ ہیں ساقی تو پھر ہم کو بادہ کشو، کیا چمن کی ہوس؟ کیا بہاروں کا غم
ان کی رنگیں نظر جس طرف اٹھ گئی، پھول بکھرا گئی رنگ برسا گئی

وعدے ہوتے رہے، عہد ہوتے رہے، ان کو آنا نہ تھا وہ نہ آئے کبھی
یاد ان کی مگر آ کے ہر شامِ غم، مجھ کو سمجھا گئی دل کو بہلا گئی

ایک ہی صحنِ گل، ایک ہی انجمن، کوئی درد آشنا، کوئی نا آشنا
سُن کے رودادِ غم عشق برباد کی، روئی شبنم تو گل کو ہنسی آ گئی

شوق پینے کا ایسا زیادہ نہ تھا، ترکِ توبہ کا کوئی ارادہ نہ تھا
پر گھٹاؤں نے کچھ اٹھ کے بہکا دیا، کچھ طبیعت بھی کم بخت للچا گئی

حسن جتنا ڈھکا اور دلکش ہوا ، رنگ جتنا چھپا اور رنگیں ہوا
پھوٹ نکلی شفق بن کے رخسار سے، وہ ادائے تبسم جو شرما گئی
رنگ خوشبو صبا، چاند تارے کرن، پھول شبنم شفق، آبجو چاندنی
ان کی دلکش جوانی کی تکمیل میں، حسن فطرت کی ہر چیز کام آ گئی
زندگی بھی شمیم اک چمن ہے مگر اس چمن کی بہار و خزاں کچھ نہیں
وہ نہ آئیں تو سمجھو خزاں کے ہیں دن، وہ جو آ جائیں سمجھو بہار آ گئی

○

آدابِ جنوں مانگے ، آئینِ وفا مانگے
کیا دل ہے کہ اک دنیا، دنیا سے جدا مانگے
بے دستِ جنوں شاید ملتی نہیں رعنائی
پھولوں نے بھی کانٹوں سے کچھ آبلہ پا مانگے
ہے رات کا آنچل بھی پھولوں میں بسا لیکن
روٹھی ہوئی نیند اپنی، دامن کی ہوا مانگے
جس دور کا منشا ہو پیاسوں کو نہ مے دینا
پھر تشنہ لبی میری اُس دور سے کیا مانگے
دنیا کے اُجالوں نے لوٹا ہے شمیم ایسا
دل بزمِ چراغاں میں ، آندھی کی دُعا مانگے

○

جشنِ حیات ہو چکا ، جشنِ ممات اور ہے
ایک برات آ چکی، ایک برات اور ہے
عشق کی اک زبان پر، لاکھ طرح کی بندشیں
آپ تو جو کہیں بجا، آپ کی بات اور ہے

پینے کو اس جہان میں، کون سی مے نہیں مگر
عشق جو بانٹتا ہے وہ آبِ حیات اور ہے
ظلمتِ وقت سے کہو، حسرتِ دل نکال لے
ظلمتِ وقت کے لیے آج کی رات اور ہے
اُن کو شمیم کس طرح نامۂ آرزو لکھیں
لکھنے کی بات اور ہے، کہنے کی بات اور ہے

○

بھٹک رہی ہے نظاروں میں ہر نظر تنہا
پڑا ہے جلوہ گہِ دل میں جلوہ گر تنہا
غمِ حیات ہی ٹھہرا تھا غمگسارِ حیات
شریکِ راہ رہی گردِ رہ گزر تنہا
سنائیں قصۂ آشوبِ دردِ تنہائی
کبھی جو تم سے ملاقات ہو، مگر تنہا
ہزار دیدہ وروں کے چراغِ دیدہ وری
بجھا گئی نگہِ شخصِ کم نظر تنہا
نہ پرسشِ غمِ دوراں نہ شرکتِ غمِ دل
ملا ہجومِ بشر میں بھی ہر بشر تنہا
اب اپنے ساتھ ہجومِ غمِ زمانہ ہے
چلے تھے جب تو غمِ دل تھا ہم سفر تنہا
کسی میں طاقتِ پرواز ہو تو دیکھ سکے
کہاں پڑا ہے شمیمِ شکستہ پر تنہا

○

ملتے ہیں کہاں خود کو ہم بیخودِ غم تنہا
ہم سے بھی ملا دینا، مل جائیں جو ہم تنہا

اُس آگ کا ایک شعلہ، دُنیا کے لیے کافی
اک عمر سے جلتے ہیں، جس آگ میں ہم تنہا
اے گردشِ دوراں تو اُس وقت کی ساتھی ہے
جب ہم نے زمانے میں، رکھاؔ تھا قدم تنہا
احساسِ انا کیا ہے، احساسِ وجود اپنا
ہم کو نہ چھڑا ہم سے، رہ جائیں گے ہم تنہا
ساقی ہے نہ صہبا ہے، کیا دور شمیم آیا
میخانے میں بیٹھے ہیں، با دیدۂ نم تنہا

□□

شنکر لال شنکر

دہلی کلاتھ ملز کے مالک، اپنے وقت کے ممتاز صنعت کار اور برطانوی سرکار سے ''سر'' کا خطاب پانے والے شنکر لال شنکر خالص اردو تہذیب کے پروردہ تھے۔ اردو تہذیب و تمدن کے جلو میں آنکھیں کھولنے اور پرورش پانے کی وجہ سے شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ رئیسانہ ماحول میں وقت کے ساتھ یہ شوقِ شعر گوئی تبدیل ہو گیا۔ اسی گھرانے کے مُرلی دھر شاد بھی شاعر تھے۔ شنکر و شاد حضرت بیخود دہلوی کے شاگرد تھے۔ حضرتِ بیخود دہلوی ان دونوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔

مُرلی دھر شاد کا ۱۹۵۰ء میں ایک ہوائی حادثے میں انتقال ہو گیا اور ان کے وارثین کی غیر معمولی تجارتی و کاروباری مصروفیات کی وجہ سے ان کا کلام بھی محفوظ نہیں رہ سکا، لیکن شنکر لال شنکر کو ساحر ہوشیارپوری کی شکل میں ایک ایسا نیاز مند دوست مل گیا تھا جس نے ان کے منتشر کلام کو نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ ان کے انتقال کے بعد ''دیر و حرم'' کے عنوان سے مجموعے کی شکل میں شائع بھی کرایا۔

شنکر لال شنکر کے انتقال کے بعد ان کے وارثین اور دہلی کلاتھ ملز کے اعلیٰ منتظمین نے آنجہانی شنکر و شاد کی یاد میں ایک سالانہ مشاعرہ کی طرح ڈالی جو چند ہی سالوں میں برِصغیر ہندوستان و پاکستان کا ایک بڑا اور نمائندہ مشاعرہ بن گیا۔ شنکر و شاد کا یہ سالانہ

مشاعرہ تقریباً پچیس تیس سال تک باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہوتا رہا لیکن وقت کے ساتھ اس گھرانے کی نئی نسل کی شعر و ادب سے عدم دلچسپی اور اردو سے ناواقفیت کی نذر ہو گیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

بے وفا کہہ کے سرِ بزم مجھے یاد کیا
سوچیے، سوچیے، کیا آپ نے ارشاد کیا

چپ چپاتا کوئی کترا کے چلا تھا مجھ سے
درد نے اُٹھ کے مجھے مائلِ فریاد کیا

آپ کی باتیں ہیں سب میری سمجھ سے باہر
کیوں مجھے شاد کیا غیر کو ناشاد کیا

ان کا کیا شکوہ، گلہ ہے تو مقدر سے مجھے
ان کو ارشاد جو کرنا تھا وہ ارشاد کیا

ہچکیاں نزع میں تڑپائے چلی جاتی ہیں
کس برے وقت میں ظالم نے مجھے یاد کیا

پے بہ پے بھیج کے قاصد جو مجھے بلوایا
کیا ستم کوئی نیا آپ نے ایجاد کیا؟

یہ نیا ظلم ہے، جانے بھی نہیں دیتے مجھے
ابھی محفل سے اٹھایا تھا ابھی یاد کیا

آ گئے روٹھ کے اُس شوخ سے جب تم شنکر
لوگ کہتے ہیں تمھیں اُس نے بہت یاد کیا

○

زمانے سے نرالے ہیں، نرالا کام کرتے ہیں
سوالِ وصل سن کر ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

مری جانب اشارہ کرکے وہ کہتے ہیں غیروں سے
ذرا صورت تو ان کی دیکھیے یہ ہم پہ مرتے ہیں
بہانہ ڈھونڈتے ہیں کیا خبر وہ کب بگڑ بیٹھیں
اُنھیں ہم چھیڑ تو دیں لیکن اِس آفت سے ڈرتے ہیں
تعجب کیا ہے گر شیرازۂ عالم پریشاں ہو
کسی کی زُلف کے بال آج شانوں پر بکھرتے ہیں
چھپاؤ لاکھ تم اپنے کو ہم سے چھپ نہیں سکتے
ہم اپنا دل، تصور سے تمھارے، شاد کرتے ہیں
تمھیں ہے خوفِ رُسوائی ہمارا دم نکلتا ہے
جو ملنا ہے تو مل جاؤ کہ ہم جی سے گزرتے ہیں
بلا تقصیر ہو جاتے ہیں وہ مجھ سے خفا شنکر
رقیبِ روسیہ جا جا کے اُن کے کان بھرتے ہیں

○

کہنے تو گئے تھے حال اپنا، ہم عرضِ تمنّا بھول گئے
جلووں میں کچھ ایسے کھوئے گئے ہم دل کا تقاضا بھول گئے
ہونٹوں پہ تبسّم لہرایا، آنکھوں میں اُمڈ آئے آنسو
کیا جانے انھیں کیا یاد آیا، معلوم نہیں کیا بھول گئے
جب تم نے ہی منہ پھیر لیا دل ٹوٹ گیا جی چھوٹ گیا
پھر ہوش میں رہ کر کیا کرتے، ہم دین و دنیا بھول گئے
وعدوں پہ یقیں کیوں ہم نے کیا کیوں سازِ تمنا چھیڑ دیا
سچ یہ ہے کہ تھی اپنی ہی خطا، اے جانِ تمنّا بھول گئے
پھرتا ہے نگاہوں میں وہ سماں لیکن وہ ہجومِ شوق کہاں
وہ عہدِ نشاط و سرشاری اک خواب تھا گویا بھول گئے
ہستی ہے سراپا غم شنکر اور غم ہی رازِ ہستی ہے
اللہ رے ہماری بے خبری کیا یاد رہا کیا بھول گئے

○

نہ پوچھو شبِ غم کا تم حال مجھ سے، نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سن سکو گے
خدا کی قسم دل پہ گزرے جو صدمے نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سن سکو گے
کہوں تم سے کیا زاہد و رازِ الفت یہ ہے درحقیقت وہ سرِّ حقیقت
نہیں جس سے واقف تمھارے فرشتے، نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سن سکو گے
زمانہ جدائی کا اس طرح گزرا کہ آٹھوں پہر موت کا سامنا تھا
وہ قصے وہ دُکھڑے گلے اور شکوے نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے
وہ دُکھ درد دل کا وہ فرقت کا قصہ، میں قربان، تم مان لو میرا کہنا
نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے، نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے
عیاں میری صورت سے ہے صاف شنکر تمھیں خود خبر ہے جو ہیں میرے ارماں
زباں سے مگر اپنے دل کے ارادے نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سُن سکو گے

شہاب جعفری

عام طور پر شاعروں کی دلچسپی شعر کہنے، شعر سنانے تک محدود رہتی ہے اور مشاعرے اُن کی تمام تر سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور ہوتے ہیں۔ شہاب جعفری بھی بنیادی طور پر ایک شاعر تھے لیکن اُن کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں عام شاعروں سے یکسر مختلف تھیں۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ڈرامہ ٹسٹ بھی تھے اور فلمی دنیا کے کیری ایکٹر بھی۔ اور ان کی زندگی ان ہی دلچسپیوں سے عبارت تھی۔

شہاب جعفری ۷ رجولائی ۱۹۳۰ء کو بنارس کے قصبہ ڈلئی میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کر کے تروپتی (جنوبی ہند) کے ایک اسکول سے تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد دہلی کے خالصہ کالج کے شعبۂ اردو میں آ گئے اور پھر یہاں کی ادبی وثقافتی زندگی کا ایک حصہ بن کر رہ گئے۔ مختلف النوع دلچسپیوں کی وجہ سے شہاب جعفری اپنی شاعری کے ساتھ پورا حق ادا نہ کر سکے یہی وجہ ہے کہ "سورج کا شہر" کے بعد اُن کا کوئی دوسرا شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آ سکا۔

شہاب جعفری نے یکم فروری ۲۰۰۰ء کو دہلی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

نمونۂ کلام:

غزل

لُٹنے والو دلِ برباد کی توقیر نہ جائے
گھر چلا جائے مگر حسرتِ تعمیر نہ جائے

شہرِ نو قلعہ دل کیسا کھنڈر ہے کہ جہاں
کوئی سیاح نہ آئے کوئی رہگیر نہ جائے

میں تو خود خوابوں کو تعبیر سے کردوں محروم
خواب ایسے ہیں کہ جن سے غمِ تعبیر نہ جائے

شہر سے قافلے لوٹے ہیں یہ کہتے سوِ دشت
اس خرابے میں کوئی صاحبِ توقیر نہ جائے

جانے کس شعلے سے گوندھی گئی مٹی میری
آندھیاں چلتی رہیں خاک کی تنویر نہ جائے

○

مجھ کو تو پہلے کا سب سچ ، ناٹک جیسا لگتا ہے
تم کو اور کسی آغوش میں ، اکثر کیسا لگتا ہے

ہم کتنے سچے تھے، سچ کی لاج میں جھوٹ بھی کہہ جاتے
سچ کہنا، اُسی جھوٹ کی سوگند، اب کیا سچا لگتا ہے

مدّت بعد نگاہ ملی، دو اکتارے جھنکار اٹھے
دوستانے چپ چپ پوچھیں، اب تو مرا کیا لگتا ہے؟

ہاتھ دھندلکوں سے مت لہرا، بندھن کی پتوار سنبھال
جنموں کے پاتال کے مانجھی، گھاٹ تو ڈوبا لگتا ہے

باتیں بہت تھیں، اتنے دنوں میں چیخ بنیں یا چپ کی چٹان!
اب جاؤ یہ سُنسانا، پھر، چیخا چیخا لگتا ہے

تیرا، بُرا چاہیں پھر رو دیں، جی کو تو کیا تسکین ملے
تم سُکھ، ہم دُکھ، بٹ گیا سب کچھ، سب کچھ انوکھا لگتا ہے
کچھ سنسان سا شور سنا؟ ہاں سپنے سب محفوظ ہیں نا؟
ہاتھ اِن آنکھوں پر رہنے دو، شور اب اچھا لگتا ہے
ہر انجان سے اپنا پا، کون انجان اُس کا اپنا تھا
خود ہی شہابؔ سے مل دیکھو نا! پگلایا سا لگتا ہے

○

گُلِ نو کے ہاتھ سے دم بہ دم جو صبا نکلتی چلی گئی
تو چمن چمن تھی وہ تشنگی کہ بہار جلتی چلی گئی
میں مسافرِ رہِ درد تھا ہر امید دستِ سوال تھی
یہ حیات موجِ سراب تھی مرے ساتھ چلتی چلی گئی
تری یادِ گلشنِ خواب تھی کہ مری نواؤں کے دشت میں
یہ بہار شمعِ خیال تھی سرِ شاخ جلتی چلی گئی
تری آرزو تو نہ تھی مگر تو کہاں ہے میرے نگار سُن
تیری جستجو کے بغیر بھی رہِ دل بدلتی چلی گئی
ترے گیسوؤں کی کہانیاں جو سُنیں تو نیند سی آ چلی
سفرِ حیات میں سخت تھی مری رات ڈھلتی چلی گئی
نظر آئی منزلِ آرزو، تو ہر اک نشیب و فراز پر
یہ قدم بہکتے چلے گئے وہ نظر سنبھلتی چلی گئی

○

قیدِ امکاں سے تمنا تھی غمیں، چھوٹ گئی
پانو ہم نے جب اٹھایا تو زمیں چھوٹ گئی
لیے جاتا ہے خلاؤں میں جمالِ شب و روز
دن کہیں چھوٹ گیا، رات کہیں چھوٹ گئی

میرے سورج، میرے ہمدم، مری منزل تو بتا
تیرے آفاق تک آیا ہوں، زمیں چھوٹ گئی

اب کہاں کا ہوں مسافر مجھے معلوم نہیں
ہاں بس اتنا، تری چوکھٹ سے جبیں چھوٹ گئی

کیا غریب الوطنی سی ہے، غریب الوطنی
آسماں ساتھ چلا، گھر کی زمیں چھوٹ گئی

الجھے الجھے سے جو ہم پھرتے ہیں اب شہر بہ شہر
دلنوازی سی کوئی شے تھی، کہیں چھوٹ گئی

زندگی کیا تھی میں اک موج کے پیچھے تھا رواں
اور وہ موج کہ ساحل کے قریں چھوٹ گئی

گھر جو لوٹے بھی سرِ شام تو کچھ پاس نہ تھا
دن سے پرچھائیں ملی تھی سو کہیں چھوٹ گئی

بود و باش اپنی نہ پوچھو کہ اسی شہر میں ہم
سادگی گانو کی لائے تھے، یہیں چھوٹ گئی

○

ضربِ تیشہ کی صدا میں کیا اٹھا کر لے گئے
ٹوٹتے پتھر سے ہم صحرا اٹھا کر لے گئے

بیخودی کو جانتے کیا ہم خودی خوانِ جنوں
قطرے کی تمہید میں دریا اٹھا کر لے گئے

پانو جب سمٹے تو رستے بھی ہوئے تکیہ نشیں
بوریا جب تہہ کیا دنیا اٹھا کر لے گئے

ہر جگہ جاں کو یہی دھڑکا کہ لٹ جائیں نہ ہم
ہم تو ہر دھرتی سے گھر اپنا اٹھا کر لے گئے

اس سفر میں ساتھ کون آتا، صدا تو سب کو دی
زندگی کا بوجھ تھا، تنہا اٹھا کر لے گئے

ہیں، پر اتنے بھی نہیں شائستۂ تشنہ لبی
ہم سے گر شبنم چھنی، دریا اٹھا کر لے گئے

سر بلند اپنا لہو تھا، سرنگوں قاتل کی تیغ
ہم ہتھیلی پر جو سر اپنا اٹھا کر لے گئے

ہم تری آواز کے رسیا، بہ درگاہِ جنوں
شعلۂ حرف و صدا لپکا، اٹھا کر لے گئے

دشت در دشت اک صدائے باز گشت اپنی شہابؔ
سارے پتھر اپنا سناٹا اٹھا کر لے گئے

○

ہمدردیاں تو دردِ نہاں کی دوا نہیں
اے غم گسار تجھ پہ کبھی غم پڑا نہیں

اس نے وفا نہ کی تو بری بات کیا ہوئی
مجبوریاں بھی ہوں گی وہ دل کا بُرا نہیں

یونہی کہا تھا رنگِ زمانہ کو دیکھ کر
ورنہ خدا نخواستہ تم بے وفا نہیں

غم کو نباہ لو تو بڑی چیز ہے شہابؔ
غم زندگی کے حق میں کچھ ایسا بُرا نہیں

□□

شہباز ندیم ضیائی

انیس سو ستر کے آس پاس دہلی کے شعری منظر نامے پر ابھرنے والے شاعروں میں شہباز ندیم ضیائی نے اپنے لب و لہجے کی تازگی اور توانائی سے نہ صرف اپنے وجود کا احساس کرایا ہے بلکہ متاثر بھی کیا ہے۔

شہباز کا خاندانی نام محمد فاروق انصاری ہے۔ یہ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صوفی رحمت اللہ صاحب انصاری نقشبندی مرحوم سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے اور نہایت دیندار انسان تھے۔ ایک زمانے میں ان کا بک بائنڈنگ کا کاروبار بہت وسیع پیانے پر پھیلا ہوا تھا اور ان کا دہلی کے مشہور بک بائنڈرز میں شمار ہوتا تھا۔ شہباز اپنے اسی خاندانی کاروبار میں مصروف ہیں۔

ان کے یہاں ہمہ وقت ادبی و غیر ادبی رسالوں اور کتابوں کا چرچا رہتا تھا لیکن شعر و ادب کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ جلد سازی کے لیے آئے ہوئے نیم ادبی رسالے و کتابیں پڑھ کر شہباز کے یہاں شاعری کا انکور پھوٹا اور ہر ماہ جلد سازی کے لیے آنے والے شمع جیسے کثیر الاشاعت ماہنامے میں چھپنے والی نظموں اور غزلوں نے مہمیز کا کام کیا۔ خدا نے تخلیقی ذہن اور موزوں طبیعت ودیعت کی تھی اور اس پر ضیا خورجوی کی تربیت اور شعری صلاح و مشوروں نے محمد فاروق انصاری کو شہباز ندیم ضیائی بنا دیا۔ جناب ضیا خورجوی کے انتقال

کے بعد شہبازؔ نے مطالعہ اور مشقِ سخن سے اپنی تربیت خود کی۔

شہبازؔ ندیم ضیائی گرچہ کم گو ہیں لیکن دہلی کے ادبی منظرنامے پر کافی متحرک اور فعال ہیں۔ متعدد ادبی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ سیدھے سادے تحت میں پڑھتے ہیں اس لیے مشاعروں کی بہ نسبت شعری نشستوں میں زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔

پہلا شعری مجموعہ ''جذبوں کی زبان'' جو غزلیات پر مشتمل تھا ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا اس مجموعے کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ ''شہباز'' (۱۹۹۵ء)، ''وصالِ موسم'' (۱۹۹۷ء، کراچی) اور ''اک چراغ تنہا سا'' (۲۰۰۳ء) شہبازؔ ندیم کے دوسرے شعری مجموعے ہیں۔ شہبازؔ ایک غزل گو شاعر ہیں اور غزل ہی ان کی پہچان ہے لیکن انھوں نے خوبصورت اور متاثر کن نعتیں بھی کہی ہیں۔ ''معجزہ'' (۲۰۰۱ء) شہباز کی تڑپا دینے والی نعتوں کا مجموعہ ہے جسے اردو اکادمی، دہلی نے انعام سے نوازا ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

جمالِ حسنِ مکمل کا سلسلہ ہے کہ تو
یہ میرے سامنے کیا شے ہے آئنہ ہے کہ تو

مرا کمالِ نظر ہے کہ تیرا پیکرِ نور
مرا یقین ہے یا میرا واہمہ ہے کہ تو

ہزار چاہا، مگر انکشاف ہو نہ سکا
کوئی غزل ہے کہ شہکار، فلسفہ ہے کہ تو

یہ حسنِ نقش و نگارِ بدن یہ زیبائش
کمالِ دستِ مصور کا سلسلہ ہے کہ تو

مرے سخن کی عبارت ہے یا ترا چہرہ
مری غزل کا کوئی تازہ قافیہ ہے کہ تو

جو میرے سامنے بیٹھی ہے خود میں کھوئی ہوئی
یہ فلسفی ہے مصور ہے شاعرہ ہے کہ تو

حصارِ دیدۂ جاناں میں مثلِ نورِ ندیمؔ
طلسمِ عکس ہے، افسونِ آئنہ ہے کہ تو

○

تیرہ فضا میں روشن جگنو کتنی دیر
یعنی! میرے پیشِ نظر تو کتنی دیر
دل میں ارمانوں کا جادو کتنی دیر
وُسعتِ صحرا، جستِ آہو کتنی دیر
کتنی دیر قیامِ فصلِ گل آخر
صحنِ چمن میں تازہ خوشبو کتنی دیر
کتنی دیر تسلسل ٹھنڈے سایوں کا
بکھریں گے شانوں پہ گیسو کتنی دیر
کتنی دیر ہواؤں میں موسیقیت
شاخوں پر پتّوں کے گھنگرو کتنی دیر
کتنی دیر خموشی تیرے ہونٹوں پر
یعنی! شخصیّت کا جادو کتنی دیر
کتنی دیر خلا کی ہمسفری شہبازؔ
دوشِ ہوا پر پنکھ پکھیرو کتنی دیر

○

پھر وہی فُغاں پیہم پھر وہی کراہیں لکھ
ہمدمِ شبِ غم ہیں خونچکاں نگاہیں لکھ
لکھ کہ شوخ ہونٹوں پر آہ کا تسلسل ہے
فرقتوں کے موسم سے کس طرح نباہیں لکھ

لکھ کہ اب ہواؤں میں خوشبوئیں نہیں ہوتیں
بند ہوگئیں گویا گلستاں کی راہیں لکھ
لکھ کہ جسم کے اندر خاک اُڑ رہی ہے یار
کس کو راس آئی ہیں عشق کی پناہیں لکھ
لکھ کہ آسمانوں کو ہم نے جھکتے دیکھا ہے
آج بھی نظر میں ہیں سرنگوں کلاہیں لکھ
لکھ کہ اب کوئی مہتاب اس طرف نہیں آتا
آنسوؤں سے روشن ہیں آج کل نگاہیں لکھ
لکھ کہ اب زمانے کی گردشوں سے کیا ڈرنا
حسن کو میسّر ہیں عشق کی پناہیں لکھ
لکھ کہ اب کوئی درویش اس طرف نہیں آتا
مدّتوں سے ویراں ہیں ساری خانقاہیں لکھ
لکھ کہ اک زمانے سے جاگتا ہوں میں شہباز
بند کیوں ہوئیں آخر مجھ پہ خواب گاہیں لکھ

○

یہ مرا طرزِ بیاں یہ نگارشیں اور میں
غزل کے پردے میں بے پردہ خواہشیں اور میں
حسین رُت، نئے موسم کی نسبتیں اور تو
ہر ایک لمحہ جنوں کی نوازشیں اور میں
حیا سے خود میں سمٹنے کی عادتیں اور تو
نفس نفس تجھے پانے کی کوششیں اور میں
جمالِ مہرِ محبت کی شدّتیں اور تو
چراغِ حسنِ تمنا کی تابشیں اور میں

تری نگاہ کی پیہم شرارتیں اور تو
ہر ایک لمحہ تحمل کی کوششیں اور میں
مسرتوں کی مسلسل رفاقتیں اور تو
قدم قدم پہ زمانے کی رنجشیں اور میں
حیات کی طرب انگیز ساعتیں اور تو
زمانہ ساز دماغوں کی سازشیں اور میں
فضائے صحنِ چمن، پھول، نکہتیں اور تو
اداس راہ، سفر سخت، گردشیں اور میں
یہ تیرے خوابوں کی شہباز جھلکیں اور تو
یہ میرے سینے میں بے چین خواہشیں اور میں

○

دور نظروں سے ابھی حسنِ فلق ہے جاناں
پھر بھلا چہرۂ شب کس لیے فق ہے جاناں
ابھی انفاس کی رو میں ہے حرارت باقی
ابھی جذبات میں پہلی سی رمق ہے جاناں
میری آنکھوں میں ہے روشن تری آنکھوں کی چمک
میرے رُخ پر ترے چہرے کی شفق ہے جاناں
تیرا سرمایۂ احساس امانت میری
میری میراثِ تمنا ترا حق ہے جاناں
زلفِ شب تاب ہے یا طولِ شبِ غم کا جواب
رنگِ رخسار ہے یا حسنِ شفق ہے جاناں
تجھ میں مہکا ہے مری پاک محبت کا چمن
تیری خوشبوئے بدن پر مرا حق ہے جاناں

کون سا صدمہ اٹھایا ہے بچھڑ کر مجھ سے
رنگِ رخسار بھلا کس لیے فق ہے جاناں

سہل مت جان! کہ ہم اہلِ وفا جانتے ہیں
مرحلہ عشق کا کس درجہ ادق ہے جاناں

○

روشن ہے ذہن میں کبھی حدِ نظر میں ہے
یہ کون میرے ساتھ مسلسل سفر میں ہے

پل پل ہے خوشبوؤں سے معطر مشامِ جاں
آخر مرا خیال یہ کس کے اثر میں ہے

سوچوں تو دور تک ہے تسلسل بہار کا
دیکھوں تو تیرا پیکرِ تازہ نظر میں ہے

تیرا ہی روپ جلوۂ شب سے ہے آشکار
تیرا ہی عکسِ حسن، جمالِ سحر میں ہے

میرا علاجِ غم نہیں پیمانۂ شراب
میرا علاجِ غم نگہِ چارہ گر میں ہے

پتھر پہ کی نگاہ تو آئینہ کردیا
کیسا طلسم دیدۂ آئینہ گر میں ہے

آخر پسندِ خاطرِ احباب کیوں نہ ہو
میری غزل ندیؔم، زمینِ جگر میں ہے

حیراں ہوں بیخودی میں ہی رہتا ہے آج کل
شہبازؔ کس طلسمِ نظر کے اثر میں ہے

□□

شہپر رسول

مشاعروں کے حوالوں سے شاعروں کو جاننے اور پہچاننے والے شعر فہم سامعین کے لیے تو شہپر رسول کا نام نیا اور اجنبی ہوسکتا ہے لیکن معیاری اور ادبی رسائل کے حوالے سے سنجیدہ ادب کے قارئین کے لیے شہپر رسول کا نام اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ شہپر رسول ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے ادبی رسائل و جرائد کے ذریعہ اردو کے ادبی منظر نامے پر اپنے وجود کا احساس کرایا ہے اور اپنے لہجے کی تر و تازگی، شگفتگی اور انفرادیت سے متاثر کیا ہے۔

شہپر رسول (خاندانی نام چودھری وجیہ الدین) ۱۷ را کتوبر ۱۹۵۶ء کو بچھرایوں میں چودھریوں کے ایک آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چودھری محمد رئیس الدین وارثی صاحب بچھرایوں اور اس کے قرب و جوار کی اہم شخصیتوں میں سے ہیں۔ شہپر رسول نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ''اردو غزل میں پیکر تراشی'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور آج کل جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ریڈر شعبۂ اردو ہیں۔

''صدف سمندر'' اور ''سخن سراب'' شہپر رسول کے شعری مجموعوں کے نام ہیں جو ۱۹۸۸ء اور ۲۰۰۲ء میں منصۂ شہود پر آچکے۔ اس کے علاوہ ''پیمانۂ صفات'' اور ''چشمِ دوراں'' شہپر رسول کی نثری تصنیفات ہیں جو ۱۹۹۵ء اور ۲۰۰۲ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

نہ کوئی خواب، نہ ماضی ہی میرے حال کے پاس
کوئی کمال نہ ٹھہرا مرے زوال کے پاس

نہ میٹھے لفظ، نہ لہجہ ہی اندمال کے پاس
جواب کا گو گزر بھی نہیں سوال کے پاس

فراق و وصل کے معنی بدل کے رکھ دے گا
ترے خیال کا ہونا مرے خیال کے پاس

نہیں ہے کوئی بھی سرحد مرے جنوں آگے
جہانِ حسنِ جہاں ہے ترے جمال کے پاس

شکاریوں کی امیدیں سنورتی رہتی ہیں
طیور گھومتے پھرتے ہیں خوب جال کے پاس

تمھارے لفظ اُسے کھینچتے تو تھے شہپر
جنوب کیسے پہنچتا مگر شمال کے پاس

○

شجر بھر میں جو اک پتا ہرا سا دیکھتا ہے وہ
تو اس دنیا کے چہرے کو دوبارا دیکھتا ہے وہ

زمینِ خواب بھی، شہرِ اماں بھی، نیند رستہ بھی
مگر کس شوق سے دنیا کا نقشا دیکھتا ہے وہ

جو مجھ کو دیکھتا ہے وہ تو سپنے دیکھتا ہوں میں
میں اُس کو دیکھتا ہوں جب تماشا دیکھتا ہے وہ

سبھی حیران ہوتے ہیں مگر ایسے نہیں ہوتے
تو اپنے آئینے میں کس کا چہرا دیکھتا ہے وہ

کھلی آنکھیں تو خائف تھا کہ دنیا دیکھتی ہے سب
اور آنکھیں بند کرلی ہیں تو دنیا دیکھتا ہے وہ
میں رُک جاؤں تو رُک جائے، میں چلتا ہوں تو چلتا ہے
مرے رستہ کو کس منزل کا رستا دیکھتا ہے وہ

○

نہ اُٹھی آنکھ کسی لفظِ بے ضرر کی طرف
نہ سنگ آئے کبھی شاخِ بے ثمر کی طرف
مجھے بھی لمحۂ ہجرت نے کردیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے، قدم سفر کی طرف
اس ایک وہم میں چپ چپ ہیں سوکھتی شاخیں
طیور لوٹ نہ آئیں کہیں شجر کی طرف
یہ معجزہ ہے کہ سینے میں تیر بیٹھ گیا
اگرچہ اُس کا نشانہ تھا میرے سر کی طرف
کسی کو دیکھ کے خود پر یقین آیا تو
اُٹھی تو آنکھ کسی نقشِ بے ہنر کی طرف
چلی ہی آئی بالآخر کئی ارادوں سے
خبر، حصار لیے مجھ سے بے خبر کی طرف

○

پھر سے وہی حالات ہیں، امکاں بھی وہی ہے
ہم بھی ہیں وہی، مسئلۂ جاں بھی وہی ہے
کچھ بھی نہیں بدلا ہے یہاں کچھ نہیں بدلا
آنکھیں بھی وہی، خوابِ پریشاں بھی وہی ہے

یہ جال بھی اُس نے ہی بچھایا تھا، اسی نے
خوش خوش بھی وہی شخص تھا، حیراں بھی وہی ہے
اے وقت! کہیں اور نظر ڈال ، یہ کیا ہے
مدّت کے وہی ہاتھ، گریباں بھی وہی ہے
ہر تیر اُسی کا ہے ، ہر اک زخم اُسی کا
ہر زخم پہ انگشت بدنداں بھی وہی ہے
شہپر وہی بھولا ہوا قصّہ ، وہی پھر سے
اچھا ہے تری شان کے شایان بھی وہی ہے

○

حرفِ جاں دل میں نہاں، حرفِ زباں شہر میں تھا
آگ کا نام نہ تھا پھر بھی دھواں شہر میں تھا
شور صحرا کا سنا ، شور سمندر کا سنا
شور کا نام ہی تھا ، شور کہاں شہر میں تھا
بس ذرا عکس ہی اُبھرا تھا صفوں سے میرا
ایک ہنگامۂ کوتاہ قداں شہر میں تھا
آتش و قتل نہیں ، شور نہیں ، چیخ نہیں
صرف اور صرف دھواں، صرف دھواں شہر میں تھا
دیکھنا آنکھ نے کیا سیکھ لیا تھا صاحب
ایک دو چیز نہیں سارا جہاں شہر میں تھا
مستقر کس کو بناتے کہاں رہتے شہپر
گانو میں تھا تو کبھی سرِ رواں شہر میں تھا

○

خمارِ نطق نے اور لفظ کے سبو نے دیا
ترا سراغ مجھے تیری گفتگو نے دیا

طویل نیند کی راحت مجھے شجر نے دی
شجر کو پھولنا ، پھلنا مرے لہو نے دیا

اُسی کے عیب بنے میرے طرۂ دستار
امیرِ شہر کا رتبہ مجھے عدو نے دیا

زمانے بعد ترے نام پر میں یوں چونکا
جلا دیا ہو اندھیرے میں جیسے تو نے دِیا

کوئی صدا تری دوری نے، تیرے ہجر نے دی
کوئی پیام نگاہِ ستارہ جو نے دیا

دماغ و چشم بھی ، قلب و نظر بھی تھے ہم پر
مگر ثبات تو شہپر رگِ گلو نے دیا

□□

شہریار پرواز

شہریار خاں جو مشاعروں کی دنیا میں شہریار پرواز کے نام سے مشہور ہوئے حضرتِ ساغر نظامی کے برادرِ خورد تھے۔ ۱۷رمئی ۱۹۳۰ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور ۶رنومبر ۱۹۷۸ء کو مظفر نگر کے ایک مشاعرے میں انتقال ہوا۔

شہریار پرواز اچھے مترنم شاعر تھے اور مشاعروں میں جم کر پڑھتے تھے۔ شاعری میں ساغرؔ صاحب سے اصلاح لیتے تھے۔ بی۔ اے تک تعلیم پائی تھی۔ ابتداء میں آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں کے جریدے آواز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے بعد میں حکومتِ ہند کے پریس انفارمیشن بیورو میں اردو کے اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر ہو گئے تھے۔

شہریار پرواز ساغر نظامی ہی کی طرح خوش شکل اور خوش پوشاک تھے۔ تعلقات میں وہی رکھ رکھاؤ اور وضعداری تھی۔ افسوس شہریار پرواز جلد انتقال کر گئے اور ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔

نمونۂ کلام:

غزل

نہ خاکسار چلے اور نہ کج کلاہ چلے
چلے تو شان سے ہم سوئے قتل گاہ چلے

اب اور کوئی شہیدِ وفا اٹھے نہ اٹھے
ہم اپنی ذات سے رسمِ وفا نباہ چلے

کوئی تو ہم سفرِ منزلِ مراد بنے
جو صبح نور نہیں تو شب سیاہ چلے

کچھ ایسی راہ نکالو کہ اس اندھیرے میں
ہمارے ساتھ بھی وہ منتِ مہر و ماہ چلے

جبینِ شوق جھکانے کو حسن کے در پر
ہے کچھ تو بات کہ ہم ایسے کج کلاہ چلے

یہ میرا دل ہے ہدف اور بھی بناؤ اسے
نہیں جو تیر تو اب دشنہ نگاہ چلے

طلسمِ حسن و محبت کو بھی ثبات نہیں
جہاں تلک ہو حسینوں سے رسم و راہ چلے

قیود و بند کا اور مئے کشی کا ساتھ نہیں
چلے تو دور مئے و جام بے پناہ چلے

جو بندگانِ ہوس تھے وہ رک گئے پرواز
جو سرفروش تھے وہ سوئے قتل گاہ چلے

○

پھر اک جنوں کے لیے چل پڑے ہیں دیوانے
کدھر ہے منزلِ مقصود یہ خدا جانے
بہار آئے گی کب اور کب یہ دیوانے
اسی خیال میں جھوما کیے ہیں ویرانے
قیودِ دیر و حرم سے ہوئے جو بیگانے
نئے خدا و صنم ڈھال لیں گے دیوانے
حیات و مرگ ہیں جذب و جنوں کے افسانے
عدم کو پھاند نہ جائیں تمھارے دیوانے
تم اور جفا کے ارادے نہیں نہیں توبہ
جفا کے وہم مجھے آگئے تھے بہکانے
سحر تو سادہ و بے رنگ سی حقیقت ہے
اندھیری رات کے دل میں تھے لاکھ افسانے
وہ التفاتِ فراواں وہ نشۂ پیماں
تری نگاہِ خفی کاش ہم کو پہچانے
مئے دو شینہ کی گرمی ہنوز باقی ہے
ہیں چور چور کھنکتے ہیں پھر بھی پیمانے
جنوں پہ فاش ہے سرِ حیات اے پرواز
غریب عقل بھلا زندگی کو کیا جانے

○

سینۂ حسن پہ تیروں کا نشاں آج بھی ہے
عشق کے ہاتھ میں جذبوں کی کماں آج بھی ہے

کون کہتا ہے روایاتِ خمستاں نہ رہے
وہی مستی ہے وہی پیرِ مغاں آج بھی ہے
سینکڑوں بار جلی لاکھ جہنم پھوٹے
پھر بھی اپنی یہ زمیں رشکِ جناں آج بھی ہے
اپنی دنیا میں ہوا رقصِ جہنم سو بار
اس خرابات پہ جنت کا گماں آج بھی ہے
تیری پلکوں میں جو تھا سیلِ رواں خشک ہوا
میری آنکھوں میں وہی سیلِ رواں آج بھی ہے
نہ وہ آہن میں صلابت ہے نہ پتھر میں شرر
دل مرا کارگہِ شیشہ گراں آج بھی ہے
ہم نے سوچا تھا کہ آنسو کا بدل ہوگی ہنسی
زندگی سیلِ الم نذرِ فغاں آج بھی ہے
صبحِ حکمت کی شعاعوں کے اثر کے باوصف
رُخِ افکار پہ ظلمت کا دھواں آج بھی ہے
غرفۂ عرش میں ہے جلوہ فگن اب بھی رحیم
ظلم کے ہاتھ میں رحمت کی عناں آج بھی ہے
زندگی کاوشِ پیہم کا نشاں تھی کل بھی
زندگی کاوشِ پیہم کا نشاں آج بھی ہے
غمِ فردا سے ہے آزاد جنوں کی پرواز
عقل اسیرِ مرضِ سود و زیاں آج بھی ہے

○

کیا کہیں کیا شعار ہے اپنا
عاشقی روزگار ہے اپنا

مفت میں دل فروخت کرتے ہیں
بس یہی کاروبار ہے اپنا
اُس سے یوں دل کی بات کہتے ہیں
جیسے وہ غمگسار ہے اپنا
ان کی محفل میں چل دلِ وحشی
کچھ ابھی اعتبار ہے اپنا
خود نمائی نے آئینے سے کہا
خود بھی اب وہ شکار ہے اپنا
کشتۂ انتظار ہم ہی نہیں
ان کو بھی انتظار ہے اپنا
دل میں یادوں کے دیپ روشن ہیں
کیا چراغاں دیار ہے اپنا
ہم ہیں وہ کاروانِ تیز قدم
کہ زمانہ غبار ہے اپنا
کچھ نہ ہو حاصلِ جنوں پرواز
دامن تار تار ہے اپنا

○

اک نہیں میں ہی شہیدِ تلخیٔ گفتارِ دوست
سارا عالم ہے قتیلِ دشنۂ کردار دوست
جلوہ فرما وہ ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے حشر تک
کم ہوئی ہے اور نہ ہوگی حسرتِ دیدار دوست
عکسِ رخ سے میکدہ کا میکدہ گلنار ہے
سرخیٔ مے ہے کہ ہے گلگونیٔ رخسارِ دوست

طور کے مانند جلنے کو کلیجہ چاہیے
کوہ لاسکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

غنچے اس کے نغمۂ رفتار سے بنتے ہیں پھول
گل کھلاتی ہے چمن میں شوخیِ رفتار دوست

کل اگر موسیٰ نہ اس کی تابِ جلوہ لا سکے
آج بھی کس کو ہے تابِ جلوہ دیدارِ دوست

ساری تاریخ کرم اس کی جفاؤں پر نثار
کوئی میرے دل سے پوچھے لذتِ آزارِ دوست

ہاں یونہی چھلکا کرے پروازِ صبحِ حشر تک
رات کی خاموشیوں میں چشمۂ گفتار دوست

○

بجا ہے اب تو کرم میں کوئی کلام نہیں
نگاہِ خاص ہے مجھ پر نگاہِ عام نہیں

بجھے بجھے سے ہیں لیل و نہار کے فانوس
ضیائے مہر نہیں ہے مہ تمام نہیں

نہیں ہے جس میں ترے زلف و رُخ کی پرچھائیں
وہ صبح صبح نہیں ہے وہ شام شام نہیں

نہ ہم کو جرأتِ تحریرِ شوق ہے نہ انھیں
کسی طرف سے کوئی نامہ و پیام نہیں

وہ بات جو نگہ مبتلا نے کہہ ڈالی
وہ ایک بات ہی کیا حاصلِ کلام نہیں

ہیں لاکھ بند سلاسل کے بعد بھی آزاد
اسیرِ زلف ہیں تیرے اسیرِ دام نہیں

سنائیں کیسے دمِ نزع اپنا افسانہ
نفس تمام فسانہ ابھی تمام نہیں

تمام عالمِ تعمیر کانپ اٹھے گا
شکستِ دل ہے یہ ساقی شکستِ جام نہیں

نمود و نام کا احساس خام ہے پرواز
مرے کلام کا حاصل نمود و نام نہیں

□□

صادق ایم۔اے

سیّد صادق علی جو اردو شعر و ادب کی دنیا میں صرف صادق اور دہلی یونیورسٹی کی درس و تدریس کی دنیا میں پروفیسر ڈاکٹر صادق کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۰/اپریل ۱۹۴۳ء کو مدھیہ پردیش کے تاریخی شہر اُجین میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد درس و تدریس کے پیشے کو اپنایا اور اُجین کے ایک مقامی کالج سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بہتر سے بہتر کی تلاش دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لے آئی، جہاں آج کل صدرِ شعبہ ہیں۔

صادق ایک نظم گو شاعر ہونے کے ساتھ اچھے نثر نگار اور مترجم بھی ہیں۔ اب تک چار شعری مجموعے ''دستخط''، ''سلسلہ''، ''کشاد'' اور ''خواب جلنے کا منظر'' اور تحقیق و تنقید اور ہندی و مراٹھی شاعری پر نثر میں سات کتابیں بھی تصنیف کر چکے ہیں جن میں ''ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ''، ''ادب کے سروکار'' جیسی ادبی کتابوں کے علاوہ ''نئی مراٹھی شاعری''، ''نئی ہندی شاعری''، ''مالوے کی لوک کہانیاں''، ''کنیا دان''، ''کہیں نہیں وہیں'' شامل ہیں۔ صادق نے اردو کے علاوہ ہندی میں بھی کئی ادبی کتابیں تصنیف کی ہیں جن کو بھارتیہ گیان پیٹھ، ڈی اے وی پی جیسے مقتدر اداروں نے شائع کیا ہے۔

صادق ایک متحرک اور فعال شخصیت کے مالک ہیں۔ مقامی اور قومی سطح پر بہت سے ادبی و ثقافتی اداروں سے وابستہ ہیں۔ اردو اکادمی، دہلی کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

پھر سے لہو لہو در و دیوار دیکھ لے
جو بھی دکھائے وقت وہ ناچار دیکھ لے

اپنے گلے پہ چلتی چھری کا بھی دھیان رکھ
وہ تیز ہے یا کُند ذرا دھار دیکھ لے

پھر چھوٹنے سے پہلے ہی اپنے وجود کو
موجود بچپنوں میں گرفتار دیکھ لے

گھستا چلا ہے پیٹ میں ہر آدمی کا سر
تجھ سے بھی ہو سکے گا نہ انکار دیکھ لے

یوں روز روز کرتے ادا کاریاں، تری
صورت بدل گئی ہے مرے یار دیکھ لے

پڑھ سکو تو پڑھو

بزرگوں کی آنکھوں سے
کیوں دیکھتے ہو
بصارت بزرگوں کی کمزور ہے
بزرگوں کے پیروں سے
کیسے چلو گے
بزرگوں کے پیروں میں
دم خم نہیں ہے
بزرگوں کے ہاتھوں سے

کیا کام لو گے
بزرگوں کے ہاتھوں میں
رعشہ ہے
لیکن انھیں چوم لو
بزرگوں کے جو بول ہیں
تجربے اُن میں انمول ہیں

○

بزرگوں کی آنکھیں
تو شاہد ہیں
تم دیکھ سکتے ہو ان کو
مگر یہ بتاؤ
وہ کس طور دیکھو گے
جو اُن کا مشہود تھا؟
بزرگوں کے پاؤں
دباتے ہوئے
تم کو وہ فاصلے
کب نظر آئیں گے
جو یہ طے کر چکے ہیں
بزرگوں کے ہاتھوں کی
لرزش میں
اُس خون کا رزمیہ
اب بھی تحریر ہے
جو کبھی گرم و سرگرم تھا
رسمِ خطِ خون کا
پڑھ سکو تو پڑھو

بتاؤ

سُن سکتے ہو

اک سُر میں

کتنے سُر شامل ہیں

اِس لمحے؟

گِن سکتے ہو

اس لمحے میں

کتنے لمحے

بول رہے ہیں؟

کہہ سکتے ہو

بول میں آئے

لفظ کے معنی

صوت کے اندر ہیں

یا باہر؟

کر سکتے ہو

سُر سے سُر

لمحے سے لمحہ

لفظ سے معنی جُدا

بتاؤ؟

شروع کی تلاش میں

شروع کی تلاش میں
چلے تو ہر شروع
درمیاں لگا
درمیان سے گزر کے
ہم شروع کا شروع
ڈھونڈتے رہے

ہم سے قبل بھی ہزار سر پھرے
شروع کی تلاش میں
بھٹک بھٹک کے رہ گئے
بے کراں خلاء میں، پانیوں میں
ریگ زار میں

تم ہو کس قطار میں؟
ہم ہیں کس شمار میں؟

اوّل آخر: آخر اوّل

ہوا جب شور برپا
جنوری کے خیر مقدم کا
دسمبر
موت کے بستر پہ لیٹا
نزع کے عالم میں، تنہا

لے رہا تھا
آخری ہچکی
○
سنو لوگو!
گزشتہ رات، وہ بوڑھا
دسمبر
مر گیا ہے
لکڑیاں لاؤ
کہ اب اُس کی چتا کو
آگ دینا ہے
کہاں ہے اُس کا وارث
جنوری
لوگو! ذرا آواز تو دینا
○
دسمبر، بات کیا ہے
موت پر تیری
نہ کوئی دل دُکھا
نہ آنکھ کوئی ڈبڈبائی
کسی کو بھی کوئی صدمہ نہیں ہے
تیری رحلت پر
سبھی خوش ہیں
سواگت
جنوری کا کر رہے ہیں
○

دسمبر، ایک ققنس ہے
کہ جس کی راکھ سے ہر بار
پیدا جنوری ہوتا ہے
پھر وہ رفتہ رفتہ، بڑھتے بڑھتے
آخرش خود بھی
دسمبر بن ہی جاتا ہے کسی دن
...اور پھر، اک آگ
اُس کے راگ سے تولید پا کر
راکھ کر دیتی ہے اُس کا جسم سارا
جس سے پیدا جنوری ہوتا ہے
پھر وہ، رفتہ رفتہ، بڑھتے بڑھتے
آخرش اک دن
دسمبر بن ہی جاتا ہے

O

دسمبر
سال کی زنجیر کی انتم کڑی
پیوست جس میں جنوری
پہلی کڑی
پھر دوسری، پھر تیسری
کڑیاں ہی کڑیاں
ہم بدلتی دیکھتے ہیں

دیکھتے ہی دیکھتے
ہم خود بدل جاتے ہیں
کڑیاں کب بدلتی ہیں؟

نیند سے چونک کر

نیند سے چونک کر
آنکھ کھولی تو دیکھا
کہ اللہ پھیلا ہے آکاش پر
ساری کرنوں کا منبع اللہ ہے
پنچھیوں کی قطاروں میں اللہ ہے

ایک ڈالی پہ اللہ کھلتا ہوا
ایک تتلی میں اللہ اُڑتا ہوا
ایک چہرے پہ اللہ ہنستا ہوا

پانیوں میں، ہواؤں میں، الفاظ میں
تا بہ حدِ نظر صرف اللہ ہے
ایک اللہ ہے

O

میرے موجود میں
بل وہی، کس وہی
چھال میں خشکی اور ڈال میں رس وہی
میرے پتوں میں زردی و سبزی وہی
پھول میں رنگ و بو
پھل میں لذت وہی

ڈالی ڈالی پہ چہکاریاں مارتا

پتّے پتّے پہ قلقاریاں مارتا
چھال سے گوند بن کر چھلکتا ہوا
اک وہی، بس وہی
میرے موجود میں

○

لا الٰہ، لا الٰہ
چاند، سورج، زمین اور آکاش میں
جنم اور ناش میں
الّا اللہ کوئی نہیں
ایک اور دوسری سانس کے درمیاں
لا الٰہ، لا الٰہ
دیکھ کر سر بہ سجدہ ہوئی پُتلیاں
ایک جھلّی چڑھی تھی، ہٹی آج ہاں
لا الٰہ، لا الٰہ

سُکھ میں اور کشٹ میں
آدی اور انت میں
اِلّا اللہ کوئی نہیں
تھام رکھو یہی اک سرا
لا الٰہ، لا اِلٰہ

□□

صادقؔ دہلوی

صوفی محمد یٰسین خاں صادقؔ دہلوی دہلی کی کرخندار برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ معمولی تعلیم یافتہ تھے لیکن شعروشاعری سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ دلچسپی شعراء کی صحبتوں میں لے گئی۔ شاعروں کی صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے شعر موزوں کرنے لگے۔ باقاعدہ شاعری شروع کی تو شعری و ذہنی تربیت کے لیے حضرتِ مخمورؔ دہلوی جیسے باکمال شاعر کی انگلی پکڑی۔ حضرتِ مخمورؔ نے کم علم شاگرد کے علمی شغف، ادبی ذوق اور شعری صلاحیتوں کو اُبھارا اور اپنے تلامذہ کا ایک قابلِ قدر شاعر بنا دیا۔ حضرتِ مخمورؔ ایک صاحبِ نسبت اور صاحبِ دل شاعر تھے ان کی صحبتوں میں صادقؔ تصوف کی طرف مائل ہوئے اور حضرت صوفی شاہ محمد حسن صاحب سے بیعت ہو کر اسی دنیا کے ہو کر رہ گئے۔

صادقؔ دہلوی اپنے پُرسوز ترنم کی وجہ سے مشاعروں کے مقبول شاعر تھے لیکن پیری، مریدی کی دنیا میں آکر انھوں نے مشاعروں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

''نگارِ صادق'' اور ''خضرِ منزل'' ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں جو ان کی حیات ہی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر مقبولِ خاص و عام ہوئے۔

صادقؔ دہلوی نے ۲۲ر جون ۱۹۸۴ء کو دہلی میں داعیِ اجل کو لبّیک کہا۔

نمونۂ کلام:

غزل

مجھ سے منہ موڑ کر نہ جائیں آپ
میرا دل توڑ کر نہ جائیں آپ
آپ سے تو بڑی اُمیدیں ہیں
یوں مجھے چھوڑ کر نہ جائیں آپ
عشق ہر ایک سے نہیں ہوتا
رشتہ یہ توڑ کر نہ جائیں آپ
بندۂ غم کا دل شکستہ ہے
حوصلہ توڑ کر نہ جائیں آپ
آپ ہی ساقیٔ زمانہ ہیں
تشنہ لب چھوڑ کر نہ جائیں آپ
دل میں رہتی ہے آپ کی تصویر
آئینہ توڑ کر نہ جائیں آپ
رہبرِ دل ہیں آپ صادقؔ کے
راہ میں چھوڑ کر نہ جائیں آپ

○

جب ترا حسنِ نظر یاد آیا
اپنا دل ، اپنا جگر یاد آیا
ایسا مدہوش کیا ساقی نے
دشت یاد آیا نہ گھر یاد آیا
تم بھلاتے تو ہو ، دیوانے کو
پھر بھی دیوانہ اگر یاد آیا؟

تیرے الطاف و کرم کے قرباں
تو مجھے شام و سحر یاد آیا
سوئے مے خانہ چلا رندِ خراب
پھر کوئی مست نظر یاد آیا
جب ملا چاک گریباں کوئی
تیرے جلووں کا اثر یاد آیا
دیکھ کر شہرِ خموشاں اکثر
اپنی ہستی کا سفر یاد آیا
حالِ دل آپ نے پوچھا تو سہی
شکر ہے بندۂ در یاد آیا
دیکھ کر حسنِ جہاں اے صادقؔ
مجھ کو وہ آئینہ گر یاد آیا

○

ہم اگر عرضِ مدعا نہ کریں
آپ کیا کچھ ہمیں عطا نہ کریں
آپ مالک ہیں اپنی مرضی کے
آپ وعدہ کریں وفا نہ کریں
میں ہوں دیوانہ میری باتوں کو
آپ بھی غور سے سنا نہ کریں
میں مریضِ غمِ محبت ہوں
میرے حق میں کوئی دعا نہ کریں
ہر ستم کی اک عمر ہوتی ہے
آپ اب ظلمِ ناروا نہ کریں
مجھ کو پہنا کے عشق کی زنجیر
زندگی بھر مجھے رہا نہ کریں

مجرمِ عشق مجھ کو ٹھہرا کر
مجھ سے دنیا کو آشنا نہ کریں
ظلمتیں دور ہو نہیں سکتیں
آپ اگر دل کو پُر ضیا نہ کریں
آپ کو کون دیکھ سکتا ہے
آپ جب تک نظر عطا نہ کریں
پیرِ میخانہ جام دے ایسا
ہم کبھی ہوش میں رہا نہ کریں
ہے تقاضا یہ عشق کا صادقؔ
ہم کسی بات کا گلہ نہ کریں

O

اندھیرا چھا نہ جائے، ماہ پارو، جاگتے رہنا
تقاضہ وقت کا ہے، اے سہارو، جاگتے رہنا
مری پلکوں پہ اشکوں کے ستارو، جاگتے رہنا
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے سہارو، جاگتے رہنا
بڑی مدت میں وصلِ دوست کی یہ رات آئی ہے
مرے ہمراہ تم بھی چاند تارو، جاگتے رہنا
جلو میں نور لے کر وہ نمایاں ہونے والے ہیں
مری چشمِ تمنّا کے سہارو، جاگتے رہنا
ہر اک دل میں محبت کی ابھی بنیاد رکھنی ہے
تبسم ریز ہونٹوں کے شرارو، جاگتے رہنا
یہی تو کہہ رہے ہیں انقلابِ وقت کے تیور
بہت طوفان آئیں گے کنارو، جاگتے رہنا

ہزاروں قافلے ہیں جادہ پیما راہِ الفت میں
ذرا منزل کے تابندہ اشارو ، جاگتے رہنا
ابھی دل سوختہ ہونے میں تھوڑی دیر باقی ہے
ابھی کچھ اور اے غم کے شرارو ، جاگتے رہنا

یہ دنیا ہے یہاں خوابیدہ رہنا اک قیامت ہے
یہی کہتا ہے صادقؔ غم کے مارو جاگتے رہنا

○

پلکوں پہ اشکِ غم سے چراغاں کیے ہوئے
ہم ہیں تمھاری دید کا ساماں کیے ہوئے
بزمِ جہاں کو ہیں وہ درخشاں کیے ہوئے
ہر رنگ و بو میں خود کو نمایاں کیے ہوئے
ہم کیا ڈریں گے گردشِ لیل و نہار سے
ہم ہیں طوافِ کوچۂ جاناں کیے ہوئے
اک دن نصیب ہوگی مجھے منزلِ حیات
ذوقِ طلب ہے راہ کو آساں کیے ہوئے
دنیا پہ اب نگاہ جمے بھی تو کیا جمے
حسن و جمالِ دوست ہے حیراں کیے ہوئے
منظور قیدِ غم سے رہائی نہیں ہمیں
ہم خود ہیں اپنے قلب کو زنداں کیے ہوئے
اُس نے بھی اپنے چہرہ سے پردہ اٹھا دیا
دیکھا ہمیں جو چاک گریباں کیے ہوئے
دنیا کی ظلمتوں کو میں بخشوں گا روشنی
دل میں ہوں شمعِ عشق فروزاں کیے ہوئے

دل مطمئن ہے آپ کی نسبت کے فیض سے
حالاتِ زندگی ہیں پریشاں کیے ہوئے
صادق ہماری ذات ہے آئینۂ وفا
ہم ہیں جہانِ عشق کا ساماں کیے ہوئے

○

دنیا سے منہ موڑ لیا ہے
تجھ سے ناطہ توڑ لیا ہے
نذرِ محبت پیش کریں گے
دل کا شیشہ توڑ لیا ہے
جس کو نہیں ہے تجھ پہ بھروسہ
اُس نے مقدر پھوڑ لیا ہے
کیوں نہ رہے اک کیف کا عالم
ساقی سے دل جوڑ لیا ہے
پھر وہ جانِ آرزو، آیا
پھر دل نے اک موڑ لیا ہے
سازِ نفس کا ہر اک نغمہ
یاد سے تیری جوڑ لیا ہے
ڈوبنے والی ہر کشتی نے
ساحل سے رُخ موڑ لیا ہے
عشق میں اپنے دل کا تعلق
تیرے غم سے جوڑ لیا ہے
عشق کی ہے یہ کون سی منزل
خود سے بھی منہ موڑ لیا ہے
تیری محبت میں صادق نے
سب سے رشتہ توڑ لیا ہے

صالحین فہمی

صالحین فہمی کے اجداد فنِ تعمیر کے ماہرین میں سے تھے جن کو لال قلعہ کی تعمیر اور شاہجہاں آباد یعنی دہلی کی آباد کاری کے وقت شاہجہاں بادشاہ نے لاہور سے بلا کر دہلی میں بسایا تھا۔ اس لحاظ سے یہ پشتینی دہلی والے ہیں۔ ۵ رنومبر ۱۹۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ محمد انعام لاہوری مرحوم کرخندار تھے۔ شاعری کا شوق اردو رسائل و کتب کے مسلسل مطالعہ کی دین ہے۔ ۱۹ سال کی عمر میں شاعری شروع کی ابتدا میں جناب نصرت گوالیاری سے مشورۂ سخن کیا اور اب شہباز ندیم ضیائی سے دوستانہ مشورہ کرتے ہیں۔

ناساعد حالات کی وجہ سے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ پیشے کے لحاظ سے ڈائی میکر ہیں اور اس فن کے ماہر ہیں۔ شعری و ادبی نشستوں میں باقاعدہ شرکت کرتے ہیں لیکن مشاعروں سے دور رہتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

ایک درویش سرِ راہ صدا دیتا ہے
وقت انسان کی پہچان مٹا دیتا ہے
جب گزرتا ہے تصور ترا چھوکر مجھ کو
میرے احساس کو آئینہ بنا دیتا ہے
یاس محرومی کسک درد مسلسل الجھن
ایسا ماحول ہی جینے کا مزا دیتا ہے
ایک حاسد کی تمنا کہ فنا ہوجاؤں
اک قلندر مجھے جینے کی دعا دیتا ہے
تیرے فہمی کی طبیعت بھی عجب ہے جاناں
نیکیاں کرتا ہے دریا میں بہا دیتا ہے

O

مجھے حیرت ہے آخر کیا ہوا ہے
مزاجِ دوستاں بدلا ہوا ہے
ہوائیں دیکھ کر خوش ہورہی ہیں
چراغوں میں دھواں سمٹا ہوا ہے
تمام اسرارِ جاں روشن ہیں مجھ پر
میرا دل جب سے آئینہ ہوا ہے
چھپا ہے دوستوں میں میرا دشمن
بہت دن میں یہ اندازہ ہوا ہے
وفا نا آشنا ہے قلبِ فہمی !!
یقیناً آپ کو دھوکا ہوا ہے

○

کوئی ناگہاں مجھ سے بیزار ہے
غلط فہمیوں میں گرفتار ہے
سمجھ کر مجھے جو سمجھتا نہیں
نہ جانے وہ کیسا سمجھدار ہے
نئے زخم لاتی ہے بادِ صبا !!
چمن میں ہر اک پھول بیمار ہے
شبِ غم کے مارو نہ مایوس ہو
اُجالا سا کچھ کچھ نمودار ہے
بڑھو منزلوں کی تمنا لیے !!
گرادو جو رستے میں دیوار ہے

○

درد کی دولت نہ کر تقسیم رونا چھوڑ دے
رکھ نہیں سکتا انا قائم تو دنیا چھوڑ دے
روز ایک جھوٹی تسلّی دل کو دینا چھوڑ دے
مجھ کو یادوں کے شبستاں میں اکیلا چھوڑ دے
ہم کو قائل کر سکے تو لا کوئی ایسی دلیل
یا ہمارے سامنے تو بحث کرنا چھوڑ دے
مخلصانہ رائے بھی میری طرح دیتا ہے کون
جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنا چھوڑ دے
بات یہ بھی سمجھ سے کیوں تمھاری دور ہے
رہنما ایسا نہیں ہوتا جو تنہا چھوڑ دے

○

اُن کے لفظوں میں طنز ڈھلتے ہیں
میری آنکھوں سے غم ابلتے ہیں
شکوہ کرتے ہیں روز و شب لیکن
لوگ حالات کب بدلتے ہیں
روشنی کے لیے چراغوں سے
روح تپتی ہے جسم جلتے ہیں
راستوں کو ہمیں بدلنا ہے !
راستے خود کہاں بدلتے ہیں
ہم جہاں دیدہ لوگ ہیں فہمی
رہبروں کو سمجھ کے چلتے ہیں

○

یہ سوچا ہے کبھی تم نے کہ ماضی میں کہاں ہم تھے
بھٹکتے راستے تم تھے اَمیرِ کارواں ہم تھے
نہ جانے کتنے افسانے چھپے تھے اُس خموشی میں
جو تم محسوس کرلیتے تو جذبوں کی زباں ہم تھے
ہر اک منظر سے ہوتا تھا گماں گوہر فشانی کا
مگر تری نظر میں صرف سنگِ رائگاں ہم تھے
ہٹائے جا سکے تم سے نہ پردے اجنبیت کے
مزے کی بات تو یہ ہے جہاں تم تھے وہاں ہم تھے
زبانی طور پر فہمی سے تم کیوں بحث کرتے ہو
کتابیں پڑھ کے دیکھو داستاں در داستاں ہم تھے

□□

صدرالدین احمد صدرؔ

مولانا صدرالدین احمد صدرؔ کی تمام عمر دہلی میں گزری۔ وہ یہاں مکتبہ مجتبائی اور خلیق منزل چوڑی والان سے وابستہ تھے اور اس خاندان کے بہت قریب تھے اس لیے ان کو دہلی ہی والا خیال کیا جاتا تھا اور اکثر رسائل میں ان کے نام کے ساتھ دہلوی لکھا جاتا تھا لیکن وہ قصبہ شیرکوٹ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔

مولانا صدر ایک قادرالکلام شاعر ہی نہیں عربی، فارسی کے فاضل اور بہت اچھی دسترس رکھتے تھے۔ اوائلِ عمر سے شعر کہتے تھے۔ ابتداء میں مولانا غلام حضرت خاں حاذقؔ رامپوری کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ جناب حاذقؔ رامپوری ایک صاحبِ علم و عمل اور اہلِ تصنیف بزرگ تھے جلد ہی اپنے لائق شاگرد کی رنگِ طبع کو پہچان گئے۔ غزلیہ شاعری ترک کر کے ایسی نظمیں کہنے کا مشورہ دیا جن سے اخلاق و ایمان کی تبلیغ ہو۔ مولانا صدر نے استاد کے اس مشورے کو قبول کر کے غزل گوئی ترک کر دی اور اپنی تمام شعری صلاحیتوں کو قرآن کریم کی تفسیر کرنے، ایمان و یقین، سیرت کے واقعات، صحابہؓ کرام کے کوائفِ زندگی پر قلم اٹھانے، امتِ مرحومہ کے سامنے اس کا صحیح لائحۂ عمل پیش کرنے اور فکر و نظر کو سنوارنے کے لیے وقف کر دیا اور زندگی بھر اسی نہج پر شاعری کی جس کو مذہبی شاعری کہا جاتا ہے، ایک ایسی شاعری جس پر قرآن کے حکیمانہ ابلاغ کی چھاپ سب سے زیادہ گہری

ہے، جس کی آیات و احکامات کی وہ انتھک ترجمان اور شارح بن کر قلب و نظر اور روح کو مطمئن و سرشار کرتی ہے۔

جناب حاذقؔ رامپوری کے انتقال کے بعد مولانا صدر حضرتِ آلمؔ مظفرنگری کے تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ جنابِ آلمؔ مظفرنگری جن کا خاندانی نام محمد اسحاق خاں تھا، جناب سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے اور اپنے زمانے میں ہندوستان کے مشاہیرِ علم و ادب میں ایک خاص مقام کے مالک تھے، ان کے علمی و فنی آثار میں باکمال اساتذہ کے ادبی آثار کا نمونہ ملتا ہے۔

مولانا صدر کی تخلیقاتِ فکر کا پہلا مجموعہ ''گلدستۂ صدر'' کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شمس المطابع لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوا۔ دوسرا مجموعۂ کلام ''رازِ عشق'' کے نام سے دھامپور کے اشرف المطابع سے شائع ہوا۔ تیسرا مجموعہ ''بادۂ عرفان'' آستانہ بکڈپو دہلی کی طرف سے شائع ہوا۔ ''زیارتِ حرمین'' مولانا صدر کا منظوم سفرنامۂ حج ہے جسے آستانہ بکڈپو دہلی نے شائع کر کے زائرین حج کی خدمت میں مفت پیش کیا اور اس منظوم سفرنامے کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ ''متاعِ زندگی'' ان کا آخری شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۶۹ء میں کوہِ نور پریس، دہلی میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔

نمونۂ کلام:

شمع و پروانہ

(ایک مکالمہ)

شمع نے اک روز پروانے سے یہ کی گفتگو
سچ بتا! اے ننھے کیڑے! مجھ پہ کیوں مرتا ہے تو
کیا نہیں تجھ کو عزیز اپنی یہ جانِ ناتواں
کس لیے تو مجھ پہ گرجاتا ہے اکر ناگہاں
تیری یہ جرأت فقط اک جرأتِ رندانہ ہے
تو حریفِ عقل ہے، نادان ہے، دیوانہ ہے

تجھ سے رغبت ہے کسی کو اور نہ تیرے کام سے
ہاتھ رکھتا ہے ہر اک کانوں پہ تیرے نام سے
بزمِ ہستی کے تجلّی پر نہیں تیری نظر
گھومتا رہتا ہے میرے گرد دنیا چھوڑ کر
تیرا مرنا اور جینا ہے خلافِ قاعدہ
زندگی تیری عبث ہے موت بھی بے فائدہ
منجلی تجھ پر نہیں تخلیقِ عالم کے نکات
زندگی اور موت کو سمجھا ہے تو بیکار بات
داستانِ زندگی کو یوں نہ کر تو مختصر
کھیلنا اچھا نہیں ہے آگ سے اے بے خبر
میری سُن اور دھیان کر میری حقیقت کی طرف
پھر بتا! حاصل مجھے ہے یا تجھے عزّ و شرف

میرے دم نے زندگیِ شوق کو بخشی ضیا
میری ہستی نے منوّر ظلمتوں کو کر دیا
میں مکانوں کی ہوں زینت رونقِ ہر بام و در
میں نہ ہوں جس گھر میں وہ تاریک آتا ہے نظر
میرے ہی پرتو سے ہے رنگینیِ شامِ چمن
میں نہ ہوں موجود تو ہو سونی سونی انجمن
نیک و بد سب ہی سمجھتے ہیں مجھے گھر کا چراغ
میرے جلووں سے نہ ہو کیوں اُن کا دل پھر باغ باغ
جب کہ بزمِ ناز میں خود ہوتی ہوں میں جلوہ گر
دیکھتے ہیں میرے حسنِ سوز کو اہلِ نظر
میں کبھی فانوس میں ہوں اور کبھی قندیل میں

عمر کٹتی ہے مری تسبیح میں تہلیل میں

میں کسی شے پر نہ ڈالوں اپنی جب تک روشنی

اسود و احمر کا کیوں کر فرق سمجھے آدمی

میرا جلوہ ہے بہر صورتِ فروغِ کائنات

میں نے روشن کر دیے آ کر جہاں میں شش جہات

ہر کس و ناکس کو ظلمت میں ضرورت ہے مری

تجھ سے کیا الفت ہو جب صورت نہ کچھ سیرت تری

سن کے یہ باتیں زبوں تھا گرچہ پروانے کا حال

پھر بھی بہرِ گفتگو اُس نے لیا خود کو سنبھال

نرم لہجے میں دیا یہ شمع کو اُس نے جواب

زندگی تو کہہ رہی ہے جس کو وہ ہے ایک خواب

یہ بہارِ لالہ و گل ، یہ شبابِ آب و گِل

عارضی ہیں اِن کے جلوے ہیں کہاں تسکینِ دل

حسن ہو یا نوجوانی ، مختصر سی بات ہے

چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

جان دے دے جو درِ محبوب پر جیتا ہے وہ

بعد مرنے کے شرابِ وصل کو پیتا ہے وہ

جو ہے عاشق جان دینے سے نہیں کرتا گریز

وہ غمِ جاناں میں رہتا ہے ہمیشہ اشک ریز

تیری بزمِ ناز میں جل جل کے مر جاتا ہوں میں

چاہنے والوں میں تیرے نام کر جاتا ہوں میں

میرا شیوہ ہے ازل سے شیوۂ مردانگی

"مُوْتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوا" پر میں کرتا ہوں عمل
بعد مرجانے کے پاؤں گا حیاتِ مستقل

جانے کیا کیا کہہ گیا پروانہ اپنے جوش میں
شمع نے سن کر یہ باتیں لے لیا آغوش میں
دم بخود تھا میں نہ سمجھا عشق کے راز و نیاز
طالب و مطلوب میں باقی نہ تھا کچھ امتیاز
بے خودی میں شمع کا اقدام گو بیجا نہ تھا
شمع تھی محفل میں لیکن اب کہاں پروانہ تھا
چھوڑ کر نقشِ وفا اک ہستیٔ موجود پر
سرخ رو ہوکر وہ پہنچا منزلِ مقصود پر
شمع نے دیکھی سرِ محفل جو پروانے کی خاک
آنکھ سے آنسو بہائے، کرلیا سینے کو چاک
گھلتے گھلتے سوزشِ پیہم سے آدھی رہ گئی
آتشِ ضبطِ وفا سے کچھ جلی کچھ بہہ گئی
کون کہتا ہے اثر الفت میں کچھ ہوتا نہیں
ہر نفس ہے سوختہ جانوں کا گلشن آفریں
شمع و پروانہ سے لے کوئی تو درسِ آگہی
در حقیقت زندگی ہے آخرت کی زندگی

صدر مجھ کو یاد ہے اب تک یہ پروانے کی بات
جذبۂ اخلاص ہے اُلفت میں حلِّ مشکلات

اے ارضِ حرم مجھ کو پھر یاد تری آئی

لبّیک کہا دل نے ، لی شوق نے انگڑائی
سوزِ غمِ فرقت نے پھر آگ سی بھڑکائی
جلووں کے تصور سے دن ہے شبِ تنہائی
انوار کی منزل ہے تخیّل کی پہنائی
ہوں گوشۂ خلوت میں جلوت کا تماشائی
اے ارضِ حرم مجھ کو پھر یاد تری آئی

ہے روکشِ صد جلوہ ذرّوں کی درخشانی
ہر موجِ ہوا دیتی ہے دعوتِ عرفانی
یہ عالمِ ہستی ہے یا مرکزِ حیرانی
ہر کوہ و بیاباں پر انوار ہیں لاثانی
مشتاق نظر جن کی اور دل ہے تمنائی
اے ارضِ حرم مجھ کو پھر یاد تری آئی

اللہ نے وہ دن بھی کیا خوب تھے دکھلائے
جو مرکزِ وحدت میں خوش ہو کے گزار آئے
یہ شمس و قمر جن کی تنویر سے شرمائے
اُن جلووں کی بارش کی کیوں یاد نہ تڑپائے
تھی جن میں حقیقت کی رعنائی و برنائی
اے ارضِ حرم مجھ کو پھر یاد تری آئی

خالق نے ازل ہی سے تجھ پر یہ کرم رکھا
اک تجھ کو ہی مقصودِ اربابِ ھِمَم رکھا

کونین کی منزل میں یوں تیرا بھرم رکھا
ہراک نے تجھے چوما، جب تجھ پہ قدم رکھا
شاہوں نے گدا بن کر کی ناصیہ فرسائی
اے ارضِ حرم مجھ کو پھر یاد تری آئی

دنیا کی ملی نعمت عقبیٰ کی ملی دولت
دیدار ترا گویا، اللہ کی ہے رحمت
ہے ذکرِ خدا ہر دم یک لحہ نہیں فرصت
حاصل ہے سکوں دل کو اور جان کو ہے راحت
پہنچا جو ترے در پر ہر غم سے اماں پائی
اے ارضِ حرم مجھ کو پھر یاد تری آئی

قسمت سے کوئی غیبی تائید میسّر ہو
اے کاش! تری مجھ کو پھر دید میسّر ہو
کعبے کی طرف چل دوں تو عید میسّر ہو
طاعت کی کوئی ایسی تمہید میسّر ہو
ہر گام پہ ہوں سجدے ہر رہ میں جبیں سائی
اے ارضِ حرم مجھ کو پھر یاد تری آئی

اے شوقِ فراواں اُٹھ اور پیشِ خدا جا کر
تو صدؔر کی خواہش کو اک عرضِ تمنّا کر
اُس ارضِ مقدس کو دیکھے یہ وہیں آ کر
بیمارِ محبت کا لِلّٰہ مُداوا کر
چھٹنے کو ہے ہاتھوں سے دامانِ شکیبائی
اے ارضِ حرم مجھ کو پھر یاد تری آئی

صغیر احمد صوفؔی

اُتر پردیش کے ضلع وارانسی کا قصبہ چندولی صغیر احمد صوفؔی کا آبائی وطن ہے جہاں وہ جولائی ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔قصباتی ماحول میں ابتدائی تعلیم وتربیت حاصل کرنے کے بعد فارسی کے کوئنس کالج میں تعلیم پائی۔شعر وادب کا ذوق قصباتی ماحول اور ابتدائی تعلیم و تربیت کی دین تھا جسے کالج کی فضا اور ساقی، نیرنگِ خیال اور ہمایوں جیسے ادبی ماہناموں کے مطالعہ نے جلا بخشی اور ذہنی تربیت کی لیکن انھوں نے شاعری عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد شروع کی اور عام شاعروں کی طرح مشاعروں کی بجائے اردو رسائل کے حوالے سے شعری منظرنامے پر ابھرے۔

ان کے دو شعری مجموعے ''رقصِ دوام'' اور ''گرمیٔ اندیشہ'' منظرِ عام پر آکر اردو دنیا میں مقبول ہو چکے ہیں۔پچھلے تیس سال سے دہلی میں مقیم ہیں اور ریلویز کی ملازمت سے ریٹائر ہوکر وکالت کے پیشے کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں اور دہلی ہائی کورٹ کے مشہور اور مقبول وکیلوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

اپنے جنوں کی تازہ حکایت ہے آج بھی
دیوانگی ہی شمعِ ہدایت ہے آج بھی
ترکِ تعلقات کو برسوں گزر گئے
لیکن کسی کی یاد سلامت ہے آج بھی
ان کے حسین طرزِ تغافل کی خیر ہو
میری وفا سے جن کو شکایت ہے آج بھی
آیا کبھی تھا شہرِ نگاراں سے دل فگار
پلکوں پہ سیلِ اشکِ ندامت ہے آج بھی
صوفی نے کر دیا سرِ تسلیم خم، مگر
اس انجمن میں ذکرِ بغاوت ہے آج بھی

○

بہت بڑھنے لگی ہیں ذہن کی بے تابیاں لوگو
کوئی قصہ، کوئی افسانہ اب جادو بیاں لوگو
ہمارے خونِ ناحق پر کوئی پرسش نہیں ہوتی
مگر تسلیم کر لیتے ہو قاتل کا بیاں لوگو
ہماری سنگساری کا تماشا دیکھتے جاؤ
مگر محفوظ کر لو اپنے شیشوں کے مکاں لوگو
خود اپنی ذات کو میں لمحہ لمحہ قتل کرتا ہوں
کہاں تم ڈھونڈتے پھرتے ہو قاتل کا نشاں لوگو
تمھارے ناز و انداز ستم کے ہم بھی قائل ہیں
نہ جانے کس لیے رہتے ہو پھر بھی بدگماں لوگو

عجب ناداں ہو بے رونقی کا اب بھی شکوہ ہے
سجی ہے شہر میں ہر سمت زخموں کی دکاں لوگو
عجب بادِ مخالف تھی کہ صوفی شہر میں اپنے
ہوا خاموش جیسے ایک شہر بے نشاں لوگو

○

ہندو سے کہوں گا نہ مسلماں سے کہوں گا
کیا فرض ہے انسان کا، انساں سے کہوں گا
احوالِ زبوں، زخمِ بہاراں سے کہوں گا
احساسِ زیاں، گردشِ دوراں سے کہوں گا
پھر پیار سے جینے کی کوئی راہ نکالیں
یہ بات تیرے روئے درخشاں سے کہوں گا
خود اپنی ہی آواز کے شعلوں میں جلا ہوں
یہ جُرمِ وفا، دیدۂ گریاں سے کہوں گا
ہے دردِ محبت سے میری زیست عبارت
زخموں کی کسک، گردشِ دوراں سے کہوں گا
ہوگا گُلِ مہتاب سے اس حسن کا چرچا
اس لب کی صفت لعلِ بدخشاں سے کہوں گا
جگ بیت گیا اس کی جدائی نہیں بھولی
صوفی یہ حکایت، شبِ ہجراں سے کہوں گا

○

جب گرمیِ یقیں سے بھی گھبرا گیا ہوں میں
وہم و گماں کے شہر میں پھر آ گیا ہوں میں
میں خار تھا تو سارے گلستاں کی جان تھا
اب پھول ہو گیا ہوں تو مرجھا گیا ہوں میں

واقف ہر اک شخص ہے اس کے فریب سے
یہ جان کر فریب مگر کھا گیا ہوں میں
تجھ سے بچھڑ گیا ہوں تو محسوس یہ ہوا
اک شاخ تھا شجر سے جدا ہو گیا ہوں میں
خوش فہمیوں نے رنگ بشارت کا دے دیا
خود اپنی خواہشوں کا خدا ہو گیا ہوں میں
صوفیؔ سکونِ دل نہ ملا جب کہیں مجھے
مایوس ہو کے اپنے ہی گھر آ گیا ہوں میں

○

میرے احساس کو آئینہ دکھاتا کیوں ہے
تو سمندر ہے تو قطرے کو ڈراتا کیوں ہے
مجھ کو آواز دے گر تیرا خطا کار ہوں میں
اپنے مقتل میں اشاروں سے بلاتا کیوں ہے
تو حقیقت ہے تو اپنے کو نمایاں کر دے
تو اگر خواب ہے پھر خواب دکھاتا کیوں ہے
تیرا ایمان ہی جب ترکِ تعلق ٹھہرا
ایک بجھتی ہوئی قندیل جلاتا کیوں ہے
تیری تقدیر میں طوفان بھی ہیں آنسو بھی
پھر بھلا ریت کی دیوار اٹھاتا کیوں ہے
موسمِ گل کا فسانہ تو سنانے دے انھیں
خشک پتوں کو درختوں سے گراتا کیوں ہے
میں تیرا راز بھی، دمساز بھی، غماز بھی ہوں
اپنی محفل سے مجھے آج اٹھاتا کیوں ہے

تو عجب خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں
میری تنہائی کی رگ رگ میں سماتا کیوں ہے
تو نے اک در پہ نہ جانے کی قسم کھائی تھی
لیکن اک گھر کا پتہ سب کو بتاتا کیوں ہے
مٹ گیا جب ترا احساسِ جمال اے صوفیؔ
ذہن میں پھر نئی تصویر بناتا کیوں ہے

○

تھا کبھی دریا مگر اب صرف اک قطرہ ہوں میں
اس ہجومِ نسلِ نو میں کس قدر تنہا ہوں میں
غیر کے کہنے سے دعوئ ہمسری کا کیا کروں
وقت کا سورج ہے تو اور موم کا پُتلا ہوں میں
آندھیوں میں سب نئے چہرے پرانے ہو گئے
آئینہ خانے میں اک بگڑا ہوا چہرہ ہوں میں
اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس ماحول میں
کس قدر ٹوٹا ہوا ہوں کس قدر بکھرا ہوں میں
اُس نے دیکھا تھا مجھے شاید نگاہِ لطف سے
آج تک خوش فہمیوں کے جال میں الجھا ہوں میں
کون جانے راہ میں کانٹے ملیں پتھر ملیں
پھونک کر اس واسطے صوفیؔ قدم رکھتا ہوں میں

□□

صلاح الدین پرویز

اردو دنیا میں خانہ ساز ادبی انجمنوں اور گمنام تنظیموں کی جانب سے گلی کوچوں میں شاعروں اورادیبوں کی ادبی وشعری خدمات کا اعتراف ایک عام سی بات ہے،لیکن خالص ادبی اور سرکاری سطح پر ادبی خدمات کا اعتراف ہر تخلیق کار کا ایک ایسا خواب ہے جو عمر گزرنے کے بعد بھی پورا نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں صلاح الدین پرویز اردو دنیا کا ایک ایسا خوش نصیب شاعر وادیب ہے جس کی شعری وادبی خدمات کا اعتراف اعلیٰ ادبی سطح پر ہی نہیں بلکہ سرکاری سطح پر بھی اس عمر میں ہوا جس کا عام ادیب وشاعر تصور بھی نہیں کر سکتے۔

صلاح الدین پرویز کا جنم ۹رفروری ۱۹۵۴ء کو الہ آباد میں ہوا۔ الہ آباد سے گریجویشن کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ صلاح الدین پرویز اوائل عمر سے شاعری کر رہے ہیں۔ شاعری میں کسی کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے کی بجائے تعلیماتِ محمدی اور اپنے والدین و بڑے بھائی کے کردار کی روشنی میں اپنی تربیت خود کی۔

صلاح الدین پرویز نے نظم سے اپنی ادبی وشعری سفر کا آغاز کیا۔ ان کی ابتدائی نظمیں مستقبل کی بہت اچھی شاعری کی نقیب بن کر ابھریں اور نقد ونظر کے اکابرین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے شعر وادب میں نئے نئے تجربے کیے ہیں اور شاعری وفکشن کو نیا

موثر عطا کیا ہے۔ انھیں تجربات اور شعری لب و لہجے کی توانائی کی وجہ سے صلاح الدین پرویز اردو دنیا میں ایک منفرد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اب تک ان کے بارہ شعری مجموعے ''ژاژ''، ''نگیٹو''، ''جنگل''، ''دھوپ سمندر سایہ''، ''لو پوئمز''، ''دھوپ سرائے''، ''لوریاں''، ''پرماتما کے نام آتما کے پتر''، ''کنفیشن''، ''خطوط''، دشتِ تحیرات'' اور ''کتابِ عشق'' شائع ہو کر اربابِ نقد و نظر اور ادب کے سنجیدہ قارئین سے خراج وصول کر چکے ہیں۔

صلاح الدین پرویز نے شاعری کے ساتھ ساتھ فکشن میں بھی مضامینِ نو کے انبار لگائے ہیں۔ ''نمرتا''، ''سارے دن کا تھکا ہوا پُرش''، ''ایک دن بیت گیا''، ''آئیڈنٹٹی کارڈ'' اور ''دی وار جرنلس'' صلاح الدین پرویز کی تخلیقی انفرادیت کے گواہ ہیں۔ ''نمرتا'' ایک بہت ہی خوبصورت اور اچھوتی تخلیق ہے جس میں ہندوستانی کلچر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کو Poetic Prose میں بیان کیا گیا ہے۔ صلاح الدین پرویز نے یہ ناول لکھ کر اردو کے ناول نگاروں کے لیے ہندوستانی کلچر کی ہزار ہا سال پرانی تاریخ کو موضوع بنانے کے نئے امکانات پیدا کیے ہیں۔ اس کی اساطیری معنویت کے پیشِ نظر ہی اب اس ناول کو انڈین کلاسکس کے تحت انگریزی میں روپا اینڈ کمپنی شائع کر رہی ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس کی تقسیم کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ یورپین ممالک کے افراد ہندوستان کے اساطیری جمالیاتی تخیل سے روشناس ہو سکیں۔

ہندوستان و پاکستان کے ممتاز اور معتبر نقادوں نے صلاح الدین پرویز کی تخلیقی انفرادیت اور نئی شعری روش کا اعتراف کیا ہے۔ حکومتِ ہند کی ساہتیہ اکیڈمی نے ۱۹۹۱ء میں صلاح الدین پرویز کو اپنے سب سے بڑے اعزاز سے نواز کر اس ادبی اعتراف پر معتبر و مستند ہونے کی مہر ثبت کر دی۔ صلاح الدین پرویز اِن دنوں اپنے تخلیقی اور تصنیفی کاموں کے ساتھ ایک ادبی سہ ماہی رسالہ ''استعارہ'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔

نمونۂ کلام:

نیا سال مبارک ہو

دن کی پرارتھنا سے پہلے ہی
چل رہی تھیں سہرن بھری ہوائیں
پاگل بنانے پر تلی ہوئی تھیں مجھے
رِم جھم برس رہا تھا مینہ
ایسے میں
آرتی اُتارنے سے پہلے ہی
جب سماپت ہونے والا تھا دن... آ گئی وہ
زوں کی سردی میں بھیگی بھاگی
صرف ایک معمولی سی ساری اور بلاؤز میں ملبوس
بنا کسمساہٹ کے بیٹھ گئی میرے پاس
میں نے کہا، ہاتھ تا پو گی
میرے گالوں کی انگیٹھیوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولی
میرے ہاتھ تو پہلے ہی سے گرم ہیں... اچھا اب میں چلوں گی!
جیسے ہی وہ مڑی
بلاؤز بند سے کمر کی جذباتی ہڈی تک
کم از کم ایک فٹ کا فاصلہ تھا
...کاش! میں غلیل میں بنٹا رکھ کر
اس کی کمر پر
ایسا نشانہ سادھتا
نکل پڑتی اس کے منہ سے... اوئی
بھانپ گئی جیسے وہ میری بات

چلتے چلتے اچانک رُکی
اور پیار سے پلٹ کر گھورنے لگی مجھے...

اس وقت میں ایک جنگل میں ہوں
اور اُس ہرنی کو ڈھونڈ رہا ہوں
جو کبھی کبھی شکاری کو خود شکار کے لیے سپرد کر دیتی ہے
لڑکی اور ہرنی میں کیا فرق ہے
میں سوچنے لگتا ہوں... سوچتا ہی رہتا ہوں... سوچتا ہی رہتا ہوں
اور اسی سوچنے کے عالم میں
پہلی جنوری سنہ دو ہزار تین کا سورج
میری سوچ کے کہرے کو ہٹا کر میری سوچ میں
پیوست ہو جاتا ہے
نیا سال مبارک ہو!
یہاں میں اس نئے سال میں اس کے ساتھ اکیلا نہیں ہوں
آپ بھی میرے ساتھ ہیں!

کمینی شام

کمینی شام!
دوپہر سے ہی آ گئی ہے
دلّی کے اس ٹھنڈے دسمبر میں
جارجٹ کا پلّہ، ہوا میں لہراتی
مجھے کرنے بے آرام
کمینی شام!

کمینی شام!
رِم جھما رہی ہے پھولوں سے طمانچے
میرے سانورے گالوں پر
نکلنے والی ہے میری چیخ...
نہیں...
وہ بھی ہوگئی ہے شاید
اُسی کمینی شام کی غلام
کمینی شام!
کمینی شام!
لال لال گلاب کے پھولوں جیسی
پگھل رہی ہے بادل سی
دل کے وِنڈ اسکرین پر
مجھے جلانے کے لیے...
نہیں...میں تو بھیگ رہا ہوں
اٹھالی ہے اِسی لیے خفیہ اندھیرے کی دراز سے
چھتری
اب میں محفوظ ہوں...بہت محفوظ...
نہیں...کمینی شام
مجھ سے روٹھ کر لیٹ گئی ہے
میرے ہی بستر پر
میری ننگی گردن اور پیٹھ پر
ناخن گڑانے کے لیے
کمینی شام اب اور بھی کمینی ہوگئی ہے
کمینی شام
کمینی شام!

نوٹھی گاؤں کی چھوٹی کسنیا

نوٹھی گاؤں کی چھوٹی کسنیا
میرے لیے سندیس!
...ہاں... کچھ سنسان سی آنکھیں
لال لال لہو سے سپنے
تیز ہوائیں
ایک بجھا بے تیل چراغ
ایک خزاں آسا پتے سا
چُرمُر کرتا دیپک راگ...
ڈھونڈے گا کیا میرے لیے تو!
چندر گپت، اشوک کے یگ کے
پاؤں کے گم نام نشاں...
جا، واپس جا... میرے لیے حیرانی چھوڑ
اسٹیشن پر کھڑی ہوئی گاڑی کی سیٹی
چیخ رہی ہے
نوٹھی گاؤں کی چھوٹی کسنیا
مر مر کے بھی نہیں مرے گی
جب تک اس مٹی میں، سوکھا، قحط سیلاب
بے کاری اور بھوک رہے گی
نوٹھی گاؤں کی چھوٹی کسنیا
زندہ رہے گی!
نوٹھی گاؤں کی چھوٹی کسنیا
زندہ رہی ہے
زندہ رہے گی...

امرپالی

ہوا پھر آزمانے آ

وہی موسم ہے تنہائی کا

میں گھر میں اکیلا ہوں...

اندھیرا ہوگا... کھڑکی کے شیشے ٹوٹ کے

پیوست ہوتے جا رہے ہیں

اس اندھیرے میں

مری تنہائی میں... دونوں میں شاید!

ارے یہ کون ہے...

یہ چیخ کس کی ہے، مرے سینے سے اٹھی ہے

امرپالی، تم...

کہیں تم تو ہوا...

ہوا پھر آزمانے آ

ہوا پھر آزمانے آ

آخری بوڑھا پیڑ

حکم دیا گیا ہے مجھے

سارے بوڑھے پیڑوں کو ختم کر دیا جائے

لگائے جائیں ان کی جگہ نئے پودے

آدمیوں کی قطار کی طرح

ہوتی ہے جیسے سینما گھروں میں

شاہ رُخ خان کی فلموں کی نمائش پر

میں نے ان کا حکم سنا ہے
اور تعمیل میں
پیڑوں کی جگہ اپنے آپ کو کاٹ کے
ان کی ٹیبل پر فائل کی طرح
بھیج دیا ہے
(لو اس پردیش کا آخری بوڑھا پیڑ، یعنی میں بھی، ختم ہو گیا ہوں)

بلّیاں بھونکنے لگی ہیں

پرانی بات بھی نہیں ہے
یہ کوئی بات بھی نہیں ہے
میں منجمد ہوں
لوگ کہہ رہے ہیں
دور میں گل آفتاب میں
کسی ستارۂ سہیل میں
پگھل رہا ہوں...
پہاڑ کی سفیدیوں میں
رنج سا اُتر رہا ہوں
ستارے، آدمی، سبھی
مجھی کو تک رہے ہیں
حیرتوں کے بار لگ رہے ہیں...
میرے جسم میں بس ایک پھول ہی بچا ہے
زرد، زرد، زعفران سے خفا
اس ایک پھول کے لیے مگر

گھر کے بائیں باغ میں
پہلے کتے بھونکتے تھے
اب وہاں، میاؤں میاؤں کے بجائے
بلیاں
بھونکنے لگی ہیں
بلیاں، بھونکتی ہیں... کیوں!

شہزادی، لیمپ اور بارش

ماہ دسمبر میرے ساتھ منانے آئی ہو شہزادی
ساتھ میں لیکن، میرے لیے کیا لائی ہو شہزادی
دھوپ کا ٹکڑا، شوپاں کی دُھن،
اور ایک دل سا ننھا کیک
لیکن اب یہ کس کام دھام کا، اے شورنجن رانی
چندرکوس، اے شام کلّیاں
دُرگا، بھیرو، یمن راگ کی بانی
دیکھو، دیکھو... وہ!
ماہ دسمبر کا وہ آخری سورج بھی
لو دیکھو ڈوب گیا
میرے پریم للیمائی سے وہ بھی آخر اوب گیا
اب میں ہوں، کمرہ ہے، شب ہے اور یہ میرا لیمپ...
باہر بارش کی رِم جھم ہے...
میں اس لیمپ کے
پیلے نور کی
نیلے لو میں دیکھ رہا ہوں

حیرانی کی ایک یاترا، انت نہیں ہے کوئی
بیتابی کی ایک ماترا، تنت نہیں ہے کوئی
شہزادی، یہ کیا ہے، کیا ہے، کیا ہے، بولو!
تم دل سی اٹھیں فلک سے، مجھ پہ اُمڈ پڑی ہو
میں ساگر سا اتھاز میں سے، تم میں ڈوب گیا ہوں
روحوں کی بیداری کی اس سندر اور سنسان سی شب کو کیا کہتے ہیں شہزادی!

ساحرہ زادی

بتا خیال ہے کیا تیرا ساحرہ زادی
میں تیرے بحر کا قالین ہوں یا سارابی
میں تیرے صحرا کا سینین ہوں یا پامالی
میں تیرے دشت کا آرام ہوں یا بے تابی
میں تیرے کوہ کی گونج ہوں یا بے نامی
بتا خیال ہے کیا تیرا ساحرہ زادی
پڑی ہے کیوں تیرے ماتھے پہ اوٹ بادل کی
لگی ہے کیوں تیری آنکھوں میں گوٹ کاجل کی
یہ تیرے سوتر کے منگل میں کیسا شور مچا
یہ تیرے پیالوں میں کیا جل ترنگ بجنے لگا
یہ تیری ناک میں اُجلا سا کیا لرزنے لگا
یہ تیرے کان کے چھیدوں میں کیا دھڑکنے لگا
یہ تیرے گال کیوں گل مُلا کے جلنے لگے
یہ تیری ٹھوڑی میں انگارے کیوں دہکنے لگے
بتا خیال ہے کیا تیرا ساحرہ زادی

...ارے ارے تیری وادی میں

یہ سرود پہ

ضرب

نہ جا، نہ جا تو مجھے چھوڑ کے

اے میرے

کرب

میں تیرے سحر کے سارے اثر کو چھو تو لوں

میں تیرے مہر کے سارے عذاب سہہ تو لوں

میں اک خموشی ہوں تنہائی ہوں یا آبادی

بتا خیال ہے کیا تیرا ساحرہ زادی

خیال جان کے تیرا میں خوب سولوں گا

ترے وجود کی بانبیں میں سانپ بو دوں گا!

سابرمتی ایکسپریس میں اک رات

سابرمتی ایکسپریس میں اک رات

میں نے گزاری جلتے ہوئے شووں کی

راکھ کے ساتھ

پلیٹ فارم سنسان تھا، کوئی نہیں تھا وہاں

اسٹیشن ماسٹر، قلی، چائے بیچنے والے

سبھی

ہو گئے تھے گماں

خاموش ہو گئی تھی یقین کی گھڑی...

...پاس کے گاؤں سے اٹھ رہا تھا

ان گنت معصوم چیخوں کا دھواں...

...اچانک میں زور سے چلایا

'ہے رام'

گیان ہوا جیسے میرے بالکل قریب

بیٹھے ہوئے ہوں باپو

لاٹھی ان کے ہاتھ میں اب بھی ہے

لیکن اس میں پڑ گئی ہے درار

ناک پہ گول گول عینک

اب بھی ٹکی ہوئی ہے

لیکن شیشوں کا رنگ، چیخ کے

ہو گیا ہے لال...

باپو... باپو... باپو...

میں نے ان سے کچھ کہنا چاہا

پرنت رکھ دیا انھوں نے

میرے منہ پر ہاتھ

گویا ہوئے، لقوائی لہجے میں

آج میں گزاروں گا

اسی سابرمتی ایکسپریس میں

تمھارے ساتھ یہ رات

صبح جب پرلے ہوگی

تو دونوں ہاتھ پسارکے

ایک ہی سُر میں روئیں گے

مناجات...

ایشور، اللہ، تیرو نام

سب کو سمّتی دے بھگوان!

ہوا گجراتن تھی

زر بریدہ تھی ہوا
زخم بریدہ تھی ہوا
در بریدہ تھی ہوا
درد بریدہ تھی ہوا

ابھی گزری ہے ہوا
بس ابھی گزری ہے ہوا
ہاں اسی رستے سے تنہا تنہا
ابھی گزری ہے ہوا
بس ابھی گزری ہے ہوا...

میں نے دیکھا جو اُسے، ایسے
تو نابینا ہوا
اپنے ہونے پہ بہت زیادہ
مجھے کینہ ہوا

شب بریدہ تھی ہوا
چشم بریدہ تھی ہوا
سر بریدہ تھی ہوا
زلف بریدہ تھی ہوا

ابھی گزری ہے ہوا
بس ابھی گزری ہے ہوا...

اس کے شانوں پہ
کسی سوت کا اک تار نہ تھا
اس کی ممتا کے حراؤں پہ
کوئی بار نہ تھا

گل بریدہ تھی ہوا
شاخ بریدہ تھی ہوا
تن بریدہ تھی ہوا
جسم بریدہ تھی ہوا

ابھی گزری ہے ہوا
بس ابھی گزری ہے ہوا...

وقت مصنوعی ہے کم بخت ٹھہرتا ہی نہیں
کربلا اور کروک چھیتر کا میلا جیسے
شور اتنا ہے کہ خاموشی کوئی سنتا نہیں
اور سنے بھی تو کوئی کیسے، وہاں کوئی نہیں
پاؤں کے نیچے کوئی چھاؤں نہیں، گاؤں نہیں

دف بریدہ تھی ہوا
دار بریدہ تھی ہوا
پا بریدہ تھی ہوا
رقص بریدہ تھی ہوا

ابھی گزری ہے ہوا
بس ابھی گزری ہے ہوا...

رات کا وقت ہے
پانی کے کنارے، جانے
کتنی صدیوں کا اندھیرا سا اتر آیا ہے
اس اندھیرے میں کئی زینے ہیں، آڑے ترچھے
جن پہ پیپل کے کئی پودے بھی اُگ آئے ہیں
انھی پودوں میں کبھی نہر فرات
انھی پودوں میں کبھی سریو گھاٹ
بھیگا بھیگا ہوا جلتا سا نظر آتا ہے...

...ابھی کچھ دیر ہوئے جیسے ہوا...
جیسے جلتی تھی ہوا
اُس پہ آیا نہ ترس، تو کیا وہ ہتیارن تھی
جل رہی تھی جو ہوا، تو کیا وہ گجراتن تھی
ہوا گجراتن تھی...
ہوا گجراتن تھی...
ہوا گجراتن تھی...

ایک چٹھی

(شری کرشن جی کے نام)

ہے مادھو! میں لڑنا نہیں چاہتا
میں اپنے کروکچھیتر میں، بنا یدھ کے جینا چاہتا ہوں
دھرم، ارتھ، کام اور موکش جیسے شبد
میرے سامنے مت دہراؤ
مجھے یقین ہے کہ دونوں سینائیں آمنے سامنے کھڑی ہیں
اور یدھ آرمبھ ہونے والا ہے
لیکن کروکچھیتر کی رَن بھومی سے
سجا ہوا رتھ ضرور غائب ہو گیا ہے
ہے مادھو! میں لڑنا نہیں چاہتا
یدھ کی اس پھیلی ہوئی اننت بھومی میں
چاروں اور مجھے
اپنے ہی مِتر، گرو جن اور سمبندھی
نظر آ رہے ہیں
ہے مادھو!
میں ان کے لیے تجھ سے راجیہ مانگتا ہوں

اور اپنے لیے نیتر
میں ان کے لیے تجھ سے پھول مانگتا ہوں
اور اپنے لیے اشرو
میں ان کے لیے تجھ سے متر مانگتا ہوں
اور اپنے لیے شترو
ہے مادھو!
میں ان کے لیے تجھ سے چھما چاہتا ہوں
اور اپنے لیے نیہہ
ہے مادھو! میں لڑنا نہیں چاہتا
ان گنت شتابدیوں سے میں اسی طرح
تیرے سامنے سرنگوں کھڑا ہوا ہوں
اور میری پیٹھ سے اتہاس کے ان گنت گھوڑے
اور ہاتھی گزرتے رہے ہیں
ہے مادھو! میری پیٹھ بری طرح زخمی ہوگئی ہے
اور آج کسی نے میری پیٹھ پر
روس اور امریکہ کا بھی بھوگول تھوپ دیا ہے
افغانستان کے بچّے
پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر موت کے خیمے بنا رہے ہیں
عراق اور ایران کے بچّے اپنی زمینوں کے تیل میں
اپنے پیدا کرنے والوں کی قبریں
گنتے گنتے سو گئے ہیں
اُدھر یروشلم میں کسی نے اذان کے پر
کاٹ دیے ہیں
ادھر مسجد قرطبہ میں کسی نے سجدہ
موقوف کر دیا ہے

ہے مادھو! میں لڑنا نہیں چاہتا

ہے مادھو!
دیکھ یہ میرے ساتھ ساؤتھ افریقہ کے
ان گنت کالے بچے بھی کھڑے ہیں
جو اپنے آنسوؤں کی ڈھیریاں لے کر
تجھ سے پرارتھنا کرنے آئے ہیں
اور ہاں وہ بچے بھی میرے ساتھ ہیں جنھیں میں نہیں جانتا
جو شاید مر چکے ہیں، یا مر رہے ہیں، یا مرنے والے ہیں
میں تجھے ان سب کا واسطہ دیتا ہوں
تیری مدح سرائی کرتا ہوں
ہے مادھو! میں لڑنا نہیں چاہتا
کائر!
سر اٹھا اور دیکھ تیرے سر اٹھانے سے تیری پیٹھ سے
سارا اتہاس اور سارا بھوگول گر گیا ہے
دھنش اٹھا اور وار کر
لیکن اس بار تیرا نشانہ تیرا اپنا ہی ہر دے ہونا
طے پایا ہے
میں اپنے کروکھیتر کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے
یدھ کے ساتھ جینا چاہتا ہوں
مہابھارت کے اٹھارہ دنوں کا یدھ
کبھی سماپت نہیں ہوتا
ہر دن اس یدھ کا پہلا دن ہوتا ہے
”ہے مادھو! میں لڑنا نہیں چاہتا“

□□

صہبا وحید

صہبا وحید اردو کے اُن معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے مشاعروں میں کبھی شرکت نہیں کی، شعری نشستوں سے بے نیاز رہے لیکن ادبی رسائل و جرائد کے حوالے سے اپنی شعری شناخت قائم کی اور اہلِ نظر کو متاثر کیا۔
صہبا وحید بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی نثر نگاری تاریخی، تحقیقی، ادبی موضوعات کے گرد گھومتی ہے اور اسلامی تعمیرات ان کا خاص موضوع ہے۔ اس موضوع پر ان کی منفرد تحقیقی کتاب ''ہندی: اسلامی فنِ تعمیر'' اردو اکادمی، دہلی نے اپنی مطبوعات میں شامل کر کے ۱۹۹۵ء میں شائع کی۔ یہ کتاب اردو اکادمی، دہلی کی اہم مطبوعات میں سے ایک ہے جسے تحقیق اور فنِ تعمیر سے دلچسپی رکھنے والے اربابِ نظر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔
صہبا وحید کا خاندانی نام وحید قریشی ہے۔ یہ ۲۵ر جنوری ۱۹۳۸ء کو ناگپور کے ایک علم دوست اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ناگپور یونیورسٹی سے عمرانیات میں ایم۔ اے کرنے کے بعد اردو نیوز ریڈر کے طور پر آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے اور دہلی ریڈیو اسٹیشن سے سالہا سال تک اردو میں خبریں پڑھتے رہے۔
ریڈیو کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر اب تصنیفی کاموں میں مشغول ہیں۔ ان کا پہلا

شعری مجموعہ 'تمنا کا دوسرا قدم' (۱۹۷۰ء) میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ دوسری نثری تصنیف 'سر وادیٔ سینا' (۱۹۹۳ء) میں شائع ہوئی۔

نمونۂ کلام:

غزل

اُس سے ملنے میں بھی دن بھر کا سفر باقی ہے
دن نکلنے میں مگر ایک پہر باقی ہے

گھر جلا تو دیا اُس نے مرا لیکن پھر بھی
دیکھنے والو، ابھی رقصِ شرر باقی ہے

ہم نشینی سے شرف یاب کیا تو اُس نے
سر فرازی میں بھی اندازِ نظر باقی ہے

سحر و افسوں سے بھی حالت نہیں بدلی دل کی
جانکاروں نے کہا ہے کہ اثر باقی ہے

عشق انساں کی ضرورت ہے، نہیں مجبوری
وہ پری چہرہ سہی پھر بھی کسر باقی ہے

ہم موحد جو ہیں مرتے ہیں اُسی پر اب تک
اس کے انداز میں اندازِ دگر باقی ہے

مٹ گئی جو مرے اسلاف کی میراث تو کیا
سوچ باقی ہے ابھی دستِ ہُنر باقی ہے

ذائقہ جس کا تھا آدم کے تنزّل کا سبب
آج تک روئے زمیں پر وہ ثمر باقی ہے

کر چکے نذر سبھی کچھ تجھے ہجرت کے طفیل
زندگی تیرے لیے اب مرا سر باقی ہے

اپنی ہر بات زمانہ کو بتادی صہبا
ہاں، سنانے کے لیے ایک خبر باقی ہے

○

نئی رُتوں کی خبر بوئے یاسمین میں ہے
چلے بھی آوَ مروّت ابھی زمین میں ہے
ہوا کا قرض چکاؤں کہ آب و آتش کا
بس ایک آخری سجدہ مری جبین میں ہے
وہ آئے گا کبھی ملنے ضرور آئے گا
کسی کے عہد کی خوشبو مرے یقین میں ہے
وفا خلوص مروّت فقط ہیں مفروضے
لکھی تھیں جس نے یہ باتیں وہ تابعین میں ہے
نکالنا ہی پڑا حل انا کے قضیّہ کا
معززین میں ہم وہ اکابرین میں ہے
وہ جھوٹ جس سے بگڑتا نہیں کسی کا کچھ
سو اِتنا جھوٹ بھی جائز ہمارے دین میں ہے
خطا نہیں تھی کسی کی، خطا ہماری تھی
ہمیں نے پالا ہے اُس کو جو آستین میں ہے
مریضِ عشق کو مژدہ ، علاج ہے ممکن
سبب ہر ایک مرض کا ہماری Gene میں ہے
Clone دے گیا اپنا کہ دل بہلتا رہے
رفیقِ کار بھی میرے معاونین میں ہے
غریبِ شہر پہ دروازے بند ہیں صہبا
ہمارے نام پہ چشمک معاصرین میں ہے

○

جو عجلت میں کیا ہے کام وہ انسب نہیں ہوتا
کوئی یہ بات کیوں کہتا اگر مطلب نہیں ہوتا

ہمارے دور میں ہر کام منصوبے سے ہوتا ہے
جنم ہوتا تھا پہلے حادثہ وہ اب نہیں ہوتا
مہورت دیکھ کر ہم کام سر انجام دیتے ہیں
کہا کس نے ہمارا ماہ در عقرب نہیں ہوتا
کہیں رہ لو، نہیں ہوگا کوئی بھی پوچھنے والا
ہمارے شہر بس جاتے ہیں یونہی ڈھب نہیں ہوتا
خدا کی مہربانی سے نظامِ ملک چلتا ہے
قضیہ بیش و کم کا بھی کہاں اور کب نہیں ہوتا
نہیں ہونے پہ ہوتا ہے سبھی کچھ ملک میں یارو!
یہاں داد وستد کے واسطے منصب نہیں ہوتا
دیانت ہو کہ ایماں ہو، یہ فرسودہ تصور ہیں
جہاں دولت کی پوجا ہو، وہاں یہ سب نہیں ہوتا
سیاست میں تجارت ہو تو دشمن سے بھی ملتے ہیں
اصولی بے اصولا پن کہیں صاحب نہیں ہوتا
فریبِ آگہی ہے یاں تصور خیر و شر کا بھی
جہاں ہو فلسفہ غالب، وہاں مذہب نہیں ہوتا
گزر جائے جو اچھے سے غنیمت جانیے اُس کو
کسی کا مونس و غم خوار شہرِ شب نہیں ہوتا
ہمارے دیس کا معشوق اُس دم ناز کرتا ہے
خلل انداز تنہائی میں کوئی جب نہیں ہوتا
لبوں میں شہد، چاہِ ناف میں کافور ہوتا ہے
ہمارے دلرباؤں کے چہ غبغب نہیں ہوتا
رمیدہ خوردہ جو ہے تو نشستیں دور ہوتی ہیں
ہمارا لاکھ ہم مکتب ہو، ہم مکتب نہیں ہوتا

دکھا کر آگ کاغذ کو ہم اُس کے راز پڑھتے ہیں
اگر چہ خط کا مضموں کوئی غیر اغلب نہیں ہوتا
محبت ہم بھی کرتے ہیں، محبت وہ بھی کرتا ہے
مگر کیا کیجیے اظہار لب بر لب نہیں ہوتا
اذیت دوش و فردا کی جسے ہر روز رہتی ہے
تو ہم جیسے ملنگوں کا وہ ہم مشرب نہیں ہوتا
بُرائی پھر نہیں رہتی بُرائی عام ہونے پر
کسی کو باز خواہی کا اجارہ تب نہیں ہوتا
کہا صہبا نے بسم اللّٰہ مجرٖھاو مُرسٰھا
مری کشتی کا کیا ہوتا جو حافظ رب نہیں ہوتا

میں اپنے خون سے اک اجنبی تمثیل لکھوں گا

کسی عیّار ساحر نے فریبِ زندگی دے کر ہماری بے خبر روحوں کو
ابعادِ ثلاثہ میں مقید کر رکھا ہے
ہمیں بس ایک محور پر
ازل سے تا ابد گردش میں رہنا ہے
ہمیں بے خواب آنکھوں سے ابھرتے ڈوبتے سورج کو تکنا،
چاندنی کے زخم گِنتا
روز و شب کے جبر سہنا ہے
(ہمارا رول پہلے سے مقدر ہو چکا ہے)

اُسی عیّار ساحر نے ہماری دسترس سے دور مشرق میں
درختِ زیست پر کرّوبیوں کو

شعلہ زن تلوار کو رکھ کر ہمیں محصور رکھا ہے
کہ ہم اسرارِ خیر و شر سے واقف ہو گئے تھے

مگر بُعدِ چہارم کی ہماری جستجو اک سرکشی کے ماسوا کیا ہے
ہمارا رول پہلے سے مقدر ہو چکا ہے
تم اپنے طاقِ ابرو کو کنوارے خواب کی قندیل سے پُر نور کر دینا
میں اپنے خون سے اک اجنبی تمثیل لکھوں گا۔

تمھارا نام ہے تحریر میری آنکھوں میں

تمھارا نام ہے تحریر میری آنکھوں میں
پڑھو نوشتۂ تقدیر میری آنکھوں میں
ملے گی خواب کی تعبیر میری آنکھوں میں

تمھارے نام کے بیچ تمھارے نام کے حرف
تمھارا نام ہے تحریر میری آنکھوں میں

تمھارا نام زرِ گل کہ چاندنی کی پھوار
تمھارے نام سے مسحور وادی و کہسار
تمھارا نام ہے ظلمت پہ نور کی یلغار

تمھارے نام کے بیچ تمھارے نام کے حرف
تمھارا نام ہے تحریر میری آنکھوں میں

تمھارا نام ہے بعد از نمازِ فجر دعا
اندھیری شب میں الاؤ کے گرد اہلِ صفا
تمھارے نام کے الفاظ حمد در صحرا

تمھارے نام کے بیچ تمھارے نام کے حرف
تمھارا نام ہے تحریر میری آنکھوں میں

تمھارے نام میں کیسی ہے کیمیا اثری
تمھارے نام سے چسپیدگی ہے خودنگری
تمھارا نام ہے تحریر میری آنکھوں میں

صبح روشن ہے اگر

دستِ نازک میں گلاب
اک مرا دل
لطمۂ موجِ ہوا سے تار تار
تار تار!

سعیِ لا حاصل ہے سالوسی کا جال
خودفریبی کے سوا کچھ بھی نہیں علم و ہنر
سر جھکانا شرطِ انسب ہے رسائی کے لیے
خشک بالو سے اُگے روئیدگی
اور چراغِ آرزو جل جائے دودِ شام سے
عجز اُس کی بارگہ میں بامراد و کامیاب
دستِ نازک میں گلاب!
اک مرا دل...
دشتِ مشرق میں ہوا کی سائیں سائیں
رات کے پچھلے پہر دل میں چبھن بے نام سی
دربدر پھرتا بھٹکتا، اک ہیولیٰ
اک ہیولیٰ

"ہوشیار"

شیشۂ دل ریزہ ریزہ

ریزہ ریزہ

چارسوُ دھندلا غُبار

صبح روشن ہے اگر

واجبِ تعظیم ہے

شام کی تاریکیوں کو بھول جانا ہے بھلا!

❐❐

ضیا خورجوی

اکرام الحق ضیا خالص دہلی والے تھے۔ محلہ کیدارہ، باڑہ ہندوراؤ میں پیدا ہوئے۔ یہیں ہوش سنبھالا اور تعلیم و تربیت پائی۔ ان کی ننیہال چوں کہ خورجہ کی تھی اس لیے ''کھرے کے کھرے'' دہلی والوں میں خورجوی کہلائے جانے لگے، شاعری شروع کی تو خورجوی ان کے تخلص کا جز بن گیا۔

ابوالفضل رازؔ چاند پوری سے تلمذ تھا۔ خالص غزل کے شاعر تھے اور نوک پلک درست کر کے شعر کہتے تھے۔ بہتر شعر کہنے کے باوجود مشاعروں کی دنیا سے دور رہتے تھے۔

دہلی میں انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

رہوں اسیرِ قفس، وہ بھی عمر بھر کے لیے
یہ بات باعثِ ذلت ہے بال و پر کے لیے

ہم اس کے سائے میں پل بھر سکون پا نہ سکے
کیا تھا صرف لہو ہم نے جس شجر کے لیے

مجھے خیال یہ آیا تبسّمِ گل پر
یہ اہتمامِ خوشی عمرِ مختصر کے لیے
نہیں ہے خوف اندھیروں کا راہِ مقصد میں
چراغِ عزم ہے روشن مرے سفر کے لیے
نگاہِ شوق کی آوارگی بجا لیکن
کوئی حسین نظارہ تو ہو نظر کے لیے
کہیں ہو جشنِ چراغاں تو کیا غرض ہم کو
بس اک دیے کی ضرورت ہے اپنے گھر کے لیے
ہماری تیرہ نصیبی کا اب یہ عالم ہے
کہ اک دیا بھی میسّر نہیں ہے گھر کے لیے
ضیاؔ تم ان کو تسلی بھی دے نہیں پائے
تڑپ رہے ہیں جو بیمار چارہ گر کے لیے

○

ہم ازل سے جو رہے تا بہ عدم، آوارہ
کیا کہیں کس کے تصور میں تھے آوارہ
رہنما ہوتا نہ منزل کا تصور تو ہمیں
جانے کس راہ پہ لے جاتے قدم آوارہ
وسعتیں ہو گئیں آوارگیِ شوق پہ تنگ
اب کہاں جائیں ترے شہر سے ہم آوارہ
شوقِ سجدہ کی تڑپ اپنی جبینوں میں لیے
در بدر پھرتے ہیں کیوں اہلِ حرم آوارہ
حرف آئے نہ کوئی تیری ستم کیشی پر
ہوتے جاتے ہیں طلبگارِ ستم آوارہ

اس قدر سایۂ دیوار گریزاں کیوں ہے
تھک کے بیٹھے ہیں ذرا لینے کو دم آوارہ

کون سے دل سے گوارہ کرے یہ بات ضیاؔ
اُس کے ہوتے ہوئے جہاں میں ترا غم آوارہ

○

نفرت کی اپنے دل میں نہ دیوار کر بلند
انسان ہے تو عظمتِ کردار کر بلند

کر پیار تیرے سامنے وہ سر جھکائیں گے
تو اپنے دشمنوں پہ نہ تلوار کر بلند

جنسِ وفا کی تجھ پہ کھلے قدر و منزلت
جوہر شناس ، دیدۂ بیدار کر بلند

چومیں گے تیرے پاؤں ستاروں کی منزلیں
شوقِ سفر کا جذبۂ رفتار کر بلند

آئینہ تجھ پہ ہوں گے سب اسرارِ کائنات
ذوقِ نگاہ، چشمِ طلبگار کر بلند

محفل میں جاں نثار ہیں، پروانے سینکڑوں
اے شمعِ حسن، شعلۂ رخسار کر بلند

نظریں اٹھا کے دیکھ نظارے ہیں منتظر
کچھ تو مذاقِ دید کا معیار کر بلند

دیوانہ اپنا کہہ کے پکارے کوئی تجھے
اتنا تو اپنے عشق کا معیار کر بلند

انجامِ کج کلاہی پہ عبرت کی اک نظر
اتنی نہ کج ادائی سے دستار کر بلند

رُل جائے ٹھوکروں میں نہ یہ تاجِ خسروی
نخوت سے اپنے سر کو نہ زینہار کر بلند

اب وقت آ گیا ہے ضیاؔ سوئے دار چل
حق بات کہہ کے سر کو سرِ دار کر بلند

○

تری لاکھ ہم پہ جفا رہی، ترے لاکھ ہم پہ ستم رہے
یہ ہمارے ظرف کی بات ہے کہ امینِ عظمتِ غم رہے

نہ یہ بت کدے کی رہین ہو، نہ یہ سجدہ ریزِ حرم رہے
یہ مرے جبیں کی ہے آرزو، ترے پائے ناز پہ خم رہے

یہ مری نگاہ نے کیا کیا، ترے رُخ سے پردہ ہٹا دیا
نہ صنم کدوں میں صنم رہے، نہ حرم میں اہلِ حرم رہے

نہ وہ رنگِ رُخ سے جھلک سکے، نہ وہ چشمِ تر سے چھلک سکے
جو ترے نگاہ نے غم دیے، مرے ظرفِ ضبط سے کم رہے

یہ تمھیں بتاؤ کہ پیشتر، کبھی تم سے کوئی گلہ کیا
کبھی شکوہ سنجِ جفا ہوئے کبھی شکوہ سنجِ ستم رہے

کہاں دن وہ عہدِ شباب کے وہ جنون سر سے اُتر گیا
وہ مزاجِ عشق بدل گیا، نہ وہ دل رہا نہ وہ ہم رہے

مجھے جس نے لوٹ لیا ضیاؔ، کوئی راہزن تو نہ تھا مگر
جو میں یہ بتا دوں وہ کون تھا تو کہاں کسی کا بھرم رہے

○

کرب ہی کرب ہے تسکین کے امکاں کے قریب
پھر تری یاد کا نشتر ہے رگِ جاں کے قریب

فطرتاً عقل کو یہ بات گوارہ ہی نہیں
دستِ وحشت کی رسائی ہو گریباں کے قریب
اُن سے کہتا ہوں، جو تدبیرِ رفو کرتے ہیں
چاکِ دل بھی ہے مرے چاکِ گریباں کے قریب
فکرِ انساں کی رسائی ہے فلک پر لیکن
کاش پہنچے یہ علاجِ غمِ انساں کے قریب
اپنی ہی آگ میں اب تو اسے جلنا ہوگا
کوئی پروانہ نہیں شمعِ فروزاں کے قریب
سایہ داری پہ وہ نازاں تھا مگر میرے لیے
دھوپ ہے اُس شجرِ زود پشیماں کے قریب
عدم آباد کی منزل ہے بہت دور مگر
شام ہوتی ہے مسافر کی بیاباں کے قریب
وہ تصور کی حدوں سے ہے بہت دور تو پھر
دستکیں کون یہ دیتا ہے رگِ جاں کے قریب
اے ضیا ہم سے ہے تاریخِ زمانہ واقف
ہم نے ساحل کی بنا ڈالی ہے طوفاں کے قریب

○

کس کو یقیں آئے گا یارو، میرا مسیحا قاتل ہے
دل کے سینکڑوں ارمانوں کا، ایک اکیلا قاتل ہے
جب تک میرے خونِ دل کی، آنکھوں سے برسات نہ ہو
کیسے پیاس بجھے گی اس کی خون کا پیاسا قاتل ہے

کون سمجھ سکتا ہے اس کی فطرت کی سفاکی کو
چہرہ ہے معصوموں جیسا، بھولا بھالا قاتل ہے

شہر نگاراں میں اب اپنے جان و دل کی خیر نہیں
جو بھی نظر ہے رہزنِ دل ہے چہرہ، چہرہ قاتل ہے

زیست کے اس عالم میں اپنے قتل کا دوں الزام کسے
دن قاتل ہیں، راتیں قاتل، لمحہ، لمحہ قاتل ہے

ہلکا سا احساس ہے زخمی یہ تو ضیا کچھ بات نہیں
اوچھے وار کرے ہے ہم پر ظرف کا اوچھا قاتل ہے

□□

ضیاؔ فتح آبادی

مہرلال سونی ضیاؔ فتح آبادی علامہ سیماب اکبر آبادی کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ ۸ر فروری ۱۹۱۳ء کو فتح آباد میں پیدا ہوئے، اور ۹ر اگست ۱۹۸۶ء کو دہلی میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

ضیاؔ فتح آبادی نے معاشیات میں ایم۔ اے کرنے کے بعد بینک کی ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا اور ریزرو بینک آف انڈیا کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ملازمت کی ذمہ داریوں نے شاعری کو ادبی رسائل و جرائد تک ہی محدود رکھا۔ مشاعروں اور اس قسم کی دوسری سرگرمیوں سے دور رہنے کے باوجود اُن کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا اور ادبی حلقوں میں خاصے مشہور تھے۔

دہلی میں مستقل قیام کے بعد راجوری گارڈن جیسے غیر اردو علاقے میں "بزمِ سیماب" کے تحت ماہانہ ادبی نشستیں منعقد کر کے ضیاؔ فتح آبادی ایک طویل عرصہ تک شعر و ادب کی خاموش اور تعمیری خدمت انجام دیتے رہے۔ "بزمِ سیماب" کی ماہانہ نشستوں کا سلسلہ اُن کے انتقال کے بعد ٹوٹ گیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

جذبِ غم اور اس قدر یارو
کیوں نہ الفت کا ہو اثر یارو

اور بھی کتنی دور ہے منزل
ختم ہوگا بھی یہ سفر یارو

دن میں گزری وہ میرے دل پہ کہ پھر
چین آیا نہ رات بھر یارو

پردہ در پردہ منزلِ مقصود
پیچ در پیچ رہ گزر یارو

دل جو تھا خانۂ خدا کل تک
آج ہے وہ بتوں کا گھر یارو

موت کو ڈھونڈنے چلی ہے کدھر
زندگی ہم سے روٹھ کر یارو

بھول جاتے ہیں حادثے، دل سے
نہیں جاتی کسک مگر یارو

دل میں باقی ہے جرأتِ پرواز
کیا ضروری ہیں بال و پر یارو

لب پہ بلبل کے ہے ضیاؔ کی غزل
کھل اٹھا غنچۂ سحر یارو

○

یا زور یہاں زرداروں کا یا مذہب کے دیوانوں کا
ہاں انسانوں کی بستی میں کچھ کام نہیں انسانوں کا

اتنی پی لی، اتنا بہکے، آدابِ جنوں بھی بھول گئے
ساقی سے تقاضا کر بیٹھے نظروں کے حسیں پیمانوں کا
دنیا کی اسی دو رنگی پر آتی ہے ہنسی بھی، رونا بھی
اپنوں کی جفائیں سہتے ہیں، کرتے ہیں گلہ بیگانوں کا
شام اور سحر کی گردش سے بچ کر چلنا ناممکن ہے
لیکن دل کھا ہی جاتا ہے رنگین فریب ارمانوں کا
کیا اُن کو خبر کیا ہوتا ہے، مر کر جینا، جی کر مرنا
ساحل سے جو دیکھا کرتے ہیں منظر بپھرے طوفانوں کا
توبہ کا سہارا چھوٹ گیا، رندوں کے ارادے ٹوٹ گئے
گیسو کے بادل گھر آئے، پھر دور چلا پیمانوں کا
آئی تھیں بہاروں کی پریاں میرے خوابوں کی محفل میں
آنکھوں میں ابھی تک چھایا ہے نشہ ہنستے گلخانوں کا
حسن و الفت کے دیوانے آخر خود کو پہچان گئے
نقشہ ہی بدلنے والا صحراؤں کا ویرانوں کا
الفت کا دم بھرنے والے، مرکر زندہ ہوجائیں گے
افسانہ بنے گا دنیا میں ٹوٹے دل کے ارمانوں کا
موجوں کے تھپیڑوں سے اکثر بگڑی تقدیریں بنتی ہیں
ہم نے اپنی تدبیرون سے رُخ موڑ دیا طوفانوں کا
اِس کے شعروں سے محفل کی ظلمت کم ہوتی جاتی ہے
ملتا ہے ضیا کے پہلو میں سوزِ پنہاں پروانوں کا

○

گلریز و بادہ بار گھٹا ساونوں کی ہے
اے دستِ شوق، خیر کہاں دامنوں کی ہے
ریکھائیں لکشمن کی نہ ہیں بان رام کے
سیتاؤں پر نگاہ مگر راونوں کی ہے

ہر سمت زہر اُگلتا یہ ماحولِ بے شجر
شہروں کے آس پاس ضرورت بنوں کی ہے
خاموش شمعِ منزلِ مقصود ہے ، نہ پوچھ
جو شکل رہبروں کی وہی رہزنوں کی ہے
خود اپنی آگ ہی میں ستی بھسم ہوگئی
کیا تابِ ضبط وصبر یہ ژُو کے گُنوں کی ہے
جھکنے سے عار، ٹوٹنے کا شوق ہے جنھیں
پھندوں سے آشنائی انھیں گردنوں کی ہے
آئینے کی تو بات ہی کچھ اور ہے ضیاؔ
پتھر بھی توڑ دے وہ نظر دشمنوں کی ہے

○

چلے چلو کہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں
کسی بھی منزلِ مقصود کو دوام نہیں
بلاکشی میں مری ہاتھ موسموں کا بھی ہے
شکستِ توبہ فقط اعتبارِ جام نہیں
گھروندے ریت کے بن بن کے مٹتے جاتے ہیں
گمانِ خام خیالی، خیالِ خام نہیں
نہ گیسوؤں ہی کی چھانوں نہ عارضوں ہی کی دھوپ
یہ صبح صبح نہیں ہے یہ شام شام نہیں
زمانہ سازیِ انسان دشمنی، توبہ
رواج و رسمِ محبت کا احترام نہیں
خلا سے تا بہ خلا کور چشم اندھیرے ہیں
یہاں بھی جشنِ چراغاں کا اہتمام نہیں
کشاں کشاں چلا آیا ہوں ان کے در پہ ضیاؔ
اب اُن سے کیسے کہوں مجھ کو اُن سے کام نہیں

○

آستاں سے تیرے، اپنا سر اٹھا لے جاؤں گا
ایک دن یہ راہ کا پتھر، اٹھا لے جاؤں گا
زندگی کی رہگزر ہموار یا دُشوار ہو
بارِ غم ہر حال میں دل پر اٹھا لے جاؤں گا
میری آوارہ خرامی کے نشاں رہنے بھی دو
میں انھیں گلیوں میں پھر آ کر اٹھا لے جاؤں گا
گردشِ افلاک تھم جائے گی رُک جائے گا وقت
دشتِ وحشت میں جب اپنا گھر اٹھا لے جاؤں گا
صبح کا تھا منتظر، آئی، تو ہوں اس فکر میں
اب کہاں میں رات کا بستر اٹھا لے جاؤں گا
رہ گیا ہے اب یہی اک میرے حصّے کا ضیا
دل جو ہے ہر درد کا خوگر، اٹھا لے جاؤں گا

○

تو مان جائے گا، مرا دل مانتا نہیں
میں جانتا ہوں تو بھی مجھے جانتا نہیں
دیکھوں اٹھا کے تو نظر آ جائے جانے کون
چہرہ، مرا اب آئینہ پہچانتا نہیں
کیوں آپ پوچھتے ہیں خدارا نہ پوچھیے
کچھ تو ہے اُس کا نام مگر شانتا نہیں
اتنی سی بات اُس کی سمجھ میں نہ آ سکی
دشمن ہے، دوست میں جسے گردانتا نہیں
بجھ جائے گا یہ طاق میں جلتا ہوا دِیا
کیا ہوگا اُس کے بعد کوئی جانتا نہیں

معلوم ہے کہ بدلیں گے اک دن مرے بھی دن
کوئی نہیں ہے میرا خدا مانتا نہیں
جس پر یقین رکھتا نہ ہو دل مرا ضیاؔ
وہ بات اپنے دل میں کبھی ٹھانتا نہیں

○

اعتبار اٹھتے ہی عالم معتبر ہو جائے گا
جب خبر آئے گی انساں بے خبر ہو جائے گا
شمع ہو جائے گی اپنی آگ میں جل کر خموش
قصۂ طولانیِ شب مختصر ہو جائے گا
منزلِ مقصود کو پائے گا زیرِ نقشِ پا
وہ مسافر جو بھٹک کر راہ پر ہو جائے گا
مستقل غم دل نے چاہا تھا مگر تھی کیا خبر
درد بڑھ کر آپ اپنا چارہ گر ہو جائے گا
میرے تیرے درمیاں اک لمحے کا ہے فاصلہ
آج میرا ہے جو، کل وہ تیرا گھر ہو جائے گا
ٹھوکریں کھانے پہ بھی میں اس لیے گرتا نہیں
کون جانے میرا میں کیا ٹوٹ کر ہو جائے گا
کیا کہوں خوابِ طلسمِ شب کی کیفیت ضیاؔ
آنکھ جب کھل جائے گی، وقتِ سحر ہو جائے گا

□□

طالبؔ دہلوی

اردو دنیا میں رسالوں اور کتابوں کو اعزازی طور پر بھیجنے اور تقسیم کرنے کی روایت نے اردو کے شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور محققوں کو رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت سے محروم کر دیا ہے۔نو واردانِ ادب، شاعر و ادیب تو کجا آسودہ حال نقاد و محقق اور اکابرینِ اردو بھی اپنی زبان کے رسالے اور کتابیں خرید کر نہیں پڑھتے، لیکن مفتا مفتی کے اس دور میں بھولے بھٹکے ایسے قلم کار بھی نظر آ جاتے ہیں جو اردو رسالے، کتابیں خرید کر ہی پڑھتے ہیں۔ شیش چندر سکسینہ المعروف بہ طالب دہلوی اردو کے ایک ایسے ہی مخلص شاعر و ادیب تھے جو اردو رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھتے تھے اور نئی مطبوعات کی تلاش میں رہتے تھے۔

طالبؔ دہلوی ۱۲ر فروری ۱۹۱۰ء کو انبالہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد ماجد آنجہانی رائے صاحب مہیش داس آنریری مجسٹریٹ تھے۔ آنجہانی رائے صاحب مہیش داس دہلی کے ایک نہایت ہی متمول کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خاندانی رئیس تھے۔ طالبؔ کی تعلیم و تربیت انبالہ میں ہی ہوئی، وہیں سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے آبائی وطن دہلی آئے اور مشن کالج و ہندو کالج سے انٹر اور بی۔اے کے امتحانات پاس کیے۔ طالبؔ مشن کالج (حال سینٹ اسٹیفنز کالج) کی طالب علمی کے

زمانے سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ شاعری میں رہبری کے لیے اپنے حقیقی پھوپھا منشی راج بہادر برقؔ دہلوی کا تلمذ اختیار کیا۔

طالبؔ دہلوی ایک اچھے اور کہنہ مشق شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک عمدہ نثر نگار اور مترجم بھی تھے۔ مالی آسودگی کی وجہ سے ملازمت کے جھنجھٹ سے آزاد تھے۔ ماہنامہ آجکل، روزنامہ تیج اور امریکن رپورٹر اردو میں نوکریاں کی لیکن صرف شوقیہ اور وقت گزاری کے لیے۔ انھوں نے زندگی بھر اردو کے گیت گائے اور صلہ وستائش سے بے نیاز ہو کر اردو کی خدمت کی۔ طالبؔ نے شاعر کی حیثیت سے اردو کے شعری سرمایہ میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنے استاد جناب برقؔ دہلوی کی یاد میں دس بارہ سال تک سالانہ مشاعرے منعقد کر کے دہلی کے مشاعروں کی ایک تاریخ مرتب کی۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا قابلِ ذکر شاعر یا ادیب ہوگا جو ان مشاعروں میں شریک نہیں ہوا ہوگا یا جس نے جناب برقؔ پر کوئی مقالہ نہ پڑھا ہو۔

طالب دہلوی بہت سی نثری کتابوں کے مصنف اور مؤلف بھی تھے۔ ان کی تالیف کردہ کتابوں میں ''حرفِ ناتمام''، ''یہ تھی دہلی''، ''یادگارِ برق''، ''ہمارے حسین''، ''انوارِ نظر''، ''خدنگِ ناز''، ''کشمیر کی سیر'' اور ''خمستانِ کیفی'' شامل ہیں۔ ''رتن مالا''، سبزۂ بیگانہ'' اور ''سحرِ حیات'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ رتن مالا کی حیثیت ایک شعری انتخاب کی ہے۔ جب کہ سبزۂ بیگانہ اور ان کے مجموعۂ کلام 'سحرِ حیات' کو ان کی پہلی برسی کے موقع پر بہار برنی نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ ''یہ تھی دہلی'' طالبؔ دہلوی کی ایک مختصر مگر اہم تصنیف ہے جس میں انھوں نے ستمبر ۱۹۲۷ء سے ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء تک دہلی کے ادبی منظرنامے پر موجود شاعروں اور ادیبوں کا رواں دواں نثر میں تذکرہ کیا ہے اور اس دور کی ادبی تاریخ قلم بند کی ہے۔ ''یہ تھی دہلی'' ابتداء میں ۱۹۷۳ء میں انجمن ترقی اردو دہلی پردیش کی ایک نشست کے لیے مقالے کی شکل میں لکھا گیا تھا جس کو ادبی حلقوں کے اصرار پر طالبِ دہلوی نے اضافہ کر کے کتابی شکل دے دی۔

طالب دہلوی کا انتقال ۱۶/فروری ۱۹۷۵ء کو دہلی میں ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

محبت ماورائے کفر و دیں ہے
محبت کا کوئی مذہب نہیں ہے

بظاہر خاک کا پُتلا ہے سب کچھ
جو دیکھو غور سے، کچھ بھی نہیں ہے

سنبھلنا اے دلِ ناداں، سنبھلنا
بڑی قاتل نگاہِ اوّلیں ہے

مُکافاتِ عمل ہے بزمِ ہستی
یہیں دوزخ یہیں خلدِ بریں ہے

حقیقت حسن کی کچھ ہے تو اتنی
جو چڑھ جائے نظر میں وہ حسیں ہے

کہا جاتا ہے طالبؔ سے یہ اکثر
سخن تیرا نہایت دلنشیں ہے

○

محبت کا تجھے عرفان بھی ہے؟
محبت کفر بھی ، ایمان بھی ہے

تضادِ حضرتِ انساں نہ پوچھو
فرشتہ بھی ہے یہ شیطان بھی ہے

بہت بے ربط ہے رودادِ ہستی
اس افسانے کا کچھ عنوان بھی ہے؟

اسی کا زندگی ہے نام شاید
کچھ الجھن بھی کچھ اطمینان بھی ہے

نکالیں کس طرح حسرت کو دل سے؟
مسافر بھی ہے یہ، مہمان بھی ہے

سخن پر آپ نازاں تو ہیں طالبؔ
سخن میں آپ کے کچھ جان بھی ہے

○

بات پوچھی نہ گئی سوختہ سامانوں کی
یاد بھی آئی کبھی شمع کو پروانوں کی ؟

جنھیں فرسودہ سمجھ کر نظر انداز کیا !
احتیاج آج ہوئی ہے انھیں افسانوں کی

ہر طرف سے یہی آواز چلی آتی ہے
خود نگہباں کو ضرورت ہے نگہبانوں کی

تیری محفل میں پہنچنے کو تو ہم بھی پہنچے
خیر جانوں کی نظر آئی ، نہ ایمانوں کی

لے اُڑی بادِ صبا ان کو نہ جانے کس دیس
دھجیاں بھی نہ رہیں اب تو گریبانوں کی

کچھ اس انداز سے اپنوں نے نوازا ہے ہمیں
شفقتیں یاد بہت آئی ہیں بیگانوں کی !

کون محمل نشیں گزرا ہے یہاں سے طالبؔ
رونقیں آج سوا ہوگئیں ویرانوں کی

○

بے زبانی زبان ہو کے رہی
ہر نظر داستاں ہو کے رہی

جس پہ رکھا کبھی قدم ہم نے
وہ زمین آسمان ہو کے رہی

موت پہ کچھ نہ بس چلا اُس کا
زندگی ، بے نشان ہو کے رہی
عذر دل نے ہزار پیش کیے
وہ نظر بدگمان ہو کے رہی
ہم سمجھتے رہے اسے اک کھیل
زندگی امتحان ہو کے رہی
ان سے ملنے کی آرزو طالبؔ
میرے قالب میں جان ہو کے رہی

○

ہنسنے کا امکان نہیں ہے
رونا بھی آسان نہیں ہے
توڑ دیا دم امّیدوں نے
اب کوئی ارمان نہیں ہے
شہرِ خموشاں سے گزرا ہوں
یہ بستی ویران نہیں ہے
حیرت میں ہے دیکھنے والا!
آئینہ حیران نہیں ہے
دُکھ دینا آسان بہت ہے
دُکھ سہنا آسان نہیں ہے
مرنے پر کیا ہو؟ کیا جانے
زیست میں اطمینان نہیں ہے
طُرفہ تماشا دیکھا طالبؔ
ہے بھی ، اور بھگوان نہیں ہے

○

منہ نہ دیکھا شبِ تنہائی کا

اور دعویٰ ہے شکیبائی کا

توڑ دی حدِ تمنا آخر !

کیا کلیجہ تھا تمنائی کا ؟

آئینے نے یہ ستم کیا ڈھایا

زعم رخصت ہوا یکتائی کا

آپ بھی چشمِ تصور میں نہیں

اُف رے عالم مری تنہائی کا

بڑھ گئی اور جنوں کی وسعت

شکریہ ، بادیہ پیمائی کا

مانگ لو بڑھ کے کچھ اُن سے طالب

وقت آیا ہے پذیرائی کا

□□

ظفر ادیب

اردو شعر و ادب کی دنیا میں ظفر ادیب کے قلمی نام سے متعارف ہونے اور شہرت پانے والے بھیم سین تقسیمِ وطن سے قبل لاہور کے ایک معزز اور آسودہ حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں اور مہاجروں کے قافلے میں آسودہ حال بھیم سین کا وجود کہیں تحلیل ہو گیا اور لٹا پٹا شاعر ظفر ادیب اپنی ہجرت کی منزل تک پہنچا جہاں اُس نے زندہ رہنے اور آسودہ حالی کی سیماؤں کو دوبارہ چھونے کے لیے چھوٹی چھوٹی ٹیوشنز کا سہارا لیا، مختلف اخبارات و رسائل کے دفتروں میں کام کیا، اپنا ایک ادبی ماہنامہ ''ماحول'' جاری کیا لیکن دہلی شہر کی گلیوں، کوچوں میں ٹیوشنز اُس کا مقدر بن چکی تھیں اور آسودہ حالی پھر کبھی پلٹ کر نہیں آئی۔

ظفر ادیب جنابِ احسان دانش کے لائق شاگرد تھے اور آزادیِ وطن سے قبل پنجاب کے اچھے شاعروں میں گنے جاتے تھے لیکن ہجرت ان کو راس نہیں آئی۔ نامساعد حالات، تنگ دستی اور غربت نے ان کی پوری شخصیت کو بجھا کر رکھ دیا تھا اور وہ دہلی کی شعری و ادبی دنیا میں ماضی کی ایک پرچھائیں بن کر رہ گئے تھے۔ ظفر ادیب کو نظم و نثر پر کما حقہ دسترس حاصل تھی انھوں نے نظم و نثر میں بہت لکھا لیکن افسوس ان کی شعری اور نثری کاوشیں

مجموعوں کی شکل نہ دیکھ سکیں اوران کے انتقال کے بعد وارثین کی اردو سے عدم واقفیت اور شعروادب سے دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے وہ تمام ادبی اثاثہ ضائع ہوگیا۔

نمونۂ کلام:

○

ہمیں بھی بخشے ہیں صبح و مسا کیا
کہیں ہم بھی تجھے اپنا خدا کیا
بھنور اندر بھنور میں پہونچی کشتی
بچالیں گے خدا اور نا خدا کیا
نہیں اب آشیاں بھی گلستاں میں
ہوئی تھی اِن بہاروں کی دُعا کیا
وہ کرتا ہوں ظفر جو کہتا ہے دل
نہیں وہ میں کہ سوچوں ہے روا کیا

○

تسلیم کہ جلوے عام نہیں، لیکن وہ ظلمت بھی تو نہیں
اے بدظن ساتھی آج فضا اتنی پُرہیبت بھی تو نہیں
عنوان وہی ، افسانہ وہی، ایسا ہوتو میں بھی کہہ دوں
گلشن میں مگر وہ پہلی سی وحشت کیا حیرت بھی تو نہیں
ہاں جانتا ہوں اب بھی لاکھوں بے حال و بے مستقبل ہیں
افلاس بھی ہے بے حالی بھی غم ہی غم قسمت بھی تو نہیں
امید کی شمعیں جاگ اُٹھیں محفل کی تاریکی سوئی
کم کم ہے اُجالا ہے تو سہی بالکل یاسیّت بھی تو نہیں

□□

ظفر تابش

ظفر تابش پرانی دہلی کی گلیوں اور کوچوں میں پروان چڑھنے اور چھوٹے چھوٹے گمنام چائے خانوں کی میزوں سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کرنے والے شاعروں کی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ۱۹۷۰ء کے دہے میں اپنے لہجے کی توانائی کے ساتھ مستقبل کی بہتر شاعری کی نقیب بن کر ابھری۔

ظفر تابش ۷ ۲ر اگست ۱۹۵۷ء کو پیدا ہوئے۔ گھر کے نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیم دسویں جماعت سے آگے نہیں بڑھی۔ تعلیم کی کمی، گھر کا غیر ادبی اور کرخنداری ماحول تخلیقی صلاحیتوں کو ہمیشہ کے لیے میٹھی نیند سلا دینے کے لیے کافی تھا، لیکن ظفر تابش کی تخلیقی صلاحیتیں شعرفہم دوستوں کی رفاقت میں پنپیں اور منیر ہمدم، رؤف رضا، شہباز ندیم ضیائی جیسے باصلاحیت نوجوان شاعروں کی مسلسل صحبتوں سے شعر کہنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ شاعری شروع کی تو کسی کو باقاعدہ استاد نہیں بنایا۔ دوستانہ مشوروں کی رہنمائی میں شعری سفر طے کر رہے ہیں۔

ظفر تابش کے اب تک دو شعری مجموعے "گرم ریت کا سفر" (۱۹۹۳ء) اور "پورے چاند کا سفر" (۲۰۰۰ء) شائع ہو چکے ہیں جو اردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے منظرِ عام پر آئے۔

نمونۂ کلام:

غزل

سانولی زلفوں کی چادر تان کر
موم کے جسموں پہ اک احسان کر

دھوپ کی تھالی میں بیٹھا اک کسان
کھا گیا سورج کو روٹی جان کر

خشک ہو جائے گا دریا ایک دن
بادلوں کو اپنے گھر مہمان کر

میں کئی ہاتھوں میں جا کر بٹ گیا
جوڑ دے مجھ کو مری پہچان کر

○

اک طلسمی سا وہ منظر گر پڑا
میرے ہاتھوں سے سمندر گر پڑا

میں سکوتِ شب میں الجھا ہی رہا
اک ستارہ میرے اندر گر پڑا

میں نے پوچھا جب پہاڑوں کا مزاج
جسم سے میرے مرا سر گر پڑا

اک سنہری دھات کا ٹکڑا ملا
جس کو چھوتے ہی گداگر گر پڑا

دیکھنے نکلا تھا وہ خود کو مگر
آئینوں کے گھر میں جا کر گر پڑا

○

وہ ابھی اُڑان میں ہے کیا
اب بھی امتحان میں ہے کیا
بار بار چونکتا ہوں میں
کوئی اِس مکان میں ہے کیا
اے خدا تُجھی تو ہے مرا
تو بھی آسمان میں ہے کیا
ایک پل جو مجھ سے کھوگیا
وہ تری امان میں ہے کیا
ڈر رہا تھا بارشوں سے جو
اب بھی سائبان میں ہے کیا
میں ابھی تلک مرا نہیں
تیر ابھی کمان میں ہے کیا

○

پھر ایک بچہ ہے رونے والا
پھر آگیا ہے کھلونے والا
وہ ایک قطرہ تھا بارشوں کا
ہماری کشتی ڈبونے والا
میں جس کا صدیوں سے منتظر تھا
وہ ایک لمحہ ہے کھونے والا
شفق بجھا کر چلا گیا ہے
فضا میں موتی پرونے والا
جتن ہزاروں کیے گئے تھے
ہوا وہی جو تھا ہونے والا

○

مرے خیال کو کتنے سوال دیتا ہے
وہ ایک بچہ جو سورج اُچھال دیتا ہے
سفید دھوپ جب اس کا بدن نہیں سُنتا
وہ اپنی آنکھ سمندر میں ڈال دیتا ہے
طلسم کار کہیں یا کہیں فقیر اُس کو
ہتھیلیوں سے جو منظر نکال دیتا ہے
نہ جانے کون سا منظر اُسے ڈراتا ہے
وہ بات بات پہ سکّہ اچھال دیتا ہے
سمندروں کے سفر سے وہ کیا پلٹ آیا
ہر ایک بات پہ اپنی مثال دیتا ہے

○

درپن سے ڈرتے ہو بھائی
ایسا کیوں کرتے ہو بھائی
بیٹی رخصت بھی کرتے ہو
آنکھیں بھی بھرتے ہو بھائی
ایسا کیا کر بیٹھے ہو تم
نیندوں میں ڈرتے ہو بھائی
میں تو اکثر مرجاتا ہوں
کیا تم بھی مرتے ہو بھائی
کیوں اِس گھر کے آنگن میں تم
دیواریں دھرتے ہو بھائی

ظفر مرادآبادی

خودتشہیری اور ادبی رابطۂ عامہ۔کے اس دور میں بہت سے اچھا شعر کہنے اور خوبصورت شاعری کرنے والے شاعروں، ان کی خاموش مزاجی، بے نیازی، کم گوئی اور قلندری نے شعروادب کی دنیا بیک بینچر (Back Bencher) بنادیا ہے اور اس منزل تک نہیں پہنچنے دیا جس کی ان کی شاعری مستحق ہے۔محمد شفیق ظفر مرادآبادی ان ہی شاعروں میں سے ہیں جونوک پلک درست شعر کہتے ہیں۔عمدہ شاعری کرتے ہیں لیکن اپنی کم گوئی، خاموش مزاجی اور شاعرانہ قلندری کی وجہ سے دہلی کے شعری منظرنامہ کی پچھلی صفوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

ظفر مرادآبادی ۷ارستمبر ۱۹۵۱ءکومرادآباد میں ایک علمی اور دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد جناب محمد عتیق صاحب حافظ قاری تھے اور دینی تعلیم کی تدریس سے وابستہ تھے۔ظفر مرادآبادی نے خالص دینی ماحول میں تعلیم پائی۔تقریباً پندرہ سال کی عمر سے شاعری شروع کی اور جناب قمر مرادآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔

سولہ سترہ سال کی عمر سے دلّی میں مقیم ہیں اور بڑی خاموشی سے شعروادب کی خدمت کررہے ہیں۔ذریعۂ معاش یہی شعروادب کی خدمت ہے لیکن مشاعروں میں بہت کم جاتے ہیں۔دہلی میں رہتے ہوئے ظفر مرادآبادی نے اپنی تعلیم پر بہت توجہ دی اور پرائیویٹ طور پر مختلف امتحانات پاس کرتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور ”اردو

غزل کی بنیادی قدریں'' کے موضوع پر تحقیقی کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔
ظفؔر مرادآبادی ایک نہایت ہی شریف اور مرنجاں مرنج انسان ہیں۔ خوب سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں اور تحت میں پڑھتے ہیں۔ اب تک ان کے دو شعری مجموعے'' فرازِ ہنر'' (۱۹۸۶ء) اور'' اسرارِ فن'' (۲۰۰۰ء) شائع ہو چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

تیر، سوزِ یک نفس، فتراک کی اوقات کیا
صید عالم ہے، تو مشتِ خاک کی اوقات کیا

ہیں مصر سب اپنے اپنے جہل کی تائید میں
خود سروں میں صاحبِ ادراک کی اوقات کیا

ہے تصادم سے، شرارے ہی اُڑانا ان کا شوق
پتھروں میں دیدۂ نم ناک کی اوقات کیا

دور تک پھیلی ہوئی ہیں وحشتیں ہی وحشتیں
برسرِ صحرا، گریباں چاک کی اوقات کیا

عکس ہیں جب آئینہ خانے میں سارے منجمد
رائگاں سب، جرأتِ بے باک کی اوقات کیا

ہو قناعت، خطۂ دو گز زمیں بھی ہے بسیط
پُر ہوس نیت میں ہفت افلاک کی اوقات کیا

وہ محاسب ہے بڑا، جانچے گا پل پل کا حساب
سامنے اس کے، کسی چالاک کی اوقات کیا

جل گیا برقِ جنوں سے گلشنِ ہستی تمام
کیا متاعِ آشیاں خاشاک کی اوقات کیا

کیا ترس کھائیں، جو لاشوں پر کھڑے ہیں اے ظفؔر
مقتلوں میں، خوں چکاں پوشاک کی اوقات کیا

○

ظلمتِ غم سے، نہ شب کی تیرگی سے خوف کھا
دوست بن کر جوڑ سے، اس روشنی سے خوف کھا
حرمتِ اسلاف ہے، اس بند مٹھی کی اساس
اپنی رسوائی سے ڈر، دستِ تہی سے خوف کھا
آج کل دو دھار کی تلوار ہیں الفاظ بھی
جادوئی لہجے کی حملہ آوری سے خوف کھا
سازشوں نے رُخ پہ ڈالے ہیں بہت دلکش نقاب
وقت کی معصوم صورت، سادگی سے خوف کھا
تو ! مری بربادیوں پر کس لیے ہے مطمئن،
مشتعل کب ہو؟ مری دیوانگی سے خوف کھا
بغض فطرت آنکھ میں، تیرا کھٹکتا ہے وجود
مصلحت آمیز کینہ پروری سے خوف کھا
تجھ کو تیری گم رہی، دنیا سے اوجھل کر نہ دے
بکھری بکھری اب تو اپنی بے حسی سے خوف کھا
تیرے لہجے میں سمٹ آئی ہے کڑواہٹ بہت
زہر جو بن جائے ایسی شاعری سے خوف کھا
تنگ دل کوئی اگر، فیاض ہو جائے، تو ڈر!
اے ظفر کم ظرف کی دریا دِلی سے خوف کھا !!

○

نہ تھی ہماری خطا، اعتراف کیا کرتے
تھے بے گناہ، تو منصف معاف کیا کرتے
کوئی نہ تھا جو یہاں اپنا جائزہ لیتا
ہر آئنے سے ہمیں گرد صاف کیا کرتے

نہ گفتگو کا سلیقہ ، نہ کاٹ لہجے میں
سماعتوں میں سخن ور ، شگاف کیا کرتے

خلا نورد تھے ، اس دور میں ہم اہلِ جنوں
ہمارے گرد بگولے طواف کیا کرتے

سپردِ طاق تھے ، ہر گھر میں شاہکارِ حیات
حفاظت اُن کی اکیلے غلاف کیا کرتے

سبھی تھے اہلِ نظر ، اک حصار تک محدود
اُترتے تہہ میں تو پھر انکشاف کیا کرتے

مری طرح جنھیں معنی کی جستجو بھی نہیں
حصارِ لفظ میں وہ اعتکاف کیا کرتے

اذّیتیں جنھیں دیتی ہوں راحتوں کی نوید
ترے ستم سے کبھی اختلاف کیا کرتے

وہ اپنی فکر میں زندہ ہے حرف حرف ظفرؔ
حریفِ فن بھی ، کچھ اس کے خلاف کیا کرتے!!

○

دلِ حزیں پہ ، چمن کی فضا نے طنز کیا
مذاق اُڑایا گلوں نے ، صبا نے طنز کیا

پڑا جو وقت ، کیا شرمسار سجدوں نے
اُٹھائے ہاتھ ، تو مجھ پر دعا نے طنز کیا

شکستِ زیست پہ تھی ، حوصلوں کی خندہ زنی
گمانِ ہستی ہوا ، تو قضا نے طنز کیا

پڑی ہے ماند ، چمکتے ہُنر کی زیبائش
سخن وری پہ مری ، خوش نوا نے طنز کیا

لباس ہوتے ہوئے بھی چھپی نہ عریانی
کھلا جو پھول، تو چاکِ قبا نے طنز کیا
نہیں یہ ظلم، ملے سب سے زخمِ رسوائی
ستم تو یہ ہے، کہ دردآشنا نے طنز کیا
عجب غرور پسندی ہے اس کی فطرت میں
جہاں چراغ جلایا، ہوا نے طنز کیا
تھے ذرّے ذرّے میں روشن ہزار آئینے
ہر آئنے پہ ترے نقشِ پا نے طنز کیا
یہ سانحہ بھی قیامت سے کم نہیں ہے ظفرؔ
کہ مجھ پہ میری شکستِ انا نے طنز کیا!!

○

ساری خوش فہمی، شعور و فلسفہ پانی ہوا
وہ اُدھر بولے، اِدھر میرا کہا پانی ہوا
بھیگتے لہجے میں کیا کرتے کوئی اظہارِ حال
لب سے جو نکلا وہی حرفِ دعا پانی ہوا
تجھ سے مل کر گم ہوئے خود اپنے خدوخال بھی
میں، کہ جیسے برف تھا، تو نے چھوا پانی ہوا
شعر میں ممکن نہیں، تعریف اس کے حسن کی
دیکھ کر جس کا سراپا، آئینہ پانی ہوا
سارے لاینحل مسائل ہاتھ ملتے رہ گئے
میں سجا کر اپنا پندارِ اَنا پانی ہوا
یوں ہی آنکھوں میں نہیں آ جاتے آنسو دوستو!
درد کا احساس جب حد سے بڑھا پانی ہوا
الاماں! اے خود فریبی، المدد! خوش فہمیو
اب کسے آواز دوں، سر سے سوا پانی ہوا

ہم نے بالآخر وفا کی لاج رکھ لی دوستو!
لیکن اس جہدِ عمل میں خون کا پانی ہوا

عمر بھر جستجو تنکوں کی صورت بہہ گئی
کھو گئیں سمتیں ظفرؔ جب راستہ پانی ہوا

○

شعور و فکر کے ایسے عتاب ٹوٹتے ہیں
کھلے بغیر ہی دل کے گلاب ٹوٹتے ہیں

تہی ہو جیب، بکھرتے ہیں سارے منصوبے
حساب رکھتے ہوئے بے حساب ٹوٹتے ہیں

لہو لہو نظر آتی ہے دل کی ویرانی
سجے سجائے جب آنکھوں سے خواب ٹوٹتے ہیں

سکوتِ لب پہ ہے وہ نغمگی، کہ جس کے لیے
سخن کے رِدم، نوا کے رباب ٹوٹتے ہیں

ترے وجود سے ہوتی ہے جب شناسائی
تمام عمر کے سب انتساب ٹوٹتے ہیں

نفس نفس، یہ بکھرتی حیات کے منظر
ہوا کے لمس سے جیسے حباب ٹوٹتے ہیں

لبوں سے لفظ نکلتے ہیں آگ کی صورت
جب آگہی کے مری آفتاب ٹوٹتے ہیں

سرِ شعور ملے ہیں ملامتوں کے ہجوم،
جب اعتماد، سرِ انتخاب ٹوٹتے ہیں

حقارتوں کی زمیں دفن بھی نہیں کرتی
ظفرؔ جب اہلِ کرم کے عذاب ٹوٹتے ہیں!!

□□

ع۔ حامد

اردو اخبارات و رسائل کے شعری حصّے میں غزلوں کی بہتات اور مشاعروں میں غزل کے اشعار پر داد وستائش کا سیلاب گواہ ہیں کہ غزل اردو والوں کے مزاج میں رچ بس گئی ہے اور غزل اپنی مخصوص ہیئت کی وجہ سے مقبولیت کی انتہا کو پہنچ کر اردو شاعری کی ایک ایسی پہچان بن گئی ہے، جس کے بغیر اردو شاعری کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اگر چہ غزل کی کسوٹی پر پورا اترنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں لیکن غزل گوئی کی وجہ سے مشاعروں میں پذیرائی، اشعار پر داد وستائش، سامعین کے ذہنوں پر چھا جانے اور پسند کیے جانے کا جادو شاعروں کو غزل کے سحر سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔ اس لیے ہر نووارد بساطِ شاعری غزل سے شاعری شروع کرتا ہے اور پھر غزل ہی کا ہو رہتا ہے۔ لیکن ۱۹۶۰ء کے آس پاس دلّی کے شعری منظر نامے پر ابھرنے والا ع۔ حامد ایک ایسا شاعر ہے جس نے عام شعری روش پر چلنے اور غزل میں قافیہ پیمائی کرنے کی بجائے نظم گوئی سے اپنا شعری سفر شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دلّی کے شعری وادبی حلقوں میں اپنی ایک پہچان پیدا کر لی۔

دہلی کی شعری وادبی دنیا میں ع۔ حامد بن کر ابھرنے والے عبدالحامد کی پیدائش ۴ راپریل ۱۹۴۲ء کو دلّی میں ہوئی۔ ان کے والد عبدالحمید صاحب قصبہ ڈاسنہ (ضلع غازی آباد) کے رہنے والے تھے اور نقلِ مکانی کر کے دلّی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ عبدالحمید صاحب ایک ماہر آہنگر تھے۔ ان کا شعر وادب سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ع۔ حامد کو

شعری روایت ننھیال سے ملی۔ ان کے نانا جناب صابر دہلوی، جن کا چند برس پہلے کراچی میں انتقال ہوا، ایک اچھے غزل گو شاعر تھے۔ ع۔ حامد نے خراد کی مشینوں پر اپنے باپ کے ساتھ زندگی کی ابتدا کی لیکن مشینوں سے پنجہ کشی کرتے ہوئے تعلیم جاری رکھی اور دلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ ع۔ حامد کی شاعری کی اصل محرک خراد کی مشینوں پر ڈھلتے ہوئے لوہے سے نکلنے والی وہ چنگاریاں ہیں جنھوں نے سولہ سترہ سال کی عمر میں اسے شعر کہنے پر مجبور کر دیا۔

ع۔ حامد نے شاعری کے ابتدائی دور میں جناب شمیم کرہانی اور کالج کی تعلیم کے دوران جناب جاوید وششٹ سے مشورۂ سخن کیا۔ خوبصورت، مختصر اور موثر نظمیں کہنے کے باوجود ع۔ حامد اپنی شاعری سے بے پرواہ ہے اور ادبی رسائل میں چھپنے چھپانے کا قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری دلّی کے ادبی حلقوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

نمونۂ کلام:

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ماں جب مر جاتی ہے
اور باپ کا سایہ سر سے اٹھ جاتا ہے
تب اُن کے اپنے بچّے
چھوٹی چھوٹی باتوں پر اڑ جاتے ہیں
آپس میں لڑ جاتے ہیں
اپنے اپنے لہو کا رنگ سب الگ الگ بتاتے ہیں
اور لڑتے لڑتے خود بھی ایک دن
زیرِ زمیں ہو جاتے ہیں
ایسا کیوں ہوتا ہے ــــــ؟
کچھ اکھڑ لڑکے اپنے بوڑھے باپ کے بوڑھے ہاتھوں سے
جنگی جوہر لے لیتے ہیں

اور بوڑھے باپ کی بوڑھی چھاتی پر
اپنی عقل کے لمبے لمبے نیزے لے کر
چڑھ جاتے ہیں، خود کو فاتح کہلاتے ہیں
ایسا کیوں ہوتا ہے ـــــ؟
ماں جس بچے کو اپنی چھاتی سے اپنا لہو پلاتی ہے
جس کی خاطر اکثر گیلے میں سو جاتی ہے
جس کا آنچل اس کے سر پر سایہ بن کر چھا جاتا ہے
وہ بچہ اک دن روپ نگر میں جا کر کھو جاتا ہے سو جاتا ہے
اور ماں کی ممتا کو تڑپاتا ہے
ایسا کیوں ہوتا ہے ـــــ؟

حلفیہ بیان

سنگ کس سمت سے آیا ہے نہیں یاد مجھے
کس نے دامن مرا کھینچا تھا گریباں کس نے
نام میں کس کا بتاؤں
کوئی پہچان بتاؤں کیسے
میں جہاں ہوں وہاں خود مرے سوا کوئی نہیں
سنگ کس سمت سے آیا ہے نہیں یاد مجھے۔

میرے بعد

خواب میں دیکھا کہ میں مر گیا ہوں اور لوگ
آ گئے میرے قریں میرے بعد
یہ جاننے کے واسطے

میں کون تھا کیوں مر گیا کیا تھا سبب
کچھ یہ کہتے تھے کہ تھا دل کا مریض
کچھ یہ کہتے تھے پریشاں حال تھا مجبور تھا لاچار تھا
کچھ یہ کہتے تھے کہ عاشق تھا کسی دلگیر کا
کچھ یہ کہتے تھے نہیں بس کچھ نہیں
آئی قضا اور مر گیا

ہاں
جو میرے احباب تھے میرا اپنا خون تھے
دم بخود تھے اس لیے
وہ اگر بولیں کہیں
راز سب کھل جائیں گے
یہ پتہ چل جائے گا
میں کون تھا کیوں مر گیا کیا تھا سبب
خواب میں دیکھا کہ میں مر گیا ہوں اور لوگ
آ گئے میرے قریں میرے بعد ــــــ!

گریز

تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ پریشاں ہوں میں
میں ہی دنیا میں اسیرِ غم و آلام نہیں
چاک دامن ہیں یہاں چاکِ جگر ہیں کتنے
لوگ کتنے ہیں یہاں کاوشِ پیہم کا شکار
رام کتنے ہیں جنھیں وقت نے بن باس دیا
اور وہ بن باس کہ میعاد نہیں ہے جس کی

منتظر جن کا نہیں کوئی بھی دشرتھ افسوس
ساتھ لکشمن بھی نہیں قربتِ سیتا بھی نہیں
اور لب پر بھی نہیں حرفِ شکایت کوئی
کیسے ممکن ہے وہ جیتے ہیں مگر جیتے ہیں
پرسشِ غم نہ کرو زخم ہرے ہوتے ہیں
دیکھو دیکھو مرے ہونٹوں پہ ہنسی ہے دیکھو
دیکھو آنکھوں میں مری اشک نہیں ہے کوئی
مرے چہرے پہ نہیں کوئی تھکن کے آثار
مرے ماتھے پہ شکن ہے نہ مرے لب پہ فُغاں
تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ پریشاں ہوں میں

دُکھیارا

اَن گنت چہرے پہ چوٹیں سر سے لہو بہتا ہوا
آنکھ میں آنسو لیے
خود سے تھا سہما ہوا
جسم پر جو کچھ تھا اُس کے
بس برائے نام تھا
خوں میں ڈوبا ہوا
پا بہ برہنہ بھاگتے اُس کو یہ کہتے سنا
کیا کروں کس سے کہوں کس سے چاہوں منصفی
میری جانب بڑھتی ہوئی سنگ بکف اس بھیڑ میں
مرا اپنا خون بھی ہے ہاتھ میں پتھر لیے
اَن گنت چہرے پہ چوٹیں سر سے لہو بہتا ہوا۔

عابدؔ کرہانی

بچے شعوری اور غیر شعوری طور پر ماں، باپ کی عادت و اطوار اور مزاج کا اثر ضرور قبول کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ شمیم کرہانی جیسے معتبر شاعر کے گھر میں جہاں ہمعصر شاعروں، ادیبوں کی آمد و رفت رہتی ہو، شعری نشستیں جمتی ہوں، شب و روز شعر و شاعری کا چرچا رہتا ہو، گھر کا کوئی فرد یا بچہ یہ اثر قبول نہ کرتا، چنانچہ گھر کے جواں سال صاحبزادے سیّد عابد اختر نے آٹھ دس برس کی عمر میں ہی یہ اثر قبول کر لیا اور اس کم عمری میں مصرعے موزوں کرنے شروع کر دیا لیکن جب ۱۹۷۴ء میں باقاعدہ شاعری شروع کی تو عابدؔ کرہانی بن کر دلّی کی شعری دنیا میں ابھرا۔

عابدؔ کرہانی ۲۹/اگست ۱۹۵۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے اسکولوں، کالجوں میں تعلیم پائی اور دہلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ حکومتِ ہند کی وزارتِ اطلاعات و نشریات کی انڈین انفارمیشن سروس سے وابستہ ہیں اور آج کل ماہنامہ ''آجکل'' کے مدیر ہیں۔ جناب شمیم کرہانی نے عابدؔ کی شعری تربیت کی۔ عابدؔ مشاعروں کی دنیا سے دور رہتے ہیں اور ادبی رسائل و جرائد کے اوراق پر اپنی شاعری کی خوشبو بکھیرتے ہیں۔

عابد کا شعری مجموعہ ''خواب آشنا'' زیرِ طبع ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

بزرگوں کی دعائیں ساتھ رکھنا
بڑی لو ہے ، ردائیں ساتھ رکھنا
کبوتر اُڑ رہے ہیں آروز کے
تجسّس ، فاختائیں ساتھ رکھنا
ذہانت، بردباری ، انکساری
سفر میں خادمائیں ساتھ رکھنا
گندھا ہے جن سے مل کر تیرا بچپن
وہ برگد کی جٹائیں ساتھ رکھنا
ڈبو دیتی ہیں جو قوموں کو پل میں
نہ وہ رنگیں قبائیں ساتھ رکھنا
مجھے جنت میں گر رکھنا الٰہی
مدینے کی ہوائیں ساتھ رکھنا
بھلے ہی وہ جدا ہوجائیں عابدؔ
مگر دل سے نہ جائیں ، ساتھ رکھنا

○

ذہن و دل میں بسی ہیں دیواریں
جانے کب سے کھڑی ہیں دیواریں
دھوپ اترے بھی کیسے آنگن میں
ہر طرف تو کھڑی ہیں دیواریں
صحن میں ایک بھی نہیں دیوار
ذہن میں اٹھ رہی ہیں دیواریں

دو سگے بھائیوں کا جھگڑا ہے
فیصلہ کر رہی ہیں دیواریں

میرا چہرہ مجھے دکھاتی ہیں
آئنہ بن گئی ہیں دیواریں

کچی مٹی کے میرے گھر کے لیے
آندھیوں سے لڑی ہیں دیواریں

کان دھر کر سنو کہ صدیوں کی
داستاں کہہ رہی ہیں دیواریں

ایسی دیواریں سامنے ہیں مرے
جن کے پیچھے کھڑی ہیں دیواریں

میرا قد بھی بہت بڑا ہے مگر
میرے قد سے بڑی ہیں دیواریں

عابد اڑنے کا خواب کیا دیکھیں
ہر طرف تو کھڑی ہیں دیواریں

○

روز اخبار میں قسمت کا لکھا پڑھ پڑھ کر
لوگ اب گھر سے نکلتے ہیں دُعا پڑھ پڑھ کر

دیکھ کر تجھ کو، یہ احساس ہوا ہے مجھ کو
قسمتیں لکھتا ہے، چہروں کو خدا پڑھ پڑھ کر

کیسے آسیب نے اس شہر کو آگھیرا ہے
لوگ دیتے ہیں دوائیں بھی دعا پڑھ پڑھ کر

ہم وہ تحریر جسے لکھا ترے ہاتھوں نے
مت ہمیں چھوڑ تو اپنے سے جدا پڑھ پڑھ کر

بس گئی اُس میں یہ کس پاکؐ بدن کی خوشبو
آتی ہے بادِ صبا، صلِّ علیٰ پڑھ پڑھ کر
ہم نے حق کے لیے جاں دینے کا فن سیکھا ہے
قصہّ معرکہٗ کرب و بلا پڑھ پڑھ کر
تجھ کو بھی ہجر کی تحریر ستاتی ہوگی
میں بھی بے چین ہوں یادوں کا لکھا پڑھ پڑھ کر
آج کے دور کے سفاک چلن والے ہم
دنگ ہیں، تذکرہٗ مہر و وفا پڑھ پڑھ کر
دل بھی کھنچتا ہے گناہوں کی طرف عابدؔ کا
ڈر بھی لگتا ہے گناہوں کی سزا پڑھ پڑھ کر

○

تیغ رکھتے ہیں، نہ ہم تیر و تبر رکھتے ہیں
ہاں یزیدوں سے نہ جھک پائے وہ سر رکھتے ہیں
بے خبر لوگوں کو احساس نہیں ہے اس کا
جو خبر والے ہیں، ہر شئے کی خبر رکھتے ہیں
چھوٹی کوڑی کے نہیں ہیں یہ مگس جیسے لوگ
صرف انسان کے زخموں پہ نظر رکھتے ہیں
کوئی یارانِ شریعت سے یہ جاکر پوچھے
پہلے دل رکھتے ہیں سجدے میں کہ سر رکھتے ہیں
ہے کوئی ہم میں، جو تھکتا نہیں چلتے چلتے
گھر میں رہ کر بھی ہم احساسِ سفر رکھتے ہیں
آندھیاں اس کو گلے آکے لگا لیں شاید
اک دیا اور سرِ راہ گزر رکھتے ہیں

بوجھ سر پر لیے پھرنا نہیں آتا ہم کو
جو مسائل ہیں ہمارے، انھیں گھر رکھتے ہیں

ایک پت جھڑ سا لگا رہتا ہے ہر دم دل میں
ہم جو سینے میں یہ احساسِ شجر رکھتے ہیں

نیند جب ہم کو ستاتی ہے بہت میداں میں
اپنی کھینچی ہوئی تلوار پہ سر رکھتے ہیں

آئے جو قتل کے درپے ہے مقابل آئے
ہم بھی سینے کو سدا اپنے سپر رکھتے ہیں

بد دعاؤں کا نہیں ہوگا اثر کچھ عابدؔ
ہم بزرگوں کی دعاؤں کا اثر رکھتے ہیں

○

دشت میں چھاؤں کوئی ڈھونڈ نکالی جائے
اپنی ہی ذات کی دیوار بنالی جائے

یہ تو ممکن ہے کہ دیوار گرادیں، لیکن
کیسے گرتی ہوئی دیوار سنبھالی جائے

ڈھونڈنا ہوگا خد و خال کی دنیا میں جسے
پہلے اس شخص کی تصویر بنالی جائے

دل ہو فیاض تو بس ایک ہی در کافی ہے
کیا ضروری ہے کہ ہر در پہ سوالی جائے

تم جو بولے تو ملی ذوقِ انا کو تسکین
مجھ کو ڈر تھا، مری آواز نہ خالی جائے

لکھ دیں ہم ہر در و دیوار پہ عابدؔ لیکن
بات ایسی ہے کہ سینے میں چھپالی جائے

○

جب بھی اپنے سر سے اپنا قد ہوا لگنے لگے
مت سمجھ لینا کہ تم سب کو خدا لگنے لگے

تو مری آواز میں کیوں اس طرح شامل ہوا
میں کسی کو دوں صدا، تیری صدا لگنے لگے

اس کے چہرے پر جو پڑ جائے ترے چہرے کا عکس
شاخ سے ٹوٹا ہوا پتّا ہرا لگنے لگے

اس قدر نفرت ہے میرے بھائیوں کے ذہن میں
میرے حق کا زہر بھی ان کو دوا لگنے لگے

ماں! ترے ممتا بھرے ہونٹوں میں وہ تاثیر ہے
بد دعا بھی تیرے ہونٹوں کی، دعا لگنے لگے

دیکھ کر ہم کو کبھی منہ پھیرتے ہیں خوف سے
اس کا مطلب ہے کہ ہم بھی آئینہ لگنے لگے

وقت اچھا ہو تو دشمن سایہ بن کر ساتھ دے
وقت پڑ جائے تو سایہ بھی جدا لگنے لگے

میں نے شیشوں کی تجارت اس لیے تو کی نہ تھی
پتھروں کو خود مرا چہرا بُرا لگنے لگے

عام رستے سے ذرا ہٹ کے عابدؔ فکر کی
اور تم سب سے الگ، سب سے جدا لگنے لگے!

□□

عادل اسیر دہلوی

غزل پرستی اور غزل پسندی کے اس مجموعی ادبی دور میں غزل سے اپنا شعری سفر شروع کر کے کسی دوسری صنفِ شاعری کو اپنانا یا کسی مسلسل نظر انداز کیے جانے والے میدان کے لیے اپنی تمام تر شعری اور تخلیقی صلاحیتیں وقف کر دینا اپنے شاعرانہ وجود کو نفی کرنے سے کم نہیں۔ لیکن دلّی کے گلی کوچوں سے ابھرنے والا عادل اسیر ایک ایسا ہی شاعر ہے جس نے غزل سے اپنا شعری سفر شروع کیا، نغمۂ خیام کے نام سے عمر خیام کی رُباعیوں کا اردو میں منظوم ترجمہ کر کے فارسی پر دسترس اور اردو میں زبان و بیان پر مکمل قدرت کا ثبوت دیا، مختلف اصنافِ شعری میں تجربے کیے لیکن اس سمت میں مزید سفر کرنے کی بجائے اپنی تمام تر شاعرانہ اور تخلیقی صلاحیتوں کو ادبِ اطفال کی جانب موڑ دیا اور مولانا اسماعیل میرٹھی، شفیع الدین کی طرح بچوں کے لیے تعلیمی، تربیتی نظمیں لکھنے اور اصلاحی ادب تخلیق کرنے کے لیے وقف کر دیا۔

عادل اسیر جن کا خاندانی نام محمد عادل ہے ۲۱ر ستمبر ۱۹۵۹ء کو دلّی میں عبدالحکیم صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں تعلیم سے عدم دلچسپی اور نامساعد گھریلو حالات کی وجہ سے عادل اسیر نے صرف نویں جماعت تک ہی اسکول میں تعلیم پائی لیکن نجی

طور پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ فارسی، عربی، ہندی اور پنجابی میں دسترس حاصل کی اور زبانوں کے مختلف امتحان پاس کر کے آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ شاعری کا شوق فارسی، عربی اور ہندی سیکھنے کے دوران ہوا۔ مخمور سعیدی کی سرپرستی نے اس شوق کو جلا بخشی۔ غزلیہ شاعری میں اگرچہ عادل اسیر کا مزاج اردو شاعری کی عظیم الشان کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہے لیکن اس کی اصل پہچان ادبِ اطفال کے حوالے سے ہے۔ عادل اسیر نے بچوں کے ادب میں کچھ تجربے کر کے ہمہ اصناف شاعر ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

رُباعی اردو شاعری کی ایک مشکل صنف ہے اور ہر شاعر رُباعی کہہ کر اپنے آپ کو آزمائشوں میں نہیں ڈالتا لیکن عادل اسیر نے ''بچوں کی رُباعیاں'' نامی مختصر سے مجموعے میں بچوں کے لیے سبق آموز رُباعیاں نظم کر کے ایک کامیاب تجربہ کیا ہے۔ اسی طرح عادل اسیر نے بچوں کے لیے نعت گوئی میں طبع آزمائی کی ہے اور سہل زبان میں عقیدت سے بھرپور رواں دواں نعتیں لکھی ہیں۔ دوہے ہندی شاعری کی ایک مشکل صنف ہے اور اردو میں خال خال شاعروں نے ہی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن عادل اسیر نے ''بچوں کے دوہے'' نظم کر کے ایک کامیاب تجربہ کیا ہے۔

عادل اسیر کی اب تک تقریباً چالیس کتابیں بچوں کے ادب سے متعلق شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے بیشتر کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

میرے جینے کی سزا ہو جیسے
زندگی ایک خطا ہو جیسے
دل کے گلشن سے گزر جاتی ہے
یاد اک بادِ صبا ہو جیسے

یوں خیالوں میں چلے آتے ہو
کوئی پابندِ وفا ہو جیسے
یاد ہے تجھ سے بچھڑنے کا سماں
شاخ سے پھول جدا ہو جیسے
اپنی باتوں پہ گماں ہوتا ہے
تو نے کچھ مجھ سے کہا ہو جیسے
اُس سے مل کر ہوا محسوس اسیرؔ
وہ مرے ساتھ رہا ہو جیسے

○

غم ہی غم ہیں خوشی کے پردے میں
موت ہے زندگی کے پردے میں
آرزوئیں سسکتی رہتی ہیں
میری تشنہ لبی کے پردے میں
کار فرما ہیں حادثے لاکھوں
میری دریا دلی کے پردے میں
اب تمناؤں کے حسیں طائر
ہیں مری بے کسی کے پردے میں
کس کی خوشبو چمن چمن ہے اسیرؔ
کون ہے روشنی کے پردے میں

○

جہاں شراب کا میں نے گلاس دیکھا ہے
غمِ حیات تجھے بدحواس دیکھا ہے
جو انکسار ہے میرا حجاب آلودہ
ترے غرور کو بھی بے لباس دیکھا ہے

کسی امیر کا کیف و سرور یاد آیا
کسی غریب کو جب بھی اُداس دیکھا ہے
ہمیں فریب دیا ہے اُس آدمی نے ضرور
جسے ذرا سا بھی چہرہ شناس دیکھا ہے
مری حیات سے واقف نہیں قلم میرا
کہ شاعری نے فقط اقتباس دیکھا ہے

○

اپنے ہی دل کی بات سے مہکا گیا ہوں میں
اپنے ہی روح و جسم میں گھلتا گیا ہوں میں
ایسی ہی کچھ کشش ہے جو ہوں فرشِ خاک پر
ورنہ بلندیوں سے بھی اونچا گیا ہوں میں
اے عشق راہِ دوست ہے دشوار تر بہت
یعنی نگاہِ ناز میں آیا، گیا ہوں میں
ہر چہرہ آئینہ ہے نگاہوں کے سامنے
ہر آئینے کے قلب میں دیکھا گیا ہوں میں
مقصد ہر اک نگاہ کا میری نظر میں تھا
کیا کیا فریبِ دوست ہیں بتلا گیا ہوں میں
پھر کوئی بات میری صبا لے کے اُڑ گئی
خوشبو کی طرح پھولوں سے اُڑتا گیا ہوں میں
یا تو ترے شباب کو پہنچی نہیں نظر
یا وسعتِ خیال سے گھبرا گیا ہوں میں
ہر ابتدائی مرحلہ پیشِ نظر بھی تھا
کیا ہے مآلِ عشق یہ سمجھا گیا ہوں میں
اشعار میرے تیرے تصور کا جذب ہیں
جیسے تیرے خیال سے ملتا گیا ہوں میں

○

وہ بزم کہاں اور یہ دریوزہ گری
لے جائے گی مجھ کو مری آشفتہ سری
دیوانے نے تاویل کوئی پیش نہ کی
ہونے کو تو الزام سے ہو جاتا بری
اک دیو نے قصے میں ڈرایا تھا مجھے
پھر رات کو سپنے میں چلی آئی پری
پتھر کو بھی دیکھا تو چمک پھوٹ پڑی
سیکھی ہے کہاں تو نے یہ آئینہ گری
اے خلوتیِ حسن کبھی پردہ اٹھا
اے عشقِ جنوں خیز کبھی پردہ دری

بے تاب ہے دنیا مرے نغموں کے لیے
سنتا نہیں فریاد یہاں تو ہی مری

□□

عارفؔ دہلوی

منشی شمس العارفین عارفؔ دہلی کی مشہور کرخندار برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں باڑہ ہندوراؤ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۰۰ء میں ۹۳ سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

ابتدائے شاعری میں حضرت آغا شاعر قزلباش کا تلمذ اختیار کیا۔ ان کے انتقال کے بعد جناب رازؔ چاند پوری اور حضرت ابر احسنی گنوری جیسے مسلم الثبوت اساتذۂ فن سے فیض حاصل کیا۔ ایک زمانے میں مشاعروں کے مقبول شاعر تھے لیکن تقسیمِ وطن کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر خانہ نشینی اختیار کر لی تھی اور شعری و ادبی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ کم گو تھے یہی وجہ ہے کہ طویل ادبی زندگی کے باوجود صرف ایک ہی شعری مجموعہ ''حسنِ بیان'' اردو دنیا کو دے سکے۔

نمونۂ کلام:

غزل

مجھے دو جام دینا، یہ اشارہ کردیا، دو ہیں
اُٹھا کر انگلیاں دو، میں نے ساقی سے کہا، دو ہیں

ابھی بھر جائے گا، اک ایک کر کے سارا میخانہ
ابھی تو بھیڑ کم ہے، لا پلا دے ساقیا، دو ہیں

خدا کو مانتا ہے اور کوئی بت پرستی کو
ہے منزل ایک، لیکن راستے اس کے جدا، دو ہیں

نجومی نے بتایا، ہے بلا کا سامنا مجھ کو
شرارت سے وہ میرے کان میں کہنے لگا، دو ہیں

مریضِ عشق ہوں میں، یعنی اک میں، ایک مرا دل ہے
نہیں ہے تیسرا کوئی ابھی درد آشنا، دو ہیں

سرِ راہِ گزر احساسِ تنہائی ہوا مجھ کو
چمک کر میری پرچھائی نے مجھ سے کہہ دیا، دو ہیں

مکمل فردِ عصیاں پیش کرنی ہے قیامت میں
ہمارے دونوں کاندھوں پر نمائندہ خدا، دو ہیں

الٰہی منزلِ مقصود پر میں خیر سے پہنچوں
بڑی مشکل یہ ہے راہِ طلب میں رہنما، دو ہیں

کسی نے جب کہا عارفؔ ترا ساتھی نہیں کوئی!
مرا ہمزاد بولا ایک میں ہوں، اب بتا، دو ہیں

○

آشنا مجھ سے ہر اک حورِ جناں پہلے سے ہے
جنّتی ہوں میرا جنّت میں مکاں پہلے سے ہے

آگ سینے میں محبت کی نہاں پہلے سے ہے
گو نظر آتا نہیں لیکن دھواں پہلے سے ہے
سینکڑوں موجود ہیں مشتاقِ دیدِ روئے دوست
ان کی محفل میں ہجومِ عاشقاں پہلے سے ہے
کیا دکھاؤں میں اُسے اپنا کلیجہ چیر کر
کب یقیں آئے گا اُس کو بدگماں پہلے سے ہے
تیرا وحشی کیا کرے گا اپنا دامن تار تار
جوشِ وحشت میں گریباں دھجیاں پہلے سے ہے
یوں مجھے تکنے نہ دیتا فصلِ گل میں باغباں
وہ تو یوں کہیے چمن میں آشیاں پہلے سے ہے
دیکھتی ہے چار تنکے بھی کڑک کر غور سے
آشیاں کی فکر میں برقِ تپاں پہلے سے ہے
درد کی شدت ہے دل میں یا الٰہی خیر ہو
ابتدائے عشق ہے یا امتحاں پہلے سے ہے
بزم میں عارفؔ کی کیوں ہوتی ہے یہ آؤ بھگت
غالباً اس پر نگاہِ دوستاں پہلے سے ہے

○

ہاں یہ سچ ہے کہ وہ ہر دل میں مکیں ہوتا ہے
یہ غلط ہے، کہ وہ ہوتا ہی نہیں ، ہوتا ہے
تیرا ہی حسن نمایاں ہے ہر اک انساں میں
ہر بشر میں تیرے ہونے کا یقین ہوتا ہے
اور بڑھ جاتا ہے کچھ شوقِ طلب رہرو کا
جب مسافر کوئی منزل کے قریں ہوتا ہے

حسن کیا چیز ہے نظروں کا فریب رنگیں
دیکھیے شوق سے جس کو وہ حسیں ہوتا ہے
چپکے چپکے جو ہوا کرتی ہیں دل سے باتیں
دل کے پردے میں کوئی پردہ نشیں ہوتا ہے
اس کے دیدار کا ہر شخص طلبگار نہ ہو
سامنے سب کے کوئی پردہ نشیں ہوتا ہے
جیسے مرجھائی ہوئی سی ہو کلی گلشن میں
عشق میں ایسا ہر اک قلبِ حزیں ہوتا ہے
منہ سے اقرار کرو، ہاں تو کہو، بولو تو
وصل کا وعدہ اشاروں سے کہیں ہوتا ہے
شاہ بھی ہیں اسی دنیا میں گدا بھی عارفؔ
کوئی سائل تو کوئی تخت نشیں ہوتا ہے

○

پہنچے جو منزلِ مقصود پہ پکّے نکلے
رہ گئے وہ جو تیری راہ میں کچّے نکلے
دیکھ کر مجھ کو عدو بزم سے پھوٹے، نکلے
جن کو میٹھا میں سمجھتا رہا کڑوے نکلے
بھیڑ میں اب غمِ دنیا کے پھنسا ہوں میں بھی
میں بھی نکلوں گا کوئی اور تو سرکے، نکلے
ناخدا نے تو پھنسا دی تھی بھنور میں کشتی
نام جب ہم نے خدا کا لیا کیسے نکلے
یہ ملا مجھ کو میری دشت نوردی کا صلہ
مدتوں بعد میرے پاؤں سے کانٹے نکلے

پھر وہ جاتے ہیں بہت دور کسی اور طرف
تیرے عاشق وہ جو بتخانے سے نکلے، نکلے

توبہ کرتے رہے پیتے بھی رہے ہاتھ کے ہاتھ
بادہ کش ساقیا میخانے کے سُرتے نکلے

سب سے آگے تھے جو کل اُف رے تغیر کہ وہی
آج دنیا کی ہر اک دوڑ میں پیچھے نکلے

نقص عارف تھا پرکھ میں کہ حقیقت تھی یہی
جس قدر سکّے کھرے دیکھے تھے کھوٹے نکلے

□□

عاشق دہلوی

عبدالمجید عاشق دہلوی ۱۵ رمئی ۱۹۱۶ء کو دہلی کے ایک تجارت پیشہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں استاد بیخود دہلوی کے شاگردِ رشید جناب عبدالحمید صاحب فدا خالدی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۴۳ء سے باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا۔ ایک زمانے تک سنجیدہ شاعری کرکے دہلی کے مشاعروں میں زبان و بیان کی گلابیاں لٹاتے رہے لیکن ۱۹۷۵ء کے بعد طنز و مزاح کو اپنالیا اور آخر وقت تک طنزیہ مزاحیہ شاعری ہی کرتے رہے لیکن اس میدان میں اپنی کوئی پہچان نہیں چھوڑ سکے۔ ایک زمانے میں عاشق مرحوم کا یہ شعر دہلی کی ادبی دنیا میں ان کی پہچان بن گیا تھا:

دل مٹ گیا تو دل کی تمنا کا ذکر کیا
بس مدّعا بھی ختم ہوا مدّعی کے ساتھ

عاشق دہلوی صاحب نے ۱۴ر مارچ ۱۹۸۷ء کو وصال پایا۔ ان کا کوئی مجموعۂ کلام نہیں چھپ سکا۔

نمونۂ کلام:

غزل

چشمِ عرفان و آگہی کی قسم
ہر طرف تو ہے بندگی کی قسم

ذرّے ذرّے میں تجھ کو دیکھا ہے
ذرّے ذرّے کی روشنی کی قسم

چوٹ کھاتا ہوں مسکراتا ہوں
اپنی مجبور زندگی کی قسم

جب وفا کا جواب تلخ ملے
کون کھائے گا دوستی کی قسم

ہر نفس میں کوئی غزل خواں ہے
سازِ دل کی شکستگی کی قسم

اب ترا غم ہے دل کو وجہ نشاط
اپنی روٹھی ہوئی خوشی کی قسم

ساغر و جام ہیں تری آنکھیں
تیرے رِندوں کی میکشی کی قسم

اب تو بھر دیجیے مرا دامن
آپ کو شانِ خسروی کی قسم

ہم تو دانستہ لُٹ گئے عاشق
اُن نگاہوں کی سادگی کی قسم

○

ایسا تو کائنات میں کوئی بشر نہیں
جس پر تمھارے لطف و کرم کی نظر نہیں

جس حادثے نے آپ کو ہم سے ملا دیا
اُس حادثے کی آپ کو شاید خبر نہیں

اب تو ہر ایک گام پہ تم میرے ساتھ ہو
اب مجھ کو فکرِ گردشِ شام و سحر نہیں

نقشِ قدم پہ آپ کے رکھتا ہوں میں نظر
اِس کے سوا تو کوئی مرا راہبر نہیں

بس آرزو یہی ہے ترا غم نصیب ہو
دل میں ہمارے آرزوئے سیم و زر نہیں

اہلِ خرد کی بات کا عاشق یقین کیا
ویسے بھی ان کی بات کوئی معتبر نہیں

○

نظر کیا خاک مانوسِ جہانِ رنگ و بو ہوگی
جو تم ہوگے مرے دل میں تو پھر کیا آرزو ہوگی

وہ دنیا کون سی ہوگی وہ عالم کون سا ہوگا
محبت جس جہاں میں کار فرما کو بہ کو ہوگی

جنھیں ملتی نہیں پینے کو تیری مست آنکھوں سے
اُنھی رِندوں کو ساقی حسرتِ جام و سبو ہوگی

ازل ہی سے متاعِ عاجزی مجھ کو میسّر ہے
خدا سے دور وہ ہوگا خودی کی جس میں بو ہوگی

ہے تذلیلِ محبت حالِ دل اُن سے بیاں کرنا
میں عاشق ہوں مری صورت سے شرحِ آرزو ہوگی

○

مسکراؤ کہ غم کے سائے ڈھلیں
آ بھی جاؤ کہ حادثات ٹلیں

ناقدین وسیلۂ منزل
دو قدم تو کسی کے ساتھ چلیں

روشنی دور دور تک پہنچے
آنسوؤں کے اگر چراغ جلیں

تم بساطِ نظر پہ چھائے رہو
حادثے چاہے پھر ٹلیں نہ ٹلیں

جادۂ ارتقا پہ عقل و جنوں
مصلحت یہ ہے ساتھ ساتھ چلیں

جن عناصر سے دل عبارت ہے
اب وہ شاید چراغ بن کے جلیں

راز وہ راز ہی نہیں عاشق
جو دلِ کائنات میں نہ جلیں

○

ہو عطا صہبائے غم کا اور پیمانہ ابھی
تشنگی باقی ہے میری پیرِ میخانہ ابھی

آئے خلوت میں نہ یارب کوئی بیگانہ ابھی
سن رہے ہیں وہ ہمارے غم کا افسانہ ابھی

رو دیے سن کر جسے وہ مختصر تمہید تھی
درد میں ڈوبا ہوا باقی ہے افسانہ ابھی

میری قسمت کا بدل جانا تو کچھ مشکل نہیں
جوش میں آئی نہیں شانِ کریمانہ ابھی

دل تو پہلی ہی نظر میں کر چکے ان پر نثار
جان بھی دے دیں کہ باقی ہے یہ نذرانہ ابھی
انکشافِ رازِ ہستی غیر ممکن تو نہیں
ہوش میں آیا نہیں ہے تیرا دیوانہ ابھی
جو رضائے دوست کو رکھتا نہیں پیشِ نظر
عشق کے مسلک سے ہے عاشق وہ بیگانہ ابھی

○

اک وہ ہیں جو کفر بکیں تو نعرہ ہے اور تالی ہے
اک ہم ہیں جو سچ بولیں تو ڈنڈہ ہے اور گالی ہے
چرتی ہے اغیار کے سبزے دیتی ہے گھر اپنے دودھ
میں اُس چرواہے کے صدقے بھینس یہ جس نے پالی ہے
موسم یوں تو بدل رہا ہے خزاں کے ڈیرے ڈالے ہیں
ساون کے جتنے اندھے ہیں ان کے گھر ہریالی ہے
عشق کرو تو ہوش میں آ کر آ گا پیچھا بھی دیکھو
ہے کس طرّم خاں کی بیٹی کس رستم کی سالی ہے
جس کو دیکھو وہ اپنے کو شاعر سمجھے بیٹھا ہے
میں غالب ہوں یہ مومن ہے وہ مولانا حالی ہے
حسن کٹیلا ہو تو اس کے مرزا جی بھی عاشق ہیں
حسن وہ چاہے امریکن ہے یا کوئی بنگالی ہے

□□

(صوفی) عبدالحیؔ جوہر دہلوی

صوفی عبدالحیؔ جوہر دہلوی کا خاندانی نام کشور عرف چُنّتا تھا۔ یہ ۱۹۰۱ء میں پرانی دہلی کے محلہ رودگراں میں ایک قدیمی ہندو خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آنجہانی شری گوردھن کا گرچہ شعر و ادب سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا لیکن نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی سے گھریلو مراسم تھے اور بے تکلف آنا جانا تھا۔ کشور عرف چُنّتا کو شطرنج اور بلیئرڈ کا شوق تھا، استاد سائلؔ دہلوی بھی شطرنج کے شوقین اور بلیئرڈ کے ایک بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ شطرنج اور بلیئرڈ کا شوق کشور عرف چُنّتا کو درِ سائلؔ پر کشاں کشاں لے جاتا۔ دوسرے لوگ استاد سائلؔ سے غزلوں پر اصلاح لیتے۔ زبان و بیان کے رموز سیکھتے لیکن یہ ان سے شطرنج کی چالیں اور بلیئرڈ کی باریکیاں سیکھتے۔ استاد سائلؔ سے بلیئرڈ کی باریکیاں اور رموز سیکھ کر کشور عرف چُنّتا اس کھیل کے کمال کو پہنچے اور دہلی اسٹیٹ بلیئرڈ چمپئن بنے لیکن سائلؔ صاحب کی صحبتوں اور روزانہ کی حاضر باشی نے کشور عرف چنّتا کے باطن میں چھپے ہوئے شاعر کو بھی جگا دیا۔ استاد سائلؔ نے نہ صرف اپنے تلامذہ میں شامل کیا بلکہ جوہر تخلص تجویز کر کے کشور جوہرؔ دہلوی بنا دیا۔

دہلی والا ہونے اور استاد سائلؔ جیسے زبان داں شاعر کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے جوہرؔ دہلوی کو زبان و بیان پر تو دسترس حاصل تھی لیکن ان کے لا اُبالی پن اور

بلیئر ڈ سے غیر معمولی شغف ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری کو مقامی مشاعروں سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ممکن تھا کہ ان کی شاعری اسی ڈگر پر چلتی رہتی اور یہ مشاعروں میں پسند کی جانے والی روایتی شاعری ہی کرتے رہتے لیکن نومبر ۱۹۶۱ء میں ان کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا اور بھینسوڑی شریف کے حضرت شاہ عبدالعزیز میاں سجادہ نشین حضرت شاہ حسن میاںؒ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوکر عبدالحیٔ جوہر دہلوی ہو گئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز میاںؒ نے جوہر کے پیروں میں زنجیر ڈالنے کے لیے نہ صرف اپنے سلسلے میں بیعت کیا بلکہ کچھ عرصہ بھٹی میں تپا کر اپنے سلسلے کی ذمہ داریوں کا جوا بھی کاندھوں پر رکھ دیا۔ عبدالحیٔ جوہر دہلوی اس سلسلے سے وابستہ ہونے کے بعد دنیاوی چیزوں سے بے نیاز ہو گئے۔ بلیئر ڈ اور مشاعروں کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور شاعری اس طرح ترک کی کہ ان کی شاعری خود ان کی زندگی میں قصۂ پارینہ بن گئی۔

صوفی عبدالحیٔ جوہر دہلوی کا انتقال ۲رجنوری ۲۰۰۰ء کو دہلی میں ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق تدفین آگرہ میں ہوئی۔

نمونۂ کلام:

غزل

اللہ رکھے سوزشِ دل سوزِ جگر کو
پہلو میں لیے پھرتا ہوں میں برق وشرر کو

کیوں کر نہ دعا دیں ترے جلووں کے اثر کو
حاصل ہے سکوں قلب کو، تسکین نظر کو

انداز ملے جو لب و عارض کو تمھارے
غنچے کو میسّر نہ وہ حسنِ گلِ تر کو

وہ دولتِ کونین کو ٹھکرانے لگا ہے
کیا بخش دیا آپ نے بربادِ نظر کو؟

حاصل ہوں جسے اُس رُخِ رنگیں کے نظارے
کیا جانے وہ نظارۂ انوارِ سحر کو
پھر زلف بدوش آئے سرِ شام وہ جوہرؔ
پھر ماند کیا روشنیِ نجم و قمر کو

○

مریضِ ہجر کی کب التجا نے کچھ نہ کیا
دعائیں کام تو آئیں دوا نے کچھ نہ کیا
بجا ہے یہ بھی، ہوا خونِ آرزوائے دوست
درست یہ بھی ہے، رنگِ حنا نے کچھ نہ کیا
دل و جگر پہ ہزاروں قیامتیں ڈھائیں
غلط کہ اس نگہِ فتنہ زا نے کچھ نہ کیا
ہر اک کی بحرِ حوادث میں دستگیری کی
مرے لیے ہی مرے ناخدا نے کچھ نہ کیا
پڑھا کے مجھ کو سبق ضبط و آہ کے جوہرؔ
یہ کیا کیا مرے پاسِ وفا نے کچھ نہ کیا

○

الگ ہیں دونوں جہاں سے تمھارے دیوانے
کسے تمیز ہے اتنی کہ ان کو پہچانے
مئے نشاط سے سرخوش تمام محفل ہے
وہ چشمِ مست لُٹاتی ہے آج میخانے
حدیثِ عشق کا مفہوم ہم سمجھتے ہیں
جو بوالہوس ہے بھلا وہ یہ بات کیا جانے
تری نگاہِ تلوّن مزاج کے صدقے!
گھرے ہوئے ہیں بڑی الجھنوں میں دیوانے

وفورِ غم سے پریشاں ہیں آج قلب و جگر
چھلک نہ جائیں کہیں زندگی کے پیمانے

کسے میں رہبرِ منزل بناؤں اے جوہر
جنابِ خضر بھی ہیں رہبری سے بیگانے

○

تمنائے بنائے آشیاں کچھ اور کہتی ہے
مگر ہمدم نگاہِ آسماں کچھ اور کہتی ہے

یہ میری سادگی ہے تیرے وعدے کا یقیں کرلوں
مگر ظالم تری طرزِ بیاں کچھ اور کہتی ہے

نہ یہ فرہاد کا قصہ، نہ یہ مجنوں کا افسانہ
ترے بربادِ غم کی داستاں کچھ اور کہتی ہے

بہاروں میں نہایت مطمئن ہیں گلستاں والے
اگر کچھ فکر فرمائیں خزاں کچھ اور کہتی ہے

خدا محفوظ رکھے آشیاں والوں کا سرمایہ
تڑپ کر آج برقِ بے اماں کچھ اور کہتی ہے

معاذ اللہ جوہر بے خودیٔ عشق کا عالم
نظر کچھ اور کہتی ہے زباں کچھ اور کہتی ہے

○

گلہ بے سود ان کی بے رُخی کا
شریکِ غم نہیں کوئی کسی کا

کوئی سرشار، کوئی تشنہ لب ہے
یہ کیا دستور ہے ساقی گری کا

بسا اوقات میرے دل کی دھڑکن
پتا دیتی ہے تیری برہمی کا

چلو دو گھونٹ پی لو تم بھی ناصح
بھروسہ کیا حیاتِ عارضی کا
ہلاکِ جستجو دوست ہوں میں
نشاں ملتا نہیں ہے دوستی کا
دلیلِ التفاتِ حسن کہیے
ذرا سا مسکرا دینا کسی کا
حسد کی گرم بازاری ہے جوہر
زمانہ اب کہاں ہے دوستی کا

○

دل ہے کچھ یوں کسی کا دیوانہ
شمع پر جیسے کوئی پروانہ
کر گیا دو جہاں سے بیگانہ
ایک تیری نظر کا پیمانہ
لا پلا اوک سے مجھے ساقی
میں ہوں رسمِ کہن سے بیگانہ
پھر تری بارگاہ میں لایا
شوقِ عرضِ نیاز مندانہ
تو، کہ مجھ سے یہ بے رخی توبہ
میں، کہ تیری نظر کا دیوانہ
شوق لے کر چلا تو ہے جوہر
راس آئے ہوائے میخانہ

□□

عبیدالرحمٰن

یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء کو مظفرپور (بہار) کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں متولد عبیدالرحمٰن بنیادی طور پر سائنسی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد ایم بی بی ایس ڈاکٹر اور مظفرپور کے مشہور سول سرجن تھے۔ عبیدالرحمٰن نے گھر کے مخصوص تعلیمی مزاج اور ماحول کے مطابق سائنس کی تعلیم حاصل کی اور علمِ حیوانات میں ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری لے کر آج کل حکومتِ ہند کی وزارتِ زراعت کے محکمہ آئی۔ سی۔ اے۔ آر میں ٹیکنیکل آفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔

طالب علمی کے زمانے میں شعر و ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی جو وقت کے ساتھ شعرگوئی میں تبدیل ہوگئی۔ شاعری میں حضرتِ حفیظ بنارسی کے شاگرد ہیں اور ۱۹۸۰ء کے بعد شعری منظرنامے پر ابھرنے والے شاعروں میں اپنی ایک خاص پہچان رکھتے ہیں۔

''آواز کے سائے'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۱ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

خزاں موسم میں بھی دل کو اگر شاداب رکھنا تھا
تو پھر ویران آنکھوں میں سنہرے خواب رکھنا تھا
اندھیری رات کا مشکل سفر آسان ہو جاتا
نظر میں جلوۂ خورشیدِ عالم تاب رکھنا تھا
جو کچھ پانا نہیں تھا صرف کھونا تھا مقدر میں
عبث نادان دل کو اس قدر بے تاب رکھنا تھا
بنامِ فصلِ مستقبل چھڑکنا تھا لہو دل کا
زمین بنجر سہی پھر بھی اسے شاداب رکھنا تھا
بلا سے ٹوٹ جاتا اپنے دل کا شیشۂ نازک
مگر ہم کو خیالِ خاطرِ احباب رکھنا تھا
اجالے کا تصور بھی اجالے کی بشارت ہے
اندھیرے گھر میں کوئی کرمکِ شب تاب رکھنا تھا
ارادوں کی بلندی نے سہارا دے دیا دل کو
عبیدؔ اپنا قدم ہم کو سرِ مہتاب رکھنا تھا

○

جو آنے والے دنوں کو گلاب دیکھنا ہے
تو آؤ طے یہ کریں اب سے خواب دیکھنا ہے
وہ اور ہوں گے جنھیں انتخاب دیکھنا ہے
ہمیں تو بھائی فقط انتساب دیکھنا ہے
ہمارا، صرف ہمارا بیان ہو جس میں
کتابِ عشق میں اک ایسا باب دیکھنا ہے

حساب اپنے گناہوں کا کیوں رکھیں جب کہ
ہمیں ترا کرمِ بے حساب دیکھنا ہے
ہوس، غرور، رقابت، فساد، بے چینی
ہمارے بچوں کو کیا کیا عذاب دیکھنا ہے
جو سانس لیجیے تو فرحت جو چھوڑیے تو سکوں
وہ دور آئے گا کب یہ جناب دیکھنا ہے
نفس نفس میں ہو خوشبو محبتوں کی عبیدؔ
تمام عمر یہی ایک خواب دیکھنا ہے

○

وہی دماغ میں دل میں نظر میں رہتا ہے
چراغ بن کے ہر اک رہ گزر میں رہتا ہے
نہ جانے کون سا پل دور کر دے منزل سے
یہ ایک خوف ہمیشہ سفر میں رہتا ہے
اسی کو آگ لگانے کا فن بھی آتا ہے
بجھا کے آگ جو اکثر خبر میں رہتا ہے
اسی سے راہ کھلی ہے نجات کی اکثر
وہ ایک خیر کا پہلو جو شر میں رہتا ہے
نہ جانے کیسی یہ بے تابیاں ہیں ساتھ مرے
سکوں سفر میں نہ اب مستقر میں رہتا ہے
اسی سے راحتِ جاں ہے سکونِ دل بھی عبیدؔ
خیال و خواب کی صورت جو گھر میں رہتا ہے

○

ہوا ہے جب سے تعصب زدہ نظر کا چراغ
حصارِ ظلمتِ شب میں ہے سب کے گھر کا چراغ

جو خوش نگاہ تھے ٹھہرے وہ معترف میرے
کہ میرے ہاتھ میں روشن رہا ہنر کا چراغ

ارادے جس کے جواں ہیں نظر ہے جس کی حسیں
اسی کے واسطے جلتا ہے رہ گزر کا چراغ

کوئی اندھیرا مرا دل بجھا نہیں سکتا
تمھاری یاد بنی ہے مرے سفر کا چراغ

غرور جن کو بہت ہے اڑان پر اپنی
جلا نہ ڈالے کہیں ان کو بال و پر کا چراغ

مرے لہو سے بہاروں کی آبرو ہے عبیدؔ
مری نوا سے فروزاں ہر اک جگر کا چراغ

○

منزلیں اور بھی ہیں وہم و گماں سے آگے
ہم کو کرنا ہے سفر قیدِ مکاں سے آگے

پیکرِ شعر کو ملبوس عطا کیا کیجیے
جب تخیل کی ہو پرواز بیاں سے آگے

یہ زمیں کیسے بھلا راس ہمیں آجاتی
ہم کو جانا تھا ستاروں کے جہاں سے آگے

کب تلک دیر و حرم کی یہ حدیثِ بے سود
مسئلے اور ہیں ناقوس و اذاں سے آگے

جستجو اور ہے کچھ اہلِ جنوں کی ورنہ
کون کرتا ہے سفر جائے اماں سے آگے

کرب کو اپنے تماشا نہ بنایا جائے
ہے ادب گاہِ وفا آہ و فغاں سے آگے

نذرِ اندیشہ نہ ہو جائے کہیں زیست عبیدؔ
بات کچھ اور کریں سود و زیاں سے آگے

○

چہرے کو وہ جو اپنے اخبار کر رہا ہے
اظہار اپنے غم کا بے کار کر رہا ہے

ہر مرحلہ وہ گویا دشوار کر رہا ہے
جو واپسی پہ ہم کو تیار کر رہا ہے

بچوں کی خواہشیں ہیں اور میرا تنگ دامن
سامان میرے دُکھ کا تہوار کر رہا ہے

منزل کی جب تمنا دم توڑنے لگی ہے
تب میرا راستہ وہ ہموار کر رہا ہے

جیون ہمارا یارو اک ناؤ کاغذی ہے
لیکن سمندروں کو یہ پار کر رہا ہے

پھر قربتوں کی خواہش پلٹے گی چوٹ کھا کر
اپنی انا کو پھر وہ دیوار کر رہا ہے

ہم غم سے پا کے فرصت مرقد میں چین سے اب
ہر دن عبید اپنا اتوار کر رہا ہے

□□

عتیق اللہ

پروفیسر عتیق اللہ ۲رجولائی ۱۹۴۲ءکو اجین کے ایک تعلیم یافتہ اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مولد ومسکن میں تربیت پائی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اردو اور انگریزی میں ایم۔اے ہیں۔ ادبیاتِ اردو میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد درس وتدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ آج کل دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں اور درس وتدریس کی دنیا میں عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

عتیق اللہ بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن نقد ونظر پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اپنے مطالعے اور وجدان کی روشنی میں شعری سفر طے کررہے ہیں۔ ان کی اب تک تقریباً دس گیارہ شعری اور نثری کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں، جن کے نام یہ ہیں: ایک سوغزلیں (۱۹۷۲ء)، قدر شناسی (۱۹۷۸ء)، تنقید کا نیا محاورہ (۱۹۸۱ء)، بین کرتا ہوا شہر (۱۹۹۱ء)، آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم (۱۹۹۰ء)، تانتیا ٹوپے (ترجمہ: ۱۹۸۳ء)، ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ (۱۹۹۵ء)، پیچھے کوئی ہے (ڈراما:۲۰۰۱ء)، ترجیحات (۲۰۰۲ء)، تعصبات (۲۰۰۴ء)

نمونۂ کلام:

غزل

مرے سپرد کہاں وہ خزانہ کرتا تھا
سلوک کرتا تھا اور غائبانہ کرتا تھا

عجیب اُس کی طلب تھی، عجب تھا اسپ سوار
کہ ملک و مال کی پروا ذرا نہ کرتا تھا

اٹھا رکھا تھا اسی پر سے اعتبار تمام
اور انتظار بھی اُس کا زمانہ کرتا تھا

سفر گرفتہ رہے، کشتگانِ نان و نمک
کوئی ہمارے لیے فیصلہ نہ کرتا تھا

شعارِ زیست ہنر تھا، سو ہم نہ جان سکے
جو کام ہم نے کیا دوسرا نہ کرتا تھا

فضا میں ہاتھ تو اٹھے تھے ایک ساتھ کئی
کسی کے واسطے کوئی دُعا نہ کرتا تھا

انھیں گھروں سے عبارت تھی اپنی شام جہاں
چراغِ طاق بھی اکثر جلا نہ کرتا تھا

تمام صورتِ ترتیب اُس کو آتی ہے
اگرچہ خیر کو شر سے جدا نہ کرتا تھا

○

اِس ایک ذرّے کو روشن ستارہ کرنا ہے
غروبِ شام سے پہلے کنارہ کرنا ہے

اب ایسی شب کی سیاہی کا رزق میرا نصیب
اب ایسے دن ہیں تو ان پر گزارا کرنا ہے

بلند رکھوں گا اپنے علَم میں آخر تک
وہاں پہنچ کے تجھے بھی اشارہ کرنا ہے
یہ عہد پارۂ نانِ جویں کا کفارہ
شکم شکم کوئی خنجر اتارا کرنا ہے
اسی کو یاد بھی حد سے زیادہ کرتا ہوں
وہ جس کو آخری حد تک گوارہ کرنا ہے

○

وہ بات کیا تھی کہ جس کا اثر نہیں جاتا
کسی کا ذہن تری بات پر نہیں جاتا
زمیں کے اتنے سے ٹکڑے پہ اتنی دیواریں
کہ ایک شخص اِدھر سے اُدھر نہیں جاتا
وہ چاند، تارِ گریباں میں جا کہ اٹکا ہے
تمام آسماں دامن میں بھر نہیں جاتا
ستم کے ہاتھ تھے اور آسماں کو چھوتے تھے
ذرا جھکا دیا ہوتا تو سر نہیں جاتا
وہی لپک ہے سناں میں، چمک ہے خنجر میں
اگرچہ میرے قبیلے کا ڈر نہیں جاتا
گماں کے ہاتھ سے مشعل کہاں پہ جاکے گری
اگر میں اپنی حدوں سے گزر نہیں جاتا
کچھ اور تیری طرف سے امید رکھتا ہوں
میں اس طرح کی عنایات پر نہیں جاتا
وہ تم ہی تھے جو بسر کر گئے عتیق اللہ
جہاں سے اتنا کوئی بے خبر نہیں جاتا

○

میں اِن حدوں سے کچھ آگے جانے والا تھا
تماشہ اور ہی تجھ کو دکھانے والا تھا

وہ خاکِ نم بھی مری تھی، شکستہ دل بھی مرے
یہی اثاثہ ابھی میں گنوانے والا تھا

یہ شاخ پھر ہوئی ویران، اے پرندۂ شب
اسی ٹھکانے پہ کبھی تو بھی آنے والا تھا

نہ ایک رات ہی ایسی نہ ایک دن ایسا
مگر میں رات کو دن سے ملانے والا تھا

غریبِ شہر کا سر ہوگیا قلم آخر
کہاں کی چیز، کہاں پر لٹانے والا تھا

اک اور گمان نے سایہ سا مجھ پہ ڈال دیا
اک اور گمان کی زد میں جب آنے والا تھا

○

فرار کے لیے جب راستہ نہیں ہوگا
تو بابِ خواب بھی کیا ہم پہ وا نہیں ہوگا

وہ بات تھی تو کئی دوسرے سبب بھی تھے
یہ بات ہے تو سبب دوسرا نہیں ہوگا

یوں اس نگاہ کو اپنی کشادہ رکھتے ہیں
کہ اس کے بعد کبھی دیکھنا نہیں ہوگا

جو تنگ ہوتے گئے قلب ہائے سینہ مقام
کوئی مقام، مقامِ دعا نہیں ہوگا

کرم تو ہوگا، مگر اتنی شرط بھی ہوگی
کہ ایک حد ہے اور اس سے سوا نہیں ہوگا

وہ دیکھنے کے لیے بھی نظر نہیں ہوگی
یہ واقعہ بھی کبھی رونما نہیں ہوگا
کوئی زمین تو ہوگی تری زمینوں پر
ہمارے جیسا کوئی نقشِ پا نہیں ہوگا

○

چلو سُرنگ سے پہلے گزر کے دیکھا جائے
پھر اُس پہاڑ کو کاندھوں پہ دھر کے دیکھا جائے
اِدھر کے سارے تماشوں کے رنگ دیکھ چکے
اب اُس طرف بھی کسی روز مر کے دیکھا جائے
کہاں پہنچ کے حدیں سب تمام ہوتی ہیں
اس آسمان سے نیچے اُتر کے دیکھا جائے
یہ درمیان میں کس کا سراپا آتا ہے
اگر یہ حد ہے تو حد سے گزر کے دیکھا جائے
یہ دیکھا جائے وہ کتنے قریب آتا ہے
پھر اس کے بعد ہی انکار کر کے دیکھا جائے
گزارنے کے لیے زندگی بہت کم ہے
گزارا اور کسی طرح کر کے دیکھا جائے

□□

عرشؔ ملسیانی

شاگردِ داغؔ، ابوالفصاحت پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی کے فرزند بال مکند جو اردو دنیا میں عرشؔ ملسیانی کے نام سے مشہور ہوئے، ۲۰ر ستمبر ۱۹۰۸ء کو اپنے آبائی وطن ملسیان میں پیدا ہوئے جو جالندھر کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ عرشؔ کی ابتدائی تعلیم ملسیان اور نکودر میں ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد انجینئرنگ کا کورس کیا اور محکمہ نہر میں اوورسیئر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ایک سال تک اوورسیئری کرنے کے بعد لدھیانے کے صنعتی اسکول میں ملازم ہو گئے اور یہیں سے گریجویشن کیا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ۱۹۴۲ء میں دہلی آ گئے۔ ۱۹۴۸ء میں پبلی کیشنز ڈویژن کے مشہور ادبی رسالے ماہنامہ ''آج کل'' کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ ''آج کل'' کے دفتر میں تقریباً سات سال تک جوشؔ ملیح آبادی کے رفیقِ کار رہے۔ جوشؔ کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد ان کی جگہ ''آجکل'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

حکومتِ پنجاب نے عرشؔ کی شعری و ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کو تین سال کے لیے پنجاب کا ''راج کوی'' مقرر کیا۔ عرشؔ ملسیانی اپنے زمانے کے مقبول شاعر تھے۔ مشاعروں میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ ''ہفت رنگ'' اور ''چنگ و آہنگ'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ''آہنگِ مجاز'' نعتوں کا مجموعہ ہے۔ عرشؔ نے عمر خیام کی رُباعیوں کا منظوم

ترجمہ بھی کیا اور ''ہست و بود'' کے نام سے یہ ترجمہ شائع ہوا۔ اس کے علاوہ عرشؔ نے نثر میں مزاحیہ مضمون بھی لکھے، جن کا مجموعہ ''پوسٹ مارٹم'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

یہ دورِ خرد ہے دورِ جنوں، اس دور میں جینا مشکل ہے
انگور کی مے کے دھوکے میں زہرآب کا پینا مشکل ہے

جب ناخنِ وحشت چلتے تھے، روکے سے کسی کے رُک نہ سکے
اب چاکِ دلِ انسانیت، سیتے ہیں تو سینا مشکل ہے

اک صبر کے گھونٹ سے بجھ جاتی سب تشنہ لبوں کی تشنہ لبی
کم ظرفیِ دنیا کے صدقے، یہ گھونٹ بھی پینا مشکل ہے

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اُس حال میں جینا لازم ہے، جس حال میں جینا مشکل ہے

وہ شعلہ نہیں جو بجھ جائے آندھی کے ایک ہی جھونکے سے
بجھنے کا سلیقہ آساں ہے، جینے کا قرینا مشکل ہے

کرنے کو رفو کر ہی لیں گے دنیا والے سب زخم اپنے
جو زخم دلِ انساں پہ لگا، اُس زخم کا سینا مشکل ہے

جو دھرم پہ بیتی دیکھ چکے، ایماں پہ جو گزری دیکھ چکے
اس رام و رحیم کی دنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے

ملنے کو ملے گا بالآخر اے عرشؔ سکونِ ساحل بھی
طوفانِ حوادث سے لیکن بچ جائے سفینا مشکل سے

○

جنونِ عرفاں میں غرق ہو کر بھلا کہیں نہ خوشی ملے گی
جو طاعتِ جام و مے کرو گے تو جنتِ سرخوشی ملے گی

زمانہ بدمذاق اور میں خدائے انصاف تو کہاں ہے
مرے شعور اور آگہی کی کبھی مجھے داد بھی ملے گی

اجارہ دارانِ عیش و مستی زمانہ اب رخ بدل رہا ہے
کبھی تو مجھ بدنصیب کو بھی فراغتِ زندگی ملے گی

خیالِ تعمیر کے اسیرو کرو نہ تخریب کی برائی
بغور دیکھو تو دوستی کے قریب ہی دشمنی ملے گی

عتاب کرنے دو عرشؔ ان کو اس میں بھی مصلحت نہاں ہے
مزاج کو برہمی ملے گی تو حسن کو دل کشی ملے گی

○

دوستی کا نشاں نہیں ملتا
کوئی اپنا یہاں نہیں ملتا

کارواں سے کچھ اس طرح بچھڑے
اب کہیں کارواں نہیں ملتا

درد معراج کو پہونچتا ہے
جب کوئی ترجماں نہیں ملتا

رہبروں کی ہوئی وہ ارزانی
رہرووں کا نشاں نہیں ملتا

بے زباں ہوگئے زباں والے
اب کوئی ہم زباں نہیں ملتا

زندگی کے وجود میں اب بھی
زندگی کا نشاں نہیں ملتا

بے رخی اور بات ہے ورنہ
ملنے والا کہاں نہیں ملتا

○

جرمِ بے باکیِ گفتار کروں یا نہ کروں
خود کو وقفِ رسن و دار کروں یا نہ کروں
تم جسے سن کے بھی کہہ دو یہ مرا درد نہیں
تم سے اس درد کا اظہار کروں یا نہ کروں
بے گناہی بھی بڑا جرم ہے اس دنیا میں
اپنے اس جرم کا اقرار کروں یا نہ کروں
دل بھی لگتا ہے وہاں جان بھی جاتی ہے وہاں
حسرتِ کوچۂ دلدار کروں یا نہ کروں
ہر گزارش مری محرومِ پذیرائی ہے
سوچتا ہوں کہ اب اصرار کروں یا نہ کروں
مجھ کو اندازۂ تابِ دلِ کم ظرف نہیں
جذبۂ شوق کو بیدار کروں یا نہ کروں

○

یہ دنیا ہے اسے دارُالفتن کہنا ہی پڑتا ہے
یہاں ہر راہبر کو راہزن کہنا ہی پڑتا ہے
وفورِ عقلِ انساں سے بڑھی انساں کشی اتنی
وفورِ عقل کو دیوانہ پن کہنا ہی پڑتا ہے
ہمارا ذکر بھی ہے اس میں غیروں کا چہکنا بھی
تمھاری انجمن کو انجمن کہنا ہی پڑتا ہے
وہ صحرا جس میں کٹ جاتے ہیں دن یادِ بہاراں سے
بالفاظِ دگر اُس کو چمن کہنا ہی پڑتا ہے
سخن سازوں میں جب یہ مرد یکتا ہے تو واعظ کو
سخن ور گو نہیں مردِ سخن کہنا ہی پڑتا ہے

گل افشانیِ گفتارِ مجاہد بے اثر ہو جب
تو اس کو قصۂ دار و رسن کہنا ہی پڑتا ہے
بتانِ سنگ دل میں ہے نزاکت کا بھی اک پہلو
انھیں سیمیں بدن، گل پیرہن کہنا ہی پڑتا ہے
اسی صورت سے کم ہوتا ہے کچھ آزار غربت کا
دیارِ غیر کو اپنا وطن کہنا ہی پڑتا ہے
یہاں کتنوں کے جی چھوٹے یہاں کتنوں کے دم ٹوٹے
وفا کی راہ کو ہمت شکن کہنا ہی پڑتا ہے
برا کیا ہے جو حسن سادہ کو پُر فن کہا ہم نے
خضر کو بھی تو اکثر راہزن کہنا ہی پڑتا ہے
زباں سمجھے نہ سمجھے کوئی اپنی عرشؔ اس پر بھی
وطن اپنا ہے یہ اس کو وطن کہنا ہی پڑتا ہے

○

دل فسردہ میں سو بار تازگی آئی
مگر وہ یاد جو جا کر نہ پھر کبھی آئی
چمن میں کون ہے پُرسانِ حال شبنم کا
غریب روئی تو غنچوں کو بھی ہنسی آئی
تمھاری یاد نے فرصت جواب کی بھی نہ دی
مزاج پوچھنے سو بار زندگی آئی
کسی طرح سے زمانے کو بس میں کر نہ سکے
نہ دوستی، نہ ہمیں راس دشمنی آئی
دیے جلائے امیدوں نے دل کے گرد بہت
کسی طرف سے نہ اس گھر میں روشنی آئی
کسی طرح نہ مٹا عرشؔ داغِ کفر اپنا
ہمارے کام نہ سجدے نہ بندگی آئی

عزیز بگھروی

یہ بھی ایک عجب اتفاق ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے مذہب پرست معاشروں میں مذہب بیزار شاعروں کی صدائیں تو دور دور تک سنائی دیتی ہیں لیکن مذہبی اقدار میں یقین رکھنے والے مذہب پسند شاعروں کی آوازیں مخصوص حلقوں سے باہر کہیں سنائی نہیں دیتیں۔ خالص ادبی کہلائے جانے والے رسائل و جرائد اور اربابِ نقد و نظر ان آوازوں سے بے اعتنائی برتتے ہیں لیکن اس کے باوجود، ادبی اور عوامی پذیرائی سے بے نیاز مذہب پسند شعراء نظریہ کی صحت کے ساتھ اسلوب کی شگفتگی، زبان کی شستگی اور خوش آہنگ الفاظ سے آراستہ خوب صورت غزلوں اور نظموں کے گلاب اُگا رہے ہیں۔ عزیز بگھروی بھی انہی شاعروں میں ایک ہیں اور ان کی شاعری ان کے مقصدِ حیات کا وسیلۂ اظہار ہے۔

عزیز ۲۳ رجون ۱۹۳۲ء کو مظفر نگر کے قصبہ بگھرہ کے ایک ذی علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے، بی۔ ایڈ کیا اور شمالی ہند کی قدیم ترین اور دہلی کی مشہور درسگاہ اینگلو عربک اسکول کے تدریسی عملے میں شامل ہوکر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ شاعری کا شوق اسکول کے زمانے کی دین ہے جسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادبی ماحول میں جلا ملی۔ ضلع مظفر نگر کے مشہور اور کہنہ مشق شاعر جناب ظہیر بگھروی کے تلمذ نے عزیز کے شعری شوق کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

عزیز بگھروی جماعتِ اسلامی کے اہم رکن ہیں۔ اینگلو عربک اسکول سے ریٹائر

ہونے کے بعد جماعت اسلامی کے ادبی رسالے ماہنامہ ''پیش رفت'' کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ''جہادِ حرف'' (۱۹۸۸ء)، ''ناموسِ قلم'' (۱۹۹۳ء)، ''حرمتِ فن'' (۱۹۹۸ء)، ''قندیلِ حرم'' (حمد و نعت) ۲۰۰۰ء اور ''تقدیسِ ہنر'' ۲۰۰۲ء عزیزؔ بگھروی کے شعری مجموعے ہیں جو اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

عزیزؔ بگھروی کا ۲۱ ستمبر ۲۰۰۴ء کو انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

ناموسِ قلم ، فکرِ گہر بار نہ بیچو
اے دیدہ ورو! غیرتِ فن کار نہ بیچو

چپ رہنا تو ہے ظلم کی تائید میں شامل
حق بات کہو جرأتِ اظہار نہ بیچو

ورثہ ہے نبیوں کا امانت ہے خدا کی
جاں ہارنے والو ! دلِ خود دار نہ بیچو

کانٹے کبھی ہوتے نہیں پھولوں کے برابر
اے اہلِ چمن! حسن کا معیار نہ بیچو

روشن ہے اِسی نور سے قندیلِ تمنّا
افسردہ دلو! لذتِ آزار نہ بیچو

راس آتی نہیں سب کو یہ آوارہ مزاجی
اے دشت نوردو! ابھی گھر بار نہ بیچو

اے شعلہ رُخو! حسن کی پہچان تو رکھو
آنکھوں کی حیا ، تابشِ رخسار نہ بیچو

کہنے دو عزیزؔ اُس کو جو کہتا ہے زمانہ
تم اپنا لب و لہجۂ اشعار نہ بیچو

○

شعلۂ درد لیے دیدۂ تر میں آئے
چارہ گر آگ لگانے مرے گھر میں آئے

چند تنکے ہی سہی اپنے نشیمن کی بساط
کچھ تو ہیں جو نگہ برق و شرر میں آئے

اب جو پھرتے ہیں سکوں ڈھونڈتے مقتل مقتل
تجھ سے بھاگے تو ترے دامِ اثر میں آئے

کوئی دروازہ نہ روزن نہ دریچہ کوئی
روشنی آئے تو کس راہ سے گھر میں آئے

اُن کو منزل ہی نہیں عظمتِ منزل بھی ملی
لے کے جو توشۂ جاں راہ گزر میں آئے

زخمِ دل مہکے تو اُن کو نہ ملی داد کوئی
پھول مہکے تو زمانہ کی نظر میں آئے

ہو ترے فن میں عزیزؔ اُس کے سخن کی خوشبو
رنگ اُس کا ترے اندازِ ہنر میں آئے

○

اُٹھے تو تھے اربابِ ستم سوچ سمجھ کے
سب مل گئے مٹی میں بھرم سوچ سمجھ کے

ہر چند ہے کانٹوں سے بھری راہ ہماری
ہم نے بھی اٹھائے ہیں قدم سوچ سمجھ کے

یہ شے دلِ خود دار کی ٹھکرائی ہوئی ہے
اس سمت اٹھے چشمِ کرم سوچ سمجھ کے

اب لرزہ براندام ہے کیوں وحشتِ قاتل
کرنا تھا مرے سر کو قلم سوچ سمجھ کے

مٹتا ہے کہیں نقشِ رفاقت دلِ ناداں
کھا ترکِ تعلق کی قسم سوچ سمجھ کے
اس عہد ریا کار سے اللہ بچائے
اب خود سے بھی ملتے ہیں تو ہم سوچ سمجھ کے
اٹھتا ہے اگر درد نکل پڑتی ہیں چیخیں
کرتے نہیں اظہارِ الم سوچ سمجھ کے
ہر چند کہ دیوانہ سا لگتا ہے عزیزؔ اک
کرتا ہے مگر شعر رقم سوچ سمجھ کے

○

حق کی خاطر خدا کی خوشی کے لیے
جینا مرنا ہمارا اسی کے لیے
دل کسی کے لیے سر کسی کے لیے
بدنما داغ ہے زندگی کے لیے
دل تو مائل ہیں وابستگی کے لیے
ہاتھ بڑھتے نہیں دوستی کے لیے
مر کے بھی لوگ رہتے ہیں زندہ مگر
یہ سعادت نہیں ہر کسی کے لیے
میرا قاتل مرا اپنا کردار ہے
کس کو الزام دوں خودکشی کے لیے
بال و پر کے لیے ہر بلندی نشیب
ہر زمیں آسماں بے پری کے لیے
کم رہی کے لیے کم ہزاروں برس
ایک پل بھی بہت آگہی کے لیے

یہ اندھیرے نہ ہوں گے چراغوں سے کم
دل جلاؤ یہاں روشنی کے لیے
مے کشو! آؤ وا ہے درِ مے کدہ
شرط کوئی نہیں مے کشی کے لیے
شعر کہنا عزیزؔ اپنے بس کا نہیں
صرف لفظوں کی بازی گری کے لیے

○

لکھے جو گل کو زخم، لہو کو حنا کہے
فن کار اب اُسی کو زمانہ بڑا کہے
کیا انقلابِ وقت ہے ہم چاہتے ہیں اب
رودادِ غم ہماری کوئی دوسرا کہے
خاطر میں بھی خدا کو نہ لائے یہ آدمی
آئے نوازنے پہ تو بت کو خدا کہے
تسلیم کیوں اُسے کوئی اہلِ نظر کرے
سارا جہاں روا کو اگر ناروا کہے
بدلیں گے ہم نہ اپنا مذاقِ سخن کبھی
ناقد ہزار قاتلِ حرف و نوا کہے
نا معتبر ہیں وہم و گماں کے تمام نقش
ہے معتبر وہ عکس جسے آئینا کہے
لہجے ہیں سب کے ایک سے کردار ایک سا
کس کو حریف کس کو کوئی ہم نوا کہے
اک اجنبی کہے تو عزیزؔ اس کا غم نہیں
ترکِ وفا کی بات جو غم آشنا کہے

○

منتظر ہے دستِ قاتل میں کھلا خنجر، چلو
ہم بھی دیکھیں آج اپنے قتل کا منظر، چلو

کچھ تو ٹوٹے اس گھٹن کی زہرناکی کا طلسم
آندھیو! اب کے برس تم شہر کے اندر چلو

یہ وہ شبنم ہے جو اندر سے جلا دیتی ہے جسم
آگہی کی شعلہ سامانی سے بچ بچ کر چلو

پردہ پوشی سے حقائق تو بدل سکتے نہیں
لو! تمھیں بھی فرض کر لیتے ہیں پیغمبر، چلو

آپ کی گردن پہ کیوں تیغِ ستم پیشہ چلی
ہم تو قاتل کی نظر میں تھے کشیدہ سر چلو

دل میں پیدا ہی نہ ہوگا سیرِ گلشن کا خیال
تم ذرا کچھ دور میرے ساتھ کانٹوں پر چلو

دور تک پھیلا ہو جیسے شب کا سناٹا عزیزؔ
آؤ پھینکیں زندگی کے بحر میں پتھر چلو

□□

عزیز وارثی

گزشتہ صدی کے چوتھے دہے میں دہلی کی شعری وادبی محفلوں میں عزیز وارثی کے نام سے ابھرنے اور پانچویں دہے میں یہاں کے مقامی اور غیر مقامی مشاعروں میں شہرت پانے اور مقبولیت حاصل کرنے والے عزیز احمد خاں ۱۷ر جولائی ۱۹۲۴ء کو ماضی قریب کے امروہہ اور آج کے ضلع جیوتی با پھولے نگر کے قصبہ بچھرایوں میں پیدا ہوئے جو پروفیسر مولانا حامد حسن قادری، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، علامہ سعید احمد اکبر آبادی جیسے مشاہیرِ ادب کا مولد اور حضرت حاجی اوگھٹ شاہ وارثی جیسے بزرگِ دین اور شیخِ طریقت کا مسکن بھی رہا ہے۔

عزیز وارثی نے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے مولد ہی میں حاصل کی۔ جب شعور سنبھالا تو تلاشِ معاش اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ۱۹۳۵ء کے آس پاس دہلی چلے آئے۔ شاعری کا شوق گھر کے نیم ادبی ماحول کی دین تھا۔ اس زمانے کے قصبات کے شرفاء کی طرح ان کے والد چودھری نذیر احمد خاں مرحوم بھی شعر وادب کے دلدادہ تھے۔ عزیز وارثی کی شاعری نے قصبے کی رومان پرور فضاؤں میں جنم لیا تھا لیکن دہلی کے ادبی ماحول میں پروان چڑھی اور ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کی شاگردی میں نکھری۔ حضرتِ سائل نے کچھ عرصہ تک عزیز کی ذہنی تربیت کی، شعری مشوروں سے

نوازا، لیکن ۱۹۴۴ میں اپنی گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے عزیزؔ کو اپنے خواجہ تاش حضرتِ نوحؔ ناروی کے سپرد کر دیا جو اپنے دور کے ایک ممتاز اور نغز گفتار شاعر تھے۔

وہ گرچہ حضرتِ سائلؔ دہلوی اور جناب نوحؔ ناروی کے شاگرد تھے جن کی شاعری معاملاتِ حسن وعشق اور رنگینی بیاں سے عبارت تھی، لیکن ان کا رنگ اپنے اساتذہ کے رنگ سے بالکل الگ تھا۔ ان کی شاعری میں جناب اصغرؔ گونڈوی کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ پہلا مجموعہ ''سفینۂ وسائل'' ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا جس کا ۱۹۶۵ء میں دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ ''محراب''، ''جسارت'' اور ''تصرف'' ان کے دوسرے شعری مجموعے ہیں جو ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۵ء میں جشنِ عزیز وارثی کمیٹی کی جانب سے منصۂ شہود پر آئے۔ ان مجموعوں کے علاوہ انھوں نے وارثیہ سلسلے کے تین فقیر شعراء کے کلام کا انتخاب بھی مرتب کیا تھا جو ۱۹۶۷ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

عزیزؔ وارثی ہمدرد دواخانے میں ملازم تھے اور ''ندائے اتحاد'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار بھی شائع کرتے تھے جو ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۲ء تک مسلسل جاری رہا۔

اُن کا انتقال ۲۹؍جولائی ۱۹۸۹ء کو دہلی میں ہوا اور دہلی گیٹ قبرستان میں تدفین ہوئی۔

نمونۂ کلام:

غزل

تری تلاش میں نکلے ہیں تیرے دیوانے
کہاں سحر ہو کہاں شام ہو خدا جانے
حرم ہمیں سے ہمیں سے ہے آج بُت خانے
یہ اور بات ہے دنیا ہمیں نہ پہچانے
حرم کی راہ میں حائل نہیں ہیں بُت خانے
حرم سے اہلِ حرم ہو گئے ہیں بیگانے

یہ غور تونے کیا بھی کہ حشر کیا ہوگا
تڑپ اٹھے جو قیامت میں تیرے دیوانے
عزیز اپنا ارادہ کبھی بدل نہ سکا
حرم کی راہ میں آئے ہزار بُت خانے

○

اب تک بھی پا سکے نہ جہاں نکتہ داں تجھے
دیوانگی نے ڈھونڈ لیا ہے وہاں تجھے
یہ میرا فیصلہ ہے کسی کا بھی تو نہیں
کیوں لوگ کہہ رہے ہیں مرا مہرباں تجھے
تونے مری حیات کا عالم بدل دیا
پھر کیسے بھول جاؤں غمِ جاوداں تجھے
ہر موئے تن سے پھوٹ پڑی ہے حسین یاد
کچھ بھولنے کا عزم کیا ہے جہاں تجھے
کب سے ترا عزیز ہے رُسوا ترے لیے
اب تک یقینِ عشق نہیں بدگماں تجھے

○

اس مست نظر کا اُف رے ستم جس وقت اِدھر ہوجاتی ہے
مجروح جگر ہوجاتا ہے بے تاب نظر ہوجاتی ہے
حیراں ہوں کہ رونے کی میرے کس طرح خبر ہوجاتی ہے
ہر شاخ چمن میں پچھلے پہر روز ہی تر ہوجاتی ہے
اللہ رے یہ دستورِ عمل اللہ رے یہ قانونِ اٹل
جس سمت وہ نظریں اٹھتی ہیں دنیا ہی اُدھر ہوجاتی ہے
اک وہ بھی زمانہ تھا اپنا پھولوں پہ بسیرا ہوتا تھا
اک یہ بھی زمانہ ہے اپنا کانٹوں پہ بسر ہوجاتی ہے

جس شامِ الم کی تاریکی غمِ دل کا فراواں کرتی ہو
اُس شام کی اکثر تاریکی پُرنور سحر ہوجاتی ہے
اک روز قمر بن جاتا ہے جس طرح مہِ نو گردش سے
اس طرح محبت میں دل کی ہر آہ شرر ہوجاتی ہے
جو نوحؑ سے نسبت رکھتے ہیں لاریب عزیزؔ ان کی کشتی
دم بھر میں اِدھر ہوجاتی ہے دم بھر میں اُدھر ہوجاتی ہے

○

اُن کے کرم کی رکھ اُمید اُن کی عطا سے پیار کر
اے دلِ مبتلائے غم غم کو بھی خوش گوار کر
حسنِ یقینِ عاشقی اتنا تو پائیدار کر
خود پر بھی اعتماد رکھ اُن پر بھی اعتبار کر
دل میں جو میرے زخم ہیں اُن کا نہ اب شمار کر
سینۂ داغدار کو اور بھی داغدار کر
سوزشِ آگہی کے ساتھ حسنِ شعور شرط ہے
ذوقِ جنوں نواز اب اور نہ شرمسار کر
تجھ سے ہنوز ہے نہاں فکر کا اک نیا جہاں
عزم و عمل سے زیست کے حسن کو آشکار کر
حاصلِ کائنات تھے بس وہی زندگی کے دن
ہم تیری بارگاہ میں آئے ہیں جو گزار کر
سینۂ تیرگی سے ہی پھوٹے گی ایک موجِ نور
منتظرِ حیاتِ نو صبح کا انتظار کر
دردِ حیات دردِ دل دردِ فراق دردِ غم
یہ ہیں متاعِ لازوال اُن سے عزیزؔ پیار کر

○

سوزشِ غم کے سوا کاہشِ فرقت کے سوا
عشق میں کچھ بھی نہیں درد کی لذت کے سوا

دل میں اب کچھ بھی نہیں اُن کی محبت کے سوا
سب فسانے ہیں حقیقت میں حقیقت کے سوا

کون کہہ سکتا ہے یہ اہلِ طریقت کے سوا
سارے جھگڑے ہیں جہاں میں تری نسبت کے سوا

کتنے چہروں نے مجھے دعوتِ جلوہ بخشی
کوئی صورت نہ ملی آپ کی صورت کے سوا

غمِ عقبیٰ غمِ دوراں غمِ ہستی کی قسم
اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

بزمِ جاناں میں ارے ذوقِ فراواں اب تک
کچھ بھی حاصل نہ ہوا دیدۂ حیرت کے سوا

وہ شبِ ہجر وہ تاریک فضا وہ وحشت
کوئی غمخوار نہ تھا درد کی شدت کے سوا

محتسب آؤ چلیں آج تو مے خانے میں
ایک جنت ہے وہاں آپ کی جنت کے سوا

جو تہی دست بھی ہے اور تہی دامن بھی
وہ کہاں جائے گا تیرے درِ دولت کے سوا

جس نے قدرت کے ہر اقدام سے ٹکر لی ہے
وہ پشیماں نہ ہوا جبرِ مشیّت کے سوا

مجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں مرے احباب عزیز
کیا ملا شہرِ سخن میں تمھیں شہرت کے سوا

○

کچھ روپ نگر کا ذکر کرو کچھ رنگ محل کی بات کرو
رنگین فضا ہے محفل کی رنگین غزل کی بات کرو

رندوں کو نہ اب ٹالو کل پر رندوں سے نہ کل کی بات کرو
تم آج ہمارے ساقی ہو تم آج نہ ہلکی بات کرو

ہے صبحِ بنارس روپ اُس کا تو شامِ اودھ گیسو اُس کے
وہ میری غزل ہے میری غزل تم میری غزل کی بات کرو

تقریر کی لذّت بے معنی تحریر کی ندرت لا حاصل
یہ فکر و عمل کی ہے دنیا کچھ فکر و عمل کی بات کرو

بیٹھے ہو عزیز اپنے ایسے احباب کی رنگین محفل میں
توبہ کے تصور سے پہلے ایماں کے خلل کی بات کرو

□□

عشرتؔ کرتپوری

مزمل حسین، جو شعر و ادب کی دنیا میں عشرتؔ کرتپوری کے قلمی نام سے مشہور ہوئے، یکم جنوری ۱۹۲۴ء کو قصبہ کرتپور، ضلع بجنور کے ایک ایسے خانوادے میں پیدا ہوئے جہاں بیتے دنوں کی خوشحالی، اجداد کی شان و شوکت، اُمارت کے قصّے کہانیوں اور اپنی نیک نامی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ نامساعد حالات اور معاشی پریشانیوں میں گھرے ان کے والد مقبول حسین صاحب خاندان کے ماضی دھندلاتی ہوئی تصویر میں رنگ بھرنے کے لیے اولاد کو چاہتے ہوئے بھی بہتر تعلیم نہیں دلا سکے، جس کی وجہ سے عشرتؔ کو آٹھویں جماعت کے بعد ہی عملی زندگی کا سفر شروع کرنا پڑا۔ کرتپور اور مراد آباد میں بہت ہی ادنیٰ سی نوکریاں کرتے ہوئے ۱۹۴۲ء میں دہلی پہنچے اور ہمدرد دواخانہ میں ملازم ہو گئے، لیکن چند ماہ بعد ہی خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمدرد کی ملازمت چھوڑ کر لاہور پہنچ گئے اور ایک شو کمپنی میں نوکر ہو گئے۔ شو کمپنی کے مالکان شعر فہم اور ادب نواز تھے جس کی وجہ سے دکان پر شاعروں اور ادیبوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ دکان کے مالکان حضرات کے حضرتِ جگر مرادآبادی سے گہرے مراسم تھے۔ جگر جب بھی لاہور آتے تو ان ہی کے یہاں قیام کرتے تھے۔ عشرتؔ کو اس ملازمت کے دوران اردو کے انگنت مشاہیر کی خدمت میں رہنے اور اُن کو قریب سے دیکھنے کے خوب مواقع ملے۔ لاہور آنے سے قبل گرچہ عشرتؔ نے شعر کہنا

شروع کر دیا تھا لیکن اس ملازمت کے دوران انھوں نے با قاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا اور مالکان سے سفارش کرا کر چند ابتدائی غزلوں پر حضرتِ جگر مرادآبادی سے اصلاح بھی لی، لیکن اصلاح کے اس سلسلے کو طویل ہوتا دیکھ کر جگر صاحب نے اپنی جہاں گردی اور مسلسل سفر میں رہنے کی وجہ سے ان کو جنابِ احسان دانش کے سپرد کر دیا اور عشرت جگر صاحب کے توسط سے حضرتِ احسان دانش کے تلامذہ میں با قاعدہ شامل ہو گئے لیکن شعری اصلاح اور ذہنی تربیت کا یہ سلسلہ چار پانچ سال ہی چلا تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا اور ہجرت کے اس دور میں عشرت لاہور سے مراجعت کر کے دہلی واپس آ گئے۔

لاہور کے قیام کے دوران اور شاعری کے ابتدائی دور میں عشرت خاصے متحرک اور فعال شاعر تھے۔ بزم آرائیاں ان کا مشغلہ تھا لیکن تقسیمِ وطن کے بعد وہ اپنے آپ میں محصور ہو کر رہ گئے تھے اور تا دمِ زیست اسی حصار میں گُم رہے۔

''کاکلِ صبح''، ''پاک زمیں ناپاک قدم''، ''شاخِ برہنہ'' اور دیوناگری رسم الخط میں ''غزلانجلی'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ۳۰ رستمبر ۲۰۰۰ء کو عشرت نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور غازی آباد میں دفن ہوئے۔

نمونۂ کلام:

غزل

تھے مزاجاً ہم بھی ہرجائی بہت
پر دکن والوں کی یاد آئی بہت

دل کے ملنے اور لُٹنے کے لیے
ایک لمحے کی شناسائی بہت

بن گئے ہیں آج وہ نا آشنا
جن سے تھی کل تک شناسائی بہت

جب سے اُن کی قربتیں حاصل ہوئیں
بڑھ گئی ہے دل کی تنہائی بہت

○

ہجر دے گا نہ کبھی غم کہ گھٹائیں دے گا
پاس رکھ کر مجھے قربت کی سزائیں دے گا
یہ کھلونے نہیں روزی کا وسیلہ کر دو
میرا بچہ تمھیں دن رات دعائیں دے گا
ساری بستی تھی مرے قتل کی سازش میں شریک
ایک منصف بھلا کس کس کو سزائیں دے گا
بے ردا شہر میں تم خود ہی ذرا یہ سوچو
میری بہنوں کو بھلا کون ردائیں دے گا
دشمنی ختم نہ کرنا کہ بھری بستی میں
پھر مجھے آخرِ شب کون صدائیں دے گا
مجھ سے ملنا ہے تو پھر سیدھے چلے آیئے گا
راستہ کوئی تمھیں دائیں نہ بائیں دے گا
کشتِ نفرت میں تو جو پیڑ اُگے گا عشرت
سایہ دے گا نہیں زہریلی ہوائیں دے گا

○

راتوں کا کرب دن کی تھکن میرے ساتھ ہے
یادوں کا اک دریدہ کفن میرے ساتھ ہے
برسوں سے جل رہا ہوں میں قربت کی آگ میں
ناقابلِ بیان چلن میرے ساتھ ہے
میرے لیے تو سانس بھی لینا محال ہے
ماحول کی یہ ساری گھٹن میرے ساتھ ہے
آنکھوں میں بس گئی ہے کسی شاخ کی طرح
ہر اک قدم پہ یادِ دکن میرے ساتھ ہے
عہدِ وفا کو تیری طرح کیسے توڑ دوں
میرا مزاج میرا چلن میرے ساتھ ہے

○

ممی بنا کے نہ شوکیس میں سجاؤ مجھے
میں ایک لاش ہوں دفناؤ یا جلاؤ مجھے

یہ مصلحات ہی نہیں وقت کا تقاضہ ہے
خوشی کے دن کی طرح تم بھی بھول جاؤ مجھے

تمھارے ساتھ تو چلنے میں کوئی ہرج نہیں
مگر خدا کے لیے راہ تو بتاؤ مجھے

میں وہ متاع ہوں جس کا نہیں کوئی وارث
عزیز دوستو! چپکے سے بیچ کھاؤ مجھے

پرانے آئینے چہروں کو چاٹ لیتے ہیں
جو ہو سکے تو نیا آئینہ دکھاؤ مجھے

میں بن نہ جاؤں کسی اجنبی کا ہمراہی
پرائے دیس میں یوں چھوڑ کے نہ جاؤ مجھے

□□

(مولانا) علیم اختر مظفرنگری

عبدالعلیم جو دنیائے شعر وادب میں علیم اختر بن کر اُبھرے، پہلی جنگِ عظیم کے دوران دسمبر ۱۹۱۴ء میں مظفرنگر کے ایک قصبے میں قاضیوں کے ایک علم وادب سے بہرہ مند خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد عمر صاحب نے دینی، مذہبی تعلیم کے بجائے دنیوی تعلیم حاصل کر کے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا تھا اور کم وبیش پچاس سال تک ضلع مظفرنگر کے اسکولوں میں صدر مدرس کے فرائض انجام دیے۔ علیم اختر کی تمام تر تعلیم ان ہی کی زیرنگرانی ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں ایف اے کا امتحان پاس کر کے سرکاری نوکری کو ذریعۂ معاش بنایا۔ ۱۹۴۷ء کے بدترین اور نامساعد حالات میں سرکاری ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ جب حالات ذرا سدھرے تو زندگی کا نیا سفر شروع کرنے کے لیے دہلی آ گئے اور ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ شمع وکھلونا میں ملازم ہو گئے اور تادمِ زیست اسی ادارے سے وابستہ رہے۔

ان کے والد اور خاندان کے کچھ دوسرے بزرگ بھی شعر کہا کرتے تھے اس لیے شاعری کا شوق ورثہ میں ملا۔ اسلامیہ انٹر کالج مظفرنگر کے ادبی ماحول میں اس شوق کو جلا ملی۔ ابتداء میں حضرت آلم مظفرنگری سے استفادہ کیا اور پھر حضرت آلم کے مشورے وایماء پر حضرت سیماب اکبرآبادی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مرید تھے۔ شاعری میں گرچہ مولانا آلم

مظفرنگری اور حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے لیکن ذہنی طور پر مولانا حسرت موہانی اور حضرتِ جگر مرادآبادی سے متاثر تھے۔ خالص شاعرانہ ترنم کے مالک تھے اور جب بزمِ سخن میں غزل سرا ہوتے تو شعر فہم سامعین کو متاثر کرتے اور مشاعرہ میں خوشگوار تاثر چھوڑتے تھے۔

وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے بہت سے بزرگ شعراء اور معاصرین کی یادوں پر مشتمل معلوماتی اور تاثراتی مضامین رقم کیے جو ''شاعر'' بمبئی، ''ساقی'' کراچی، ''شاخسار'' کٹک اور ''شبستان'' دہلی جیسے ادبی رسائل میں شائع اور ہندوستان و پاکستان کے متعدد ادبی اور نیم ادبی رسائل میں نقل ہوئے۔ ان منتشر ادبی مضامین کے علاوہ علیم اختر نے ''نکہتِ گل'' (مطبوعہ ۱۹۵۸ء)، نعتوں کا مجموعہ ''انوارِ حرم'' اور بچوں کی ذہنی و تعلیمی تربیت کے لیے باتصویر قطعات کا مجموعہ ''پھول پتے'' یادگار چھوڑے ہیں۔

انھوں نے ۲۱/اپریل ۱۹۷۲ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور رات کو ۹ بجے کے قریب قبرستان خواجہ باقی باللہ میں تدفین عمل میں آئی۔

نمونۂ کلام:

غزل

تنہائی میں بھی خود سے ملو تو ملا نہ جائے
سایہ کی طرح ساتھ رہو تو رہا نہ جائے

سناٹے سے ابھر تو رہی ہے کوئی صدا
یہ اور بات ہے کہ سنو تو سنا نہ جائے

اللہ رے یہ کیفیتِ احتیاطِ عشق
خط میں بھی حرفِ شوق لکھو تو لکھا نہ جائے

کیا حرفِ مدعا کوئی اقرارِ جرم ہے
اب وہ بھی کہہ رہے ہیں کہو تو کہا نہ جائے

یہ کیا کہ سوئے دشت اٹھیں خود بخود قدم
آبادیوں کی سمت چلو تو چلا نہ جائے
اس طرح تھک کے بیٹھ رہے ہمرہانِ شوق
منزل بھی خود کہے کہ اٹھو تو اٹھا نہ جائے
جامِ مئے نشاط کوئی زہر تو نہیں
یہ کیا کہ ایک گھونٹ پیو تو پیا نہ جائے
لائی ہے اس مقام پہ بے چارگیِ غم
وہ بھی اگر کہیں کہ مرو تو مرا نہ جائے
اختر، یقینِ وعدۂ فردا تو کرلیا
ایفائے عہد تک ہی جیو تو جیا نہ جائے

○

زندگی، منزلِ موہوم کو پانے کی لگن
موت کہتے ہیں جسے جہدِ مسلسل کی تھکن
کیا ہے یہ کیفیتِ موسمِ گل پیراہن
نہ کہیں بادِ بہاری، نہ کہیں بوئے سخن
یوں فروزاں نظر آتی ہے محبت کی کرن
جیسے اک گھور اندھیرے میں چراغِ روشن
ہم جو آئے ہیں گلستاں سے جھٹک کر دامن
کیا پریشاں نظر آتی ہے نسیمِ گلشن
جسمِ آدم پہ ہے زرتار لباسِ اخلاص
آدمیت ہے مگر لاشۂ بے گور و کفن
اب مرے نقشِ کفِ پا ہیں نشانِ منزل
کام کچھ آ ہی گیا شوق کا دیوانہ پن

خلوتِ دل میں اب اپنا بھی گزر مشکل ہے
ڈال دی تیرے تصور نے یہ کیسی چلمن
کیا کسی آرزوئے شوق نے دم توڑ دیا
آج محسوسِ رگِ جاں ہے جو ہلکی سی چبھن
نگہِ دوست کی بیگانہ روی کے صدقے
ان دنوں میری وفا کو ہے تلاشِ دشمن
ہم سا بربادِ بہاراں بھی نہ ہوگا کوئی
نہ کوئی شاخِ نشیمن نہ قفس ہے نہ چمن
کیا تماشائے نظر ہیں یہ تیرے دیوانے
کبھی نمناک نگاہی، کبھی ابرو پہ شکن
ہم سے کچھ رسمِ تعلق ہی نہیں ہے، نہ سہی
پھر بھی بیگانۂ احساسِ تعلق تو نہ بن
ہم کہ بیگانۂ اربابِ جہاں ہیں اختر
نہ کوئی دوست زمانے میں نہ کوئی دشمن

○

دل گدازِ شیشہ بھی، سنگ بھی ہے آہن بھی
پیکرِ محبت بھی، دوست بھی ہے، دشمن بھی
ہم بھرے گلستاں سے پھول ہی نہیں لائے
جب اٹھے تو کانٹوں سے بھر لیے ہیں دامن بھی
گیسوؤں کی چھاؤں میں دھوپ سی ہے بھادوں کی
زلف کی گھٹاؤں میں جھومتا ہے ساون بھی
جستجوئے بے پایاں کامگارِ منزل ہے
جستجوئے بے حد ہی راہ بر بھی رہزن بھی

○

غم دے کے اپنا پھر کوئی بہلا گیا ہے دل
کیا بات تھی کہ دل کو جو سمجھا گیا ہے دل
باتوں میں پھر کسی کی مرا آ گیا ہے دل
کتنا بڑا فریب مگر کھا گیا ہے دل
اُن کی ادائے خاص پہ کیا آ گیا ہے دل
خود جلوۂ جمال کو تڑپا گیا ہے دل
خلوت نشیں ہے کوئی بہ صد حسنِ احتیاط
یا شوق آرزو سے بسایا گیا ہے دل
یہ کیا مقامِ غم ہے نہ جانے کہ ان دنوں
اکثر ترے خیال سے گھبرا گیا ہے دل
غم سے بھی بے نیاز، خوشی سے بھی بے نیاز
کیا کشتگانِ غم کا بنایا گیا ہے دل
اب انتہائے دردِ محبت ہے زندگی
اُن کے خیالِ شوق پہ کیا چھا گیا ہے دل
تیری جفا نے حوصلۂ غم بڑھا دیا
ظلم و ستم سے دادِ وفا پا گیا ہے دل
وہ یاد بن گئی ہے مری غم گسارِ شوق
جب بھی غمِ حیات سے اکتا گیا ہے دل
کیوں ہو گیا ہے عالمِ امکاں اداس اداس
اخترؔ، کبھی ملول جو پایا گیا ہے دل

○

سببِ ترکِ ملاقات کوئی ہے تو سہی
نہ سہی بات مگر بات کوئی ہے تو سہی

خوئے تسلیم و رضا ہو کہ محبت کا فریب
غمِ جاناں کی مکافات کوئی ہے تو سہی

کچھ تعلق نہ سہی پھر بھی بہ مجبوریِ شوق
مائلِ پرسشِ حالات کوئی ہے تو سہی

منفعل اپنی جفاؤں پہ کوئی ہے شاید
چشمِ پرنم ہے نئی بات کوئی ہے تو سہی

ہائے وہ بے رخیِ حسن کہ جس میں پنہاں
پہلوئے حسن مراعات کوئی ہے تو سہی

رخِ روشن سے نمایاں ہیں سحر کے آثار
شامِ گیسو میں نہاں رات کوئی ہے تو سہی

پیرِ مے خانہ، کہیں حضرتِ اختر تو نہیں
دیکھنا رندِ خرابات کوئی ہے تو سہی

□□

عمران عظیم

عمران عظیم کو شعر گوئی ورثے میں ملی ہے۔ ان کے والد ماجد نیّر گنگوہی غزل کے اچھے شاعر ہیں، جن کا شعری مزاج اردو شاعری کی کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہے۔ کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ شاعرانہ ماحول میں پرورش و پرداخت کے بعد تقلید سے دامن چھڑانا مشکل ہے لیکن عمران عظیم کا ذہن خالص تقلیدی نہیں ہے۔

عمران عظیم ۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اردو میں ایم۔ اے کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری لی اور آج کل دہلی میں وکالت کر رہے ہیں۔ ۱۹۷۸ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم کے دوران غزلوں پر پروفیسر عنوان چشتی سے باقاعدہ اصلاح لینی شروع کی۔ مشاعروں سے دور رہتے ہیں صرف ادبی رسائل کے ذریعہ شعری اظہار کے قائل ہیں۔ عمران عظیم کے دو شعری مجموعے "کمندِ حرف" ۱۹۹۰ء اور "رنگِ صدا" ۱۹۹۷ء اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ عمران کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "حرفِ زار" بھی منصۂ شہود پر آچکا ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

اس طرح کرتی ہے گھر کو ختم چشمک دیکھ لے
جیسے اک ذاتی کتب خانے کو دیمک دیکھ لے

بانٹنا دُکھ سُکھ بھی ہم سایوں کے لیکن اے عزیز
آنکھ پر حرص و ہوس کی پہلے عینک دیکھ لے

ایک ہی ساعت میں روشن ہو گئے دیوار و در
دے رہا ہے کون دروازے پہ دستک دیکھ لے

کس طرح احباب میں رہتا نہیں فکرِ زیاں
وقت کو کرتی ہے کیسے قتل بیٹھک دیکھ لے

لڑ رہے ہیں آج کل دانشورانِ قوم بھی
چشمِ بینا ہو نہ ہو روشن ہے مسلک دیکھ لے

سارے احباب اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے
اے عظیم اپنی طرف اب تو بھی بے شک دیکھ لے

○

نعرۂ اتحاد لائے گا
شہر میں پھر فساد لائے گا

سچ کی شاخوں پہ پھول کھلنے دو
جھوٹ خود اعتماد لائے گا

میری خواہش ہے روشنی لائے
اُس کی ضد ہے سواد لائے گا

اُس کو فکرِ معاش سے کیا کام
صاحبِ فن ہے داد لائے گا

جس کو لینا نہیں کتاب سے کچھ
بوجھ تو وہ بھی لاد لائے گا
شعر کے سامنے عظیم اب کیا
لمحۂ انتقاد لائے گا

○

آپ کے شہر میں کب میری طرف تھا کوئی؟
یہ بھی کیا ہجر گزاری کا شرف تھا کوئی؟
میرے دشمن نے خبر دی کہ بچاؤ سر کو
میرے اپنوں میں کہیں سنگ بکف تھا کوئی
اُس کے اخلاص کی بڑھتی ہوئی شہرت یعنی
وقت کے ہاتھ میں بجتا ہوا دف تھا کوئی
وہ جو دریا میں سمایا تو نہ واپس آیا
راز یہ تھا کہ تہِ آب صدف تھا کوئی
آج آنکھوں کا بھٹکنا مرا حصہ ہے عظیم
کل تو آوارہ نگاہی کا ہدف تھا کوئی

○

ہر خواب سمندر بھی ہے، صحرا بھی ہے، گھر بھی
ہر لمحۂ تعبیر سے ہے پیار بھی، ڈر بھی
دونوں کا گلہ ایک ہی ہے شام و سحر سے
ویران سماعت بھی ہے اور راہ گزر بھی
میں اپنے زیاں کا تجھے کیا حال سناؤں
رستے ہی میں چھوڑ آیا ہوں سامانِ سفر بھی

کنجی سے خزانے کی کسی روز یہ پوچھو
بکتا ہے کہیں شہر میں کچھ ذوقِ نظر بھی
وہ تھا تو ہنرمند بھی تھے خوش بھی تھے عمرانؔ
اب اُس کو بلانے کا نہیں ہم پہ ہنر بھی

○

ربط ہے سرپھری ہواؤں سے
خوف کیا شہر کے خداؤں سے
میری بے سمت سی مسافت کا
اک تعلق ہے ان دِشاؤں سے
دودھ سینوں سے رِس رہا ہے بہت
اور بچّے جدا ہیں ماؤں سے
بوڑھی دادی بھی، رات بھی ہے مگر
دل بہلتا نہیں کتھاؤں سے
صرف تیرا ہی آسرا مولیٰ
مجھ کو محفوظ رکھ بلاؤں سے
سحر انگیز ساعتیں ہیں عظیم
دل ہے مانوس کج اداؤں سے

○

شیشۂ دل میں بند کرلی ہے
ایک صورت پسند کرلی ہے
لہجہ لہجے میں گھل گیا میرے
صورت آنکھوں میں بند کرلی ہے
گنبدِ دل کو چیر جائے گی
ہر صدا اب بلند کرلی ہے

ہوگئی رات گھر چلے جاؤ
اُس نے کھڑکی بھی بند کرلی ہے
ہر زباں سے اٹھالیے ہیں ہاتھ
ہر ادا سودمند کرلی ہے

بیش قیمت ہوئی عظیم اب وہ
اُس نے مٹھی جو بند کرلی ہے

□□

عمیق حنفی

عبدالعزیز حنفی جو اردو دنیا میں عمیق حنفی کے نام سے مشہور تھے، مدھیہ پردیش کے رہنے والے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہونے کی وجہ سے تقریباً پندرہ بیس سال دہلی میں رہے۔ خاموش طبعی اور درویشانہ استغراق کی وجہ سے مشاعروں اور دوسری ادبی سرگرمیوں سے دور رہتے تھے، ویسے بھی عمیق حنفی نظم گو شاعر تھے اور ان کی نظمیں اپنی ہیئت کے لحاظ سے پڑھنے سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔

عمیق حنفی ۳؍نومبر ۱۹۲۸ء کو مہو چھاؤنی، ضلع اندور میں پیدا ہوئے۔ سیاست اور تاریخ میں ایم۔اے تھے۔ مہو میں چند مخصوص دوستوں کی رفاقت اور دوستی نے ان کے شاعرانہ مزاج کی تسکین کے لیے سامان فراہم کیا اور یہی فیضِ صحبت بجائے استاد کے کام آیا۔

عمیق حنفی نے ہندی اشعار اور دیوناگری رسم خط میں ایک کتاب ''سانسوں کا سنگیت'' کی اشاعت کے ساتھ اپنا شعری سفر شروع کیا۔ ''سنگ پیراہن''، ''سند باد''، ''شب گشت''، ''شجر صدا'' اور صلصلۃ الجرس'' اس سفر کے کچھ جانے پہچانے موڑ ہیں۔ نثر میں ان کی چار کتابیں ''شعلے کی شناخت''، ''آئنے کا کورس''، ''استاد رجب علی خاں'' اور ''شعر چیزے دیگر است'' مطبوعہ اور معروف ہیں۔

عمیق حنفی کا انتقال ۱۹۸۸ء کو دہلی میں ہوا۔

نمونۂ کلام:

کھجراہو

ٹاپ لیس اور بیک لیس اور ٹیڈیوں کے دور کی
جسم و جاں کی نامرادی اور گھٹن کو چھوڑ کر
سینۂ ہندوستاں میں چھ صدی پیچھے چلیں

دیکھیں کھجراہو کی دیواروں پہ وحشی نیم وحشی اور مہذب آسنوں میں
چند ننگے اور ادھ ننگے بدن
ہم کنار و بوسہ زن
پتھروں کے مرد وزن
پتھروں کی پنڈلیاں، جانگیں، کمر، کولھے، اُبلتے سینے، جلتے ہونٹ، دہکے گال،
خواہشوں کا پتھروں کے ریشے ریشے میں اُبال
پتھروں کے بجلیائے بال
بے حجابی، وسعتیں، پھیلاؤ آزادی کمالِ لازوال

لمحۂ محویت عیش وصال
اڑتے اڑتے رک گیا، ٹھہرا، مجر ہو گیا
نقش عیش ناتمام
بن گیا ہے پتھروں پر لذتِ عیش دوام
چند ننگے اور ادھ ننگے اشاروں میں مصور سینۂ دیوار پر
آدمی کا پستی، حیوانیت سے رفعت روحانیت تک کا سفر

جسم کی دیوار کے اُس پار

آتما کے ساز کی مدھم مدھر جھنکار
اور اس جھنکار کی چھاتی میں پوری شانتی، کامل سکون
اِک خلائے بے کنار!

تشنّج

آج کس عالم میں ہیں احباب مرے
آنکھ میں تاب وتب ونم کچھ نہیں
دل؟ کسی ریفریجریٹر میں رکھے ہوں گے کہیں
جسم حاضر ہیں یہاں، غائب دماغ
مسکراہٹ، اک لپ اسٹک، خندہ پیشانی: نقاب!
روح: برقعہ پوش: آنکھیں بے حجاب!
کس لیے مجھ کو پریشاں کر رہے ہیں خواب میرے
نیند کے زخمی کفِ پا سے ٹپکتا ہے خود اپنا ہی لہو
خواب میں پھولوں سے آتی ہے خود اپنے خوں کی بو
بے عمل ہوں (خواب میں ہوں) پھر بھی جاری (ایک بے نام ونشاں سی) جستجو
درمیاں سے اس زمیں کو چیرتا جاتا ہے چاکِ ارتقا
موت آ کر کھٹ کھٹاتی رہتی ہے درِ آنکھ کا
کس لیے کھنچتے چلے جاتے ہیں یہ اعصاب میرے
عہدِ نو کے کس مغنی کا جنون
تار سپتک میں انھیں کرتا ہے ٹیون
کون ان تاروں کو اتنا کس رہا ہے
ٹوٹ جائیں گے تو اس نغمے سے بھی محروم ہو جائے گا ساز
جس میں شامل ہے شکستِ ذات کی آواز

تجدید

سُن رہی ہوا اینٹ پتھر کے سرکنے کی صدا
ٹوٹی چھت پر بیٹھ کر آکاش کو تکتی ہو کیا

اس کھنڈر کو چھوڑ کر آؤ چلیں میدان میں
اس طرف وہ جھاڑیوں کا جھنڈ ہے حجلہ نما
آؤ اس میں چل کے ہم اک دوسرے کو دیکھ لیں
اور دیکھیں پتھروں کے یُگ میں کیسا پیار تھا

گھر بنے بگڑے، بسے اُجڑے نگر ہر دور میں
ایک یہ جنگل ہی ایسا ہے کہ جیوں کا تیوں رہا
آؤ چل کر جھاڑیوں کے جھنڈ میں سو جائیں ہم
پھر سے پانے کے لیے اک دوجے میں کھو جائیں ہم

ایک خواہش

تیرا چہرہ سادہ کاغذ
بے تاثر، کورا، کورا،
داغ ہے کوئی نہ کوئی نقش ہے!
کیوں یہ کھڑکی بند ہے؟

آ تجھے اپنے لبوں سے چوم کر
تیرے چہرے کو بنا دوں ایک اچھی سی بیاض

تا کہ اس پر ہر گھڑی بنتے رہیں، مٹتے رہیں
تیرے اندر گھومتے پھرتے ہوئے
ناشنیدہ اور ناگفتہ حروف

آ یہ کھڑکی کھول دوں
تا کہ تیرا اندروں
(تیری پلکوں کی چھتوں تک ہی سہی) باہر تو آئے
سادہ کاغذ پر کوئی تحریر ہو
چوکھٹے میں کوئی تو تصویر ہو۔

ورنہ یہ بن جائے گا اخبار
کاروبار ایں و آں کا اشتہار
وقت کے تلووں سے قطرہ قطرہ خوں
تیرے چہرے پر ٹپکتا جائے گا، جم جائے گا
ناشنیدہ اور ناگفتہ حروف
گڈمڈا جائیں گے (ہو جائیں گے) جمبل اپ، بہم

بند کھڑکی کے پٹوں پر شوخ لڑکے
کچھ کا کچھ لکھتے رہیں گے۔

اتر آئی ہے شام

آنکھ کی پتلی کے دامن میں اُتر آئی ہے شام
دھیرے دھیرے دل کے آنگن میں اُتر آئی ہے شام
پیڑ کی شاخوں پہ جیسے مکڑیوں کا کالا جال تن گیا
ایک اک منظر جو پھیلا پھیل کر بدرنگ دھبّہ بن گیا

جانے کیوں احساس کے تن میں اُتر آئی ہے شام
آنکھ کی پُتلی کے دامن میں اُتر آئی ہے شام

ایک پنچھی پھینکتا ہے سرمئی کالے پروں کو نوچ کر
بیٹھتا جاتا ہے دل پھر کچھ اڑانوں کا نتیجہ سوچ کر
منظروں کی راہ سے من میں اتر آئی ہے شام
آنکھ کی پتلی کے دامن میں اتر آئی ہے شام

زرد سورج تیرتا ہے خود پگھل کر اپنے ہی سیال میں
یا مچھیرا پھنس گیا ہے آپ اپنی خواہشوں کے جال میں
آرزوؤں کے گھنے بن میں اُتر آئی ہے شام
دھیرے دھیرے دل کے آنگن میں اُتر آئی ہے شام

غزل

روئے سخن جناب کی جانب کبھی نہ تھا
آواز کو ادھر بھی اُڑا لے گئی ہوا
جنگل کے ایک گوشے میں تھا میرا نقشِ پا
چل چل کے اس ہجوم نے بالکل مٹا دیا
لو دے اٹھا تھا میری لپٹ سے ہر اک حجاب
دامن ہی بچ گیا تھا، اسے کیوں بچا لیا
گھر میں گھنا اندھیرا ہے باہر سیاہ رات
ایسے میں کس نے خوابِ سحر سے جگا دیا
اندر نقوشِ پا و صدا جاوداں ہوئے
باہر نقوشِ پا و صدا کچھ نہ بچ سکا

□□

عنبر دہلوی

عطاء الرحمٰن عنبر ستمبر ۱۹۴۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور عین جوانی میں ۱۲ر فروری ۱۹۸۳ء کو یہیں کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ اس مختصر سی عمر میں عنبر نے ایک مصائب سے پُر زندگی گزاری، باپ کے انتقال کے بعد تعلیم ادھوری چھوڑ کر خاندان کی کفالت، بیس بائیس سال تک وہ دنیا کی تمام خوبصورتیوں کے عینی شاہد رہے، لیکن بینائی سے محروم ہونے کے بعد زندگی کو اس کی تمام تر اذیت ناکیوں کے ساتھ جیا۔ بصارت سے محرومی کے حادثے پر ان کی فطری صلاحیتوں نے اپنے اظہار کے لیے شعر گوئی کی راہ تلاش کر لی لیکن اس راہ پر وہ ابھی کچھ دور ہی چلے تھے، شاعری کے دامن کو اپنے فکر وفن کے نازک پھولوں سے سجا رہے تھے اور مشاعروں میں اپنے خوبصورت اور پُرسوز ترنم کی بدولت شہرت ومقبولیت کی سیڑھی پر چند ہی قدم رکھے تھے کہ بینائی کی طرح جسمانی صحت نے ساتھ چھوڑ دیا اور وہ بستر پر ایسے گرے کہ پھر مرتے دم تک اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

عنبر دہلوی شاعری میں جناب ضیا خورجوی مرحوم کے شاگرد تھے۔ حیاتِ مستعار کی طرح عنبر کی شاعری کے مہ وسال بھی مختصر ہیں لیکن عنبر کو شاعری کا جو فطری ذوق عطا ہوا تھا اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے اس ابتدائی کلام ہی میں اچھی اور عمدہ شاعری کے وہ نمونے مل جاتے ہیں جو بہت سے شعراء کے یہاں برسوں کے ریاض وتجربے کے بعد بھی آسانی سے

نظر نہیں آتے۔

"تاریک اُجالے" عنبرؔ دہلوی کا مختصر سا شعری مجموعہ ہے جو جنابِ قمر سنبھلی اور جناب شہباز ندیم کی کوششوں سے ۱۹۸۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

کہاں کے پھول شگفتہ کوئی کلی بھی نہیں
بہار ایسی لٹی ہو کبھی، کبھی بھی نہیں

بہار ہو تو جنوں پر شباب آتا ہے
بغیر موسمِ گل، چاک دامنی بھی نہیں

خدا کرے کہ اندھیرے ہی راس آجائیں
ہمیں کچھ اتنی تمنائے روشنی بھی نہیں

بنے ہوئے ہیں وہ خاصانِ میکدہ یارو
جو لوگ واقفِ آدابِ میکشی بھی نہیں

تمام شہر کو ہے آرزوئے خود نگری
کسی کے ہاتھ میں افسوس آرسی بھی نہیں

رہے خیالِ غمِ زندگی کے نوحہ گر
جو غم نہیں تو کوئی لطفِ زندگی بھی نہیں

ہمارے چہرے سے ظاہر اگر نہیں عنبرؔ
مگر جو کیفیتِ دل ہے وہ چھپی بھی نہیں

○

ہے یورشِ غم دل پر دل کشتۂ غم تنہا
اک تم ہی نہیں دل پر مائل بہ کرم تنہا

طالب نہ کبھی ہوں گے ہم تم سے اُجالوں کے
ظلمت کدۂ غم میں مر جائیں گے ہم تنہا
سو نقش اُبھرتے ہیں ماضی کے مرے دل پر
اک لفظِ محبت جب کرتا ہوں رقم تنہا
ہر چیز کی قیمت ہے اے دوست زمانے میں
ہے صرف محبت ہی بے دام و درم تنہا
اوروں پہ تو اُن کے ہیں الطاف و کرم پیہم
عنبرؔ ہیں زمانے میں ہم وقفِ الم تنہا

○

کہاں نہیں ہو، کہاں ہو، ذرا جواب تو دو
تسلّیِ دل و جاں ہو، ذرا جواب تو دو
مرے خیال میں رہ کر مری نگاہوں سے
سبب ہے کیا جو نہاں ہو، ذرا جواب تو دو
خبر بھی ہے تمھیں کچھ اپنے بے نواؤں کی
امیرِ کون و مکاں ہو، ذرا جواب تو دو
رہینِ تیرہ نصیبی رہے گا کیا عنبرؔ
چراغِ نور فشاں ہو، ذرا جواب تو دو

○

چہروں سے ہو کیا دل کے جذبات کا اندازہ
چہروں پہ ہے لوگوں کے آلودگیِ غازہ
ہم نے ہی تو سورج سے آنکھیں بھی ملائی تھیں
ہم کو ہی بھگتنا تھا اس جرم کا خمیازہ
پھر دل کے تڑپنے کی شدّت میں کمی سی ہے
اے نشترِ غم دل کو دے زخم کوئی تازہ

یہ سوچ کے چُنتا ہوں پھر تنکے نشیمن کے
پھر جمع کیا جائے بکھرا ہوا شیرازہ
بیتاب ہے دل عنبرؔ کس طرح انھیں دیکھوں
ہے بند نگاہوں پر اُمید کا دروازہ

○

اگر یہ پوچھ لیا تو مری خطا کیا ہے
''تمھارے جورِ مسلسل کی انتہا کیا ہے''
ازل سے وقت کے ہاتھوں میں اک کھلونا ہوں
خبر نہیں مری تقدیر میں لکھا کیا ہے
تلاشِ صبح تمنا کہاں پہ ٹھیرے گی
یہ کون جانے شبِ غم کی انتہا کیا ہے
لٹے ہوئے تو کسی قافلے کو دیر ہوئی
مگر یہ راہ میں اب تک غبار سا کیا ہے
میں بحرِ زیست میں مثلِ حباب ہوں عنبرؔ
مرے وجود کا مقصد بجز فنا کیا ہے

○

آرزو ہے نہ تمنّا ہے نہ ارماں کوئی
یہ مرا دل ہے کہ ہے خانۂ ویراں کوئی
کیا کریں اُس سے بھلا دل کی تباہی کا گِلہ
جب کہ خود اپنی جفا پر ہو پشیماں کوئی
مضطرب کرتی ہے امّیدِ رہائی کیا کیا
جب بھی آتا ہے قریبِ درِ زنداں کوئی
ہم نے پلکوں پہ اُسے روک لیا ہے عنبرؔ
غم کا آنکھوں میں اُمنڈ آیا جو طوفاں کوئی

□□

عنوان چشتی

شاعر، ادیب، نقاد اور اردو شعر و ادب کے ممتاز استاد عنوان چشتی ۵ رفروری ۱۹۳۷ء کو قصبہ منگلور، ضلع سہارنپور کے ایک ذی علم، دیندار اور صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد پیرزادہ شاہ نورالحسن صاحب مرحوم خانقاہی سلسلے سے تھے اور اپنے وقت کے قطب اور صاحبِ کرامات بزرگ حضرت شاہ عثمان جہانگیری چشتیؒ کی درگاہ اور خانقاہ کے سجادہ نشین اور متولی تھے۔ منگلور اور مظفر نگر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عنوان چشتی نے ایم۔اے (جغرافیہ)، ایم۔اے (اردو)، ایم۔لٹ اور پی۔ایچ۔ڈی کی اسناد حاصل کر کے آگرہ کے ایک کالج سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بہتر سے بہتر کی تلاش میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا شعبۂ اردو جوائن کیا اور دو تین نسلوں کی ذہنی تربیت کرنے کے بعد پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

عنوان چشتی نے غزل سے اپنے ادبی و شعری سفر کا آغاز کیا۔ پہلی شعری تخلیق ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی، جب سے اب تک مسلسل لکھ رہے ہیں۔ نثر میں تنقیدی، تحقیقی اور عروضی موضوعات پر موصوف کی اب تک پندرہ کتابیں، تین سو سے زیادہ مضامین اور تقریباً دو سو، سوا دو سو تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔

عنوان چشتی نے اردو میں ہیئتی تنقید کی بنیادوں کو استوار کیا۔ ان کی تنقیدی کتابوں میں ''عروضی اور فنی مسائل''، ''اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے''، ''اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت''، ''تنقید سے تحقیق تک''، ''معنویت کی تلاش''، ''تنقیدی پیرائے'' اور ''عکس و شخص'' اہلِ نظر سے خراج وصول کر چکی ہیں۔ عنوان چشتی نے ''مکاتیبِ احسن'' (جلد اول و دوم) مع مقدمہ و حواشی مرتب کر کے مکتوباتی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ''نیم باز'' اور ''ذوقِ جمال'' موصوف کے شعری مجموعوں کے نام ہیں جو منظرِ عام پر آ کر مقبول عوام و خواص ہو چکے ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں اردو اکادمی، دہلی نے عنوان چشتی کی شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے شاعری کے سالانہ ایوارڈ سے نوازا۔

عنوان چشتی کا یکم فروری ۲۰۰۴ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

جو اپنے نام نئے آفتاب لکھتے ہیں
وہ صرف میرے مقدر میں خواب لکھتے ہیں

ہماری تشنہ لبی پر نہ جا کہ ہم اکثر
سمندروں کو بھی جوئے کم آب لکھتے ہیں

کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں حق پرستوں میں
جو ''کور ذہن'' کو عالی جناب لکھتے ہیں

تمھارے نام سے منسوب ہے ایک ورق
ہم اپنے دل کی اک ایسی کتاب لکھتے ہیں

ضرور وہ بھی ہیں محروم سرخوشیِ حیات
جو لوگ آب کو پیہم سراب لکھتے ہیں

وہ لوگ روح کی ویرانیوں کو کیا سمجھیں

جو خشک جھیل کو چشمِ پُر آب لکھتے ہیں
ہمارے دوست بھی کیا چیز ہیں کہ گھر بیٹھے
خود اپنے نام ہر اک انقلاب لکھتے ہیں
ہم ایسے درد مزاجوں کا پوچھنا کیا ہے
سکونِ دل کو بھی ہم اضطراب لکھتے ہیں
ہماری تشنہ لبی پر نہ جاؤ اے عنواںؔ
ہم اپنے خونِ جگر کو شراب لکھتے ہیں

○

لہو لہو جو مرا سر مجھے دکھائی دیا
خود اپنے ہاتھ میں پتھر مجھے دکھائی دیا
بصیرتوں میں اضافہ ہوا نشاط کے بعد
نشے میں روح کا منظر مجھے دکھائی دیا
ازل سے ڈھونڈھتا ہوں میں زمین پر جس کو
وہ شخص خواب میں اکثر مجھے دکھائی دیا
ہتھیلی اس کی ہے لیکن لکیریں میری ہیں
کہ ان میں اپنا مقدر مجھے دکھائی دیا
خود اپنے دل میں چبھن سی جو کی کبھی محسوس
تو اس کی آنکھ میں نشتر مجھے دکھائی دیا

○

تری بے وفائیوں سے مرا دل نہیں ہے بدظن
مرے ہاتھ میں ہے اب تک تری جستجو کا دامن
یہ نفس نفس شرارے یہ مژہ مژہ ستارے

ترے غم کی جھلکیوں سے مری زندگی ہے روشن
یہ ہزار سعیٔ پیہم، جو نہ آسکا زباں پر
وہی راز کہہ گئی ہے مرے دل کی ایک دھڑکن
نہ سکوں نہ بے قراری نہ جنوں نہ ہوشیاری
تری یاد کے تصدق کہ ہے ماسوا کی دشمن
مرے آنسوؤں پہ عنواں کوئی مسکرا رہا ہے
مجھے راس آگئی ہے یہ دل ونظر کی الجھن

○

شب کو جاگنا دن کو سونا تیرے نام
خوابوں کو پلکوں میں پرونا تیرے نام
تنہائی ہو یا سنّاٹا تیرے لیے
روح کا پارہ جسم کا سونا تیرے نام
اپنے پرائے غم ہیں ہزاروں دل ہے ایک
کوزے میں دریا کو سمونا تیرے نام
یوں ہی کیا کم بوجھ تھا تن کی مٹّی کا
من کی چادر غم سے بھگونا تیرے نام
تجھ کو دیکھ کے غیر کو دیکھوں ناممکن
سوئیاں آنکھوں میں چبھونا تیرے نام
میرے لیے ہے اسمِ اعظم نام ترا
اپنے نام سے وحشت ہونا تیرے نام
راہِ طلب میں ہوش نہیں ہے سجدوں کا
سمتوں کا احساس بھی کھونا تیرے نام
قتل بھی میں قاتل بھی میں مقتول بھی میں

ہاتھ اپنے ہی خون سے دھونا تیرے نام

○

تعصب کی فضا میں طعنۂ کردار کیا دیتا
منافق دوستوں کے ہاتھ میں تلوار کیا دیتا

امیرِ شہر تو خود زرد رو تھا ایک مدّت سے
جھروکے سے وہ اہلِ شہر کو دیدار کیا دیتا

ہمارے دن کو جو دیتا نہیں اک دھوپ کا ٹکڑا
ہماری رات کو وہ چاند کا معیار کیا دیتا

خود اس کا سایہ بھی اس سے گریزاں ہے مصیبت میں
میرا ہم سایہ مجھ کو سایۂ دیوار کیا دیتا

بہت دشوار ہے خود دار ہوکر زندگی کرنا
خوشامد کرنے والا صدقۂ دستار کیا دیتا

یہ جبرِ شہر ہے عنوانِ انساں پر کہ بچوں کو
محبت بھی نہ دے پایا تو پھر اقدار کیا دیتا

○

ابھی سے نیزے پہ قرآن درمیان میں ہے
مرے حریف میرا تیر ابھی کمان میں ہے

عجیب شخص ہے، جادو سا کیا بیان میں ہے
زبان میں ہے دل اُس کا کہ دل زبان میں ہے

پہاڑ کاٹ رہا ہوں تراشنے کے لیے
وہ اک شبیہ جو پنہاں کسی چٹان میں ہے

بلندیوں سے اُترنے میں دیر ہو شاید
ہوس کا شوخ پرندہ ابھی اُڑان میں ہے

فغاں کہ ہاری ہوئی جنگ کے محاذ پہ ہوں

ہے تیر اپنا ، مگر غیر کی کمان میں ہے
اُسی کے دم سے بچی آبرو قبیلے کی
وہ ایک شخص جو آوارہ خاندان میں ہے
ہوس کے بوڑھے شکاری نے آہ بھر کے کہا
تھکا ہوا ہے پرندہ، مگر اُڑان میں ہے
سرائے جاں کے مسافر کو کیا کہا جائے
کرایہ دار ہوں میں، اور وہ مکان میں ہے
یہ ایک دوست نے لکھا ہے خط میں اے عنوانؔ
”تری جگہ مری پلکوں کے سائبان میں ہے“

□□

غلام احمد علمی

شاہ غلام احمد علمی ۷ر جون ۱۹۲۷ء کو اتر پردیش کے ضلع بلیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پرانی دہلی کی مشہور درسگاہ فتح پوری مسلم سینئر سیکنڈری اسکول میں عربی و فارسی کے استاد اور حضرتِ مشیر جھنجھانوی کے رفیقِ کار تھے۔ انگریزی، عربی، فارسی، اردو اور ہندی زبانوں کے ادب پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اسکول کے اوقات کے بعد ناخواندہ افراد اور اردو سیکھنے کے خواہشمندوں کو اردو پڑھانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

کم گو تھے اور جو کچھ کہا وہ اردو تدریس کی ہمہ وقت مصروفیتوں کی نذر ہو گیا۔ مئی ۲۰۰۳ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا اور دہلی گیٹ قبرستان میں مدفون ہوئے۔

نمونۂ کلام:

غزل

میں نے تجھ کو ترے انداز سے پہچان لیا
جنبشِ چشمِ فسوں ساز سے پہچان لیا
تجھ کو بھی مجھ سے لگاوٹ ہے یقیناً اے دوست
اضطرابِ نگہِ ناز سے پہچان لیا
اور طائر بھی تو سرگرمِ سفر تھے لیکن
مجھ کو صیاد نے پرواز سے پہچان لیا
یہ حجاباتِ نظر کچھ بھی نہیں ہے اے دوست
میں نے تجھ کو تری آواز سے پہچان لیا

○

محفلِ عشق کا دیا ہوں میں
تند جھونکوں میں جل رہا ہوں میں
لوگ اس طرح مجھ سے بچتے ہیں
وقت کا جیسے حادثہ ہوں میں
میرا چہرہ بھی تیرا چہرہ ہے
غور سے دیکھ آئینہ ہوں میں
اس قدر سہل مت سمجھ مجھ کو
ایک پیچیدہ مسئلہ ہوں میں
فیصلہ ہو چکا ہے روزِ ازل
زندگی جرم ہے سزا ہوں میں

میرا قبضہ ہے ان سفینوں پر
تو خدا ہے تو ناخدا ہوں میں
سنگ ریزہ سہی مگر علمی
عرش سے ٹوٹ کر گرا ہوں میں

○

ہر سمت تیرگی ہے نشیمن جلائیں ہم
صحنِ چمن میں جشنِ چراغاں منائیں ہم
داغوں سے دل کے درد کا سورج اُگائیں ہم
ہر شامِ زندگی کو درخشاں بنائیں ہم
بچھڑے تھے جس مقام سے مل جاؤ پھر وہیں
راہیں بدل گئی ہیں تمھیں بھی دکھائیں ہم
ہم نے کس اہتمام سے کاٹی ہے زندگی
اے انقلابِ وقت تجھے کیا بتائیں ہم
یہ سلسلہ ازل سے ابد تک دراز ہے
کب تک سنو گے اور کہاں تک سنائیں ہم

□□

غلام احمد فرقت کاکوروی

غلام احمد فرقت کاکوری کے ایک ذی علم مگر متوسط خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اردو کے مشہور صحافی، روزنامہ حقیقت لکھنؤ کے بانی و مدیر اعلیٰ جناب انیس احمد عباسی کے بھانجے اور خویش تھے۔ بچپن میں سایۂ پدری سے محروم ہونے کی وجہ سے کھیلنے، کودنے اور اسکول جانے کی عمر سخت نامساعد حالات اور معاشی بحران میں گزری مگر ماں بہنوں کی کفالت کا بوجھ اور کسبِ معاش کی فکر ان کے ذوقِ تحصیلِ علم پر فتح نہ پاسکی۔ انھوں نے ورثے میں ملی ہوئی ذمہ داریوں اور اپنے خاندان کی تعلیمی بہرہ مندی کی روایت سے رشتہ جوڑنے کے لیے اُن بدترین حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا، لکھنؤ کے بازاروں اور گلی کوچوں میں سائیکل پر اخبار بیچے، کتب فروشی کی، امین آباد میں درزی کی دکان پر کپڑے سینے کا کام کیا، ٹیوشنز اور جزوقتی نوکریوں کے ساتھ اپنی فطری بذلہ سنجی کے جلو میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور لکھنؤ، علی گڑھ جیسی دانش گاہوں سے دو مضامین میں ایم۔ اے اور بی۔ ایڈ کی ڈگریاں لے کر معلمی کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ معلمی کا پیشہ انھیں تاریخ کے استاد کے طور پر دہلی کی قدیم ترین درسگاہ اینگلو عربک اسکول میں لے آیا جہاں انھوں نے لگ بھگ تین دہوں تک پرانی دہلی کے مسلمان لڑکوں کی ذہنی آبیاری کی۔

شعر و ادب کی دنیا میں طنز و مزاح ان کا خاص میدان تھا۔ عام طور پر مزاح نگار نظم و

نثر میں سے کسی ایک ہی صنف میں اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت کے جوہر دکھاتے ہیں اور طنز و مزاح کی کاشت کرتے ہیں، لیکن غلام احمد فرقت شوکت تھانوی کی طرح اردو کے ان چند مزاح نگاروں میں سے تھے جو طنزیہ، مزاحیہ نظم و نثر لکھنے پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ خوبصورت پیروڈیاں لکھنے میں انھیں بے پناہ دسترس حاصل تھی۔ ان پیروڈیوں کے حوالے سے بھی وہ اردو دنیا میں طنز و مزاح کے شاعر کے طور پر مشہور ہوئے۔

''کفِ گل فروش''، ''قد مچے''، ''ناروا'' ان کے نثری اور شعری مجموعے ہیں جو چالیس پچاس کے دہوں میں منصۂ شہود پر آئے لیکن اب نایاب ہیں۔

۱۳رجنوری ۱۹۷۳ء کی شب میں پٹنہ کے ایک مشاعرے میں شرکت کے بعد دہلی واپس لوٹتے ہوئے مغل سرائے اور بنارس کے درمیان ٹرین میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ریلوے پولس کے عملے نے ان کی جیب سے برآمد ڈائری میں لکھے ہوئے پتے پر گھر والوں کو مطلع کرنے کی بجائے لاوارث قرار دے کر بنارس کے کسی قبرستان میں دفن کر دیا۔

نمونۂ کلام:

پیروڈی

شبستاں کے قریب

شب کے سناٹے میں تیری خواب گاہِ ناز سے

کچھ دور اٹھلاتا ہوا

میں دیکھتا ہوں

اک گدھا

ہاں

اک گدھا

خالص

گدھا

بالکل
گدھا
سچ مچ کا ایکٹنگڑا
گدھا
معصومیت کا بادشاہ
مظلومیت کا ناخدا
خرمستیوں سے کھیلتا
تیرے محل کو دیکھتا
کچھ چیختا کچھ رینکتا
گردن کچھ موڑے ہوئے
کل رسیاں توڑے ہوئے
تو نے کبھی دیکھا بھی ہے
اور یہ کبھی سوچا' بھی ہے
کس کی نظر کا صید ہے
کیا راز ہے کیا بھید ہے
مجھ کو نہیں معلوم مگر
مجھ کو ہے سب اس کی خبر
لیکن نہ میں اس راز کو
تجھ سے کبھی بتلاؤں گا
تیرے حریم قلب کو
ہرگز نہ میں لرزاؤں گا
دہلاؤں گا
ٹھہراؤں گا۔
جانے بھی دے

جانے بھی دے

اس بات کو

اس رات کو

جب میں نے دیکھا تھا گدھا

خرمستیوں کی چھاؤں میں

تیرے شبستاں کے قریب

لیکن غسل خانے میں، میں

خاموش واکڑوں بیٹھ کر

یہ سوچ کر اکثر ہنسا

یہ حسن بھی کیا چیز ہے

اک عشق کی دہلیز ہے

جس سے نہ دنیا بچ سکی

کیا جانور کیا آدمی

سب ہی کو ہے اس کی لگن

خرمستیاں سب کرتے ہیں

لیکن نہ میں اس راز کو

تجھ سے کبھی بتلاؤں گا

لرزاؤں گا

دہلاؤں گا

یعنی کہ تیرے حسن پر

گدھے بھی ہیں مچلے ہوئے

تیرے شبستاں کے قریب

بچّہ کشوں کے دیس میں

ہم نشیں مت پوچھ شادی کا سماں
آہ اے جنت نشاں ہندوستان
اس جگہ گر آج شادی کیجیے
دوسرے ہی دن سے اولادوں کے ویگن لیجیے
اور اس ویگن میں پھر
بچوں کا شور
سب کا نچوڑ
کچھ آپ کا، کچھ آپ کا، کچھ آپ کا
کان میں ماں باپ دے لیں انگلیاں
بھول جائیں پی کہاں
اور گھبرا کر کہیں
یہ کیا ہوا؟
اور اس پر سب کہیں۔ ''اچھا ہوا''
دیس کی زینت بڑھی
عزت بڑھی، شہرت بڑھی
جو کیا اچھا کیا۔ جو کچھ ہوا اچھا ہوا
اور پھر
ہر فرد کی یہ مانگ ہو
آسماں بچّوں کا ہو
سارا جہاں بچّوں کا ہو
ساری زمیں بچّوں کی ہو

باغ ہوں بچوں کے سائے گلستاں بچوں کے ہوں
پاس بال بچوں کے ہوں
اور باغ بال بچوں کے ہوں
چاندنی بچوں کی ہو
اور چاند ہو بچہ بدوش
تا کہ ہر شے دیس کی آئے نظر بچہ فروش
اور ہر دم بس یہی اک فکر ہو
اولاد ہی کا ذکر ہو
ہر سمت چاہے کال ہو
سارا جہاں پامال ہو
بدحال ہو بے حال ہو
کنگال ہو
بچوں سے مالا مال ہو
گھر میں اگر کھانا نہیں
پانی نہیں دانا نہیں
دولت نہیں، ثروت نہیں
شہرت نہیں، عزت نہیں
چاہے کوئی ناشاد ہو
آباد ہو، برباد ہو
پر گود میں اولاد ہو
گھر میں اگر چلمن نہیں
روزن نہیں آنگن نہیں
اک شمع تک روشن نہیں
آٹا نہیں راشن نہیں۔ پر سوچ تو اے ہم نشیں

بچہ نہیں تو کچھ نہیں

اس دیس میں جو مرد ہے، بچہ کشی میں فرد ہے

گولا کھ چہرہ زرد ہے

دو چار کا داماد ہے

پھر بھی بڑا آزاد ہے

اور صاحبِ اولاد ہے

اک دن سفر کو ہم چلے

اور ریل میں داخل ہوئے

بچوں سے ہم منہ موڑ کر

سارے کلنڈر چھوڑ کر

کچھ اس طرف کچھ اُس طرف

گھیریں گئیں، سیٹیں تمام

رکھا مگر یہ اہتمام

سارے مسافر ہوں کھڑے

ہر سمت ہوں بچے پڑے

اک شور و ہنگامہ رہے۔ گردش میں پیانہ رہے

کوئی جیے چاہے مرے۔ اپنا سفر اچھا کیے

بچوں کی پیدائش میں ہم

چیں پیں کی آلائش میں ہم

وقفے کبھی دیتے نہیں

لڑکی ملے، لڑکا ملے

لولا ملے، لنگڑا ملے، پوتی ملے پوتا ملے

ٹیڑھا ملے سیدھا ملے

ہر سال کچھ ملتا رہے اور بھولا ناک کھاتا رہے

جب جانکی کا گھر بسا اور آٹھواں بچہ ہوا

بولی یہ سن کر جانکی

"سب دین ہے بھگوان کی"

باوا نے پوچھا کیا ہوا؟

بولیں کہ پھر لڑکا ہوا

بولے ——— چلو اچھا ہوا، اولاد کا کوٹا بڑھا

بولیں کہ یہ کیا کھائے گا اس کے لیے کیا آئے گا

کیوں کر یہ پالا جائے گا

بولے یونہی پل جائے گا

اس کی ابھی سے فکر کیا، اس گلا بھی سے ذکر کیا

ہم سے فقیروں کو یہاں

اتنی بھلا مہلت کہاں

اولاد بھی پیدا کریں اور بیٹھ کر سوچا کریں

——— یہ سب کہاں سے کھائیں گے؟

——— پیسے کہاں سے لائیں گے؟

——— کپڑا کہاں بنوائیں گے؟

یہ کام ہے سرکار کا اس سے ہمیں کیا واسطہ

ہاں ——— گر حکومت یہ کہے

بچے نہ اب پیدا کرو

کوئی نیا دھندا کرو

اس بات پر ان سے کہو ——— "فوراً وزارت توڑ دو"

——— ہم کو ہمیں پر چھوڑ دو اور کرسیاں خالی کرو

بچوں کی رکھوالی کرو، ہم سب کی نقالی کرو
یہ کام ہے اولاد کا ــــــ ماں باپ کا
یہ اپنا اپنا کار ہے
آزادیٔ اظہار ہے
سرکار پر کیا بار ہے
ہر فرد ذمہ دار ہے
اولاد کا افتاد کا
غلّہ نہ ہو پیسہ نہ ہو
کپڑا نہ ہو لتّا نہ ہو
چڑیا کا اک بچّہ تو ہو
وہ ــــــ جن کا بہتر حال ہے ان کا بھی یہ احوال ہے

جب سائیکل پر چل دیے
کُل فیملی اپنی لیے
دو ٹوکری میں ہیں نہاں
دو کا ہے ڈنڈے پر مکاں
شانوں کو دو پکڑے ہوئے، گردن میں دو جکڑے ہوئے
ہے کیریر پر ماں لدی
لڑکی ہے کھونٹی پر بندھی
سائیکل نے فرّاٹے بھرے
لڑکوں نے خرّاٹے بھرے
پھر زن زنا زن زن زنن
زن زن زنا زن زن زنن

"اے لو وہ سرکس آ گیا" اک ماں نے بیٹی سے کہا
یہ سائیکل سرکس کی ہے
جس پر وہ عورت ہے لدی
پوچھو کہاں پر ہے لگا۔ سرکس جو ہے آیا ہوا
گویا پتہ اس سے چلا
بازار کی زینت ہیں ہم
کونین کی قیمت ہیں ہم
سڑکوں پہ جس دم کیو لیے
بچوں کا پورا دیو لیے بازار کو جاتے ہیں ہم
احسان فرماتے ہیں ہم
جن جن کو اکساتے ہیں ہم
ان کی ڈپٹ کھاتے ہیں ہم
ان جھڑکیوں کے زور میں
ان گھڑکیوں کے شور میں
سب کہتے ہیں "دم لیجیے"
واللہ اب بس کیجیے
لیکن یہ ہمت دیکھیے
یہ نیک طینت دیکھیے
اس دھونس میں آتے نہیں
دنیا سے شرماتے نہیں
چپکے چلے جاتے ہیں ہم
اک اپنا پورا کیو لیے۔

گدھا کانفرنس

اسٹرائک کی وبا شہر میں جس دم پھیلی
نعرے ہر سمت لگے "شور ہوا" دھوم مچی
اڑتی پڑتی یہ خبر جبکہ گدھوں تک پہنچی
پھر تو ان قبلہ و کعبہ کی بھی شہ رگ پھڑکی
ڈھینکیں جھاڑ کے سب آ گئے میدانوں میں
پچھلی ٹانگوں سے یہ داخل ہوئے فرزانوں میں

ان میں دو چار کچھ اس زور میں بھنّائے تھے
کٹ کٹا کر کئی کھوٹوں کو تڑا لائے تھے
جو گدھا مار بہ اندازِ دگر کھائے تھے
رینگتے رینگتے وہ گھاٹ سے بھاگ آئے تھے
رینکیں ایسی تھیں کہ ایوان ہلے جاتے تھے
آسماں اور زمیں ڈر سے ملے جاتے تھے

ڈھینچوں ڈھینچوں کی صداؤں میں تھا اک جمِ غفیر
ساری خلقت نظر آتی تھی گدھوں کی جاگیر
ان کی ہر مانگ تھی اک زہر میں ڈوبا ہوا تیر
عقل سے دست و گریباں تھی، گدھوں کی تقدیر
ان کی مانگوں میں بس اک راز یہ سربستہ تھا
یعنی "ہر فرد" بغاوت پہ "کمر بستہ" تھا

اک گدھا جو کہ کہن سال و جہاں دیدہ تھا
اور کئی میل کی دوری سے بھی لگتا تھا گدھا
سب گدھوں نے اسے جلسے کے لیے صدر چنا
ڈھینکیں جھاڑ کے مجمع نے بالاعلان کہا
صدر زندہ ہے تو اب ہم نہ کبھی بھٹکیں گے
شیر بھی سامنے آجائے تو دے پٹکیں گے

سُن کے یہ نعرہ اٹھا ایک جواں سال گدھا
دندناتا ہوا اسٹیج تلک جا پہنچا
صدرِ جلسہ کے جو آتے میں ہوا کچھ وقفہ
اپنی "خرعقلی" سے وہ اس کو غنیمت سمجھا

اس نے پہلے تو ذرا اپنا گلا صاف کیا
اور پھر رینک کے اس طور سے اک دم ڈہکا

کون سا ملک ہے دنیا میں جو ہم سے بچا؟
کون کہتا ہے کہ کابل میں نہیں کوئی گدھا
کون اعزاز ہے قدرت نے نہ ہو جو بخشا
ہم کو ایران میں اور مصر میں کیا کچھ نہ ملا

جہاں انگور سا میوہ بھی پٹاری میں رہے
ہم وہاں شاہ کی ہر آن سواری میں رہے

اتنا کہہ پایا تھا مظلوم کہ پھر شور مچا
سُن لیا، سُن لیا، بس بیٹھ، اے بیٹھ بھی جا
"کرکری" اپنی سمجھ کر وہ کچھ اس درجہ تپا
رینگتا ہی رہا جب تک کہ وہ جلسے میں رہا

اپنی توہین پر اس درجہ بھرا بیٹھا تھا
جھاڑ دیتا تھا "دولتی" جو اسے روکتا تھا

صدر کا پھر تو قیام ایک بلندی پہ ہوا
پچھلے سُم ٹیک کے پھر صدر نے خطبہ یہ دیا
بھائیو! آپ گدھے آپ کا ہر فرد گدھا
پھر بھی یہ فخر ہے کیا کم کہ وہ ویسا ہی رہا

ہم تو کعبہ بھی گئے اور کلیسا بھی گئے
جیسے پہلے تھے پلٹنے پہ بھی ویسے ہی رہے

ہم لٹے حالوں میں خچر سے کہیں بہتر ہیں
جس کی ہر نسل میں دو ایک بڑے پچر ہیں
نسل میں حضرتِ انساں سے بھی برتر ہیں
خدمتِ خلق میں جب دیکھیے تب "لیس سر" ہیں
گھاٹ جانے بھی کبھی ہم نے کیا فیل نہیں
چاند میں میل نکل آئے یہاں فیل نہیں

ہم گدھے لاکھ سہی پھر بھی پرکھتے ہیں نظر
اور انساں سے کہتے ہیں کہ اللہ سے ڈر
اپنی ہستی کو نہ بھول اور نہ اپنے سے گزر
"خاکسارانِ جہاں رابہ حقارت منگر"
ہے اگر زعم تجھے خاک میں مل جائے گا
اور ہستی کا کہیں پھر نہ پتا پائے گا

گو گدھا آپ کا ہر حکم بجا لاتا ہے
پھر بھی رہ رہ کے یہی دل میں خیال آتا ہے
جتنا مظلوم ہے جو، اتنی سزا پاتا ہے
سچ تو یہ ہے کہ بندھا مار یہاں کھاتا ہے
آپ بتلائیں کہ اس ظلم کی کچھ تھاہ بھی ہے
آخر اس جور سے بچنے کی کوئی راہ بھی ہے

کھینچ کر مار دیا جس نے ہمیں جو چاہا
اور اس مار پہ شکوہ، نہ شکایت، نہ گلا
کوئی پوچھے تو یہ انسان سے اندھیر ہے کیا
نام ہم سارے وفاداروں کا رکھا ہے گدھا
مصر والوں کی نگاہیں ہیں حقیقت میں کھری
اس لیے ان کو ہم اس جرم سے کرتی ہیں بری

حج سے واپس ہوئے جس دم کہ یہاں رمضانی
وہ بھگل بدلی کہ صورت نہ گئی پہچانی
ہم نے یہ وضع نہ سیکھی، نہ ابھی تک جانی
ایک ہی وضع پہ قائم رہے ہم سیلانی

ہم تو دنیا میں فقط ایک ہی جادہ پہ رہے
انقلاب آئے مگر ہم رہے ویسے ہی گدھے

ہم سے انسان سے اب ہو نہیں سکتا ہے نباہ
اس نے وہ ظلم کیے ہیں کہ معاذاً باللہ
عشق میں کس کا نہیں نامۂ اعمال سیاہ
پھر اگر ہم نے کیا عشق تو کیا اس میں گناہ

ہم پہ وہ مار پڑی، جو نہ پڑی مجنوں پر
گو وہ تقصیر میں ہم سے تھے کہیں بڑھ چڑھ کر

جوش میں آ کے گدھے کھال جو پھڑکاتے تھے
سخت گرمی میں بھی جاڑوں کے مزے آتے تھے
کچھ جو ڈر ڈر کے نظر دور پہ دوڑاتے تھے
ان کو ہر چیز میں "دھوبی" ہی نظر آتے تھے

بعد خطبے کے تجاویز کا نمبر آیا
ان تجاویز کو پھر صدر نے یوں فرمایا

اولاً یہ کہ ہمیں صبح " املتاس " ملے
اور جاڑوں میں ہمیں ریشمی چپراس ملے
ہم کو "بونس" جو ملے اس میں اننناس ملے
اک نئی زین ملے ایک نئی راس ملے

اب کے جاڑوں میں اگر جھول نہیں پائیں گے
جس طرف سینگ سمائیں گے، نکل جائیں گے

آج سے کوئی گدھی، اپنی اگاڑی نہ بندھائے

باندھ دیں گر وہ اگاڑی تو پچھاڑی نہ بندھائے

جبر یہ جوتیں جو گاڑی میں تو گاڑی نہ بندھائے

گر، پہاڑی کے بھی باندھیں تو پہاڑی نہ بندھائے

باندھ کر دُم میں جو پیپے ہمیں دوڑاتے ہیں

جان جاتی ہے یہاں، ان کو مزے آتے ہیں

زچہ خانے کی گدھی پر کوئی لادی نہ لدے

کوئی شرّی نہ لدے، کوئی فسادی نہ لدے

کوئی دھوبی نہ لدے، دھوبی کی دادی نہ لدے

کبھی ریشم نہ لدے اور کبھی کھادی نہ لدے

گر نہ لادی سے اماں اپنی گدھی پائے گی

مار کر لات وہ ندی میں گرا آئے گی

اور یہ بات، کہ تم نام گدھے کا لو

دوسرے یہ کہ گدھا مت ہم کو

تیسرے کام کے اوقات معین کر لو

کام کے بعد کبھی رانگ سواری مت لو

اتنی مانگوں کا اگر کوئی مداوا نہ ہوا

کل سویرے سے کوئی گھاٹ نہ جائے گا گدھا

اب ادھر سنیے ذرا کاتبِ قسمت کا لکھا

یعنی اک دھوبی نے سُن پایا جو جلسے کا پتہ

بس کھڑے گھاٹ، جولیٰ صور کو اس نے پھونکا

ایک اک دھوبی چلا ہاتھ میں لے کر ڈنڈا

مشق کرتے ہوئے ڈنڈوں سے جو پہنچے دھوبی

ذرہ ذرہ نے صدا کہ ہوئی سر کوبی

دھوبی اس واسطے کچھ اور بھی گھبرائے تھے
ان میں کچھ لادیاں مالک کی اٹھالائے تھے
پیستے دانت وہ غصّے میں بھرے آئے تھے
اور بھُس بھرنے کی سب دل میں قسم کھائے تھے

کچھ عجب طور کی گردوں پہ گھٹا طاری تھی
اس طرف رزم، ادھر بزم کی تیاری تھی

جب دبے پاؤں وہاں آن کے چھل بل دیکھی
دیکھ کر اُن کی خوشی ہنس دیے خود بھی دھوبی
اتنے خوش تھے کہ کسی کی نہ نظر اس پہ گئی
کہ اجل سامنے ہے بھیس میں دھوبی کے کھڑی

اپنے ساتھی سے کسی دھوبی نے چلّا کے کہا
"ابے وہ دیکھ وہ ٹیلے پہ ہے بھیگو کا گدھا"

اتنا سننا تھا کہ ان سب میں ہوئی اک ہلچل
صدریک کے منہ سے گئی زور سے اک رینک نکل
اُس کا رینک سننا تھا کہ وہ سب ہوئے اتنے بیکل
شیخیں جھاڑتے نظروں سے ہوئے سب اوجھل
صدریک پر موت کی ہیں پھر تو غشی طاری تھی
کان جنبش میں تھے، پرواز کی تیاری تھی

صدریک کے حال کا اس جا کوئی پرساں نہ ہوا
ان کا سایہ بھی شریکِ غمِ ہجراں نہ ہوا
ہنسنے والے تھے سبھی، کوئی بھی گریاں نہ ہوا
دوستوں میں بھی کوئی چاکِ گریباں نہ ہوا

جتنے دھوبی تھے وہ سب آپ پہ جب ٹوٹ پڑے
کبھی جوتے کبھی چپل، کبھی فل بوٹ پڑے

غلام ربّانی تاباںؔ

ترقی پسند تحریک کے جلو میں ادبی منظرنامے پر ابھرنے والے اکثر شعراء تحریک کی چکاچوند مدھم پڑ جانے اور عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچنے کے بعد ٹھہر گئے اور عام مشاعرہ باز شاعروں کی طرح اپنی پرانی چیزوں کو دہرانے لگے، لیکن غلام ربانی تاباںؔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ اُن چند گِنے چنے شاعروں میں سے تھے جن کے تخلیقی سوتے تادمِ آخر خشک نہیں ہوئے اور نہ ہی تحریک کے تعلق سے اُن کے قویٰ میں تکان کے آثار نظر آئے۔ وہ زندگی کے آخری سانس تک ترقی پسند تحریک سے عملی طور پر وابستہ رہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی توانائی و تازگی کا ثبوت دیتے رہے۔

غلام ربانی تاباںؔ قائم گنج کے ایک ذی علم اور متمول خانوادے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جان عالم خاں صاحب کا قائم گنج کے معزز ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ تاباںؔ نے آگرہ کے سینٹ جانسن کالج میں تعلیم پائی اور ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ شاعری کا شوق ابتداء سے تھا، طالب علمی کے زمانے سے شعر کہنا شروع کیا۔ فتح گڑھ میں وکالت شروع کی۔ فتح گڑھ میں وکالت پر کم اور شاعری پر زیادہ توجہ رہی، چنانچہ اپنے بارے میں خود لکھتے ہیں کہ ''قائم گنج میری جسمانی جنم بھومی ہے اور فتح گڑھ ادبی۔ غلام ربانی قائم گنج

میں پیدا ہوا تھا اور تاباںؔ فتح گڑھ میں"۔

سیاسی نظریات کی وجہ سے ۱۹۴۹ء میں نظر بند کر دیے گئے۔ جس کی وجہ سے ان کے والد اور گھر کے دوسرے افراد ناراض ہو گئے۔ جیل سے رہائی کے بعد سیاسی اختلافات اتنے بڑھے کہ تاباںؔ نے وکالت ترک کر دی اور نئی منزل کی تلاش میں حیدر آباد اور بمبئی کی خاک چھانتے ہوئے دہلی پہنچے، جہاں ان کی شاعری اور شخصیت کو فروغ ملا۔ اس وقت تک عام ترقی پسند شاعروں کی طرح تاباںؔ بھی صرف نظم گو شاعر تھے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "سازِ لرزاں" ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا، جو نظموں پر مشتمل تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد تاباںؔ نے غزل گوئی اختیار کر لی اور غزلوں کے متعدد مجموعے شائع کیے جن میں "حدیثِ دل" ۱۹۶۰ء، "ذوقِ سفر" ۱۹۷۰ء، "نوائے آوارہ" اور "غبارِ منزل" شامل ہیں۔

حکومتِ ہند نے تاباںؔ کی شعری و ادبی خدمات کے صلے میں "پدم شری" کے اعزاز سے نوازا جسے فرقہ وارانہ فسادات پر احتجاج کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے واپس کر دیا۔ اردو اکادمی، دہلی نے ۱۹۸۶ء میں "کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ" دے کر غلام ربانی تاباںؔ کی شعری و ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔

تاباںؔ کی زندگی کا بیشتر حصہ جامعہ میں گزرا اور انھوں نے ۷ رفروری ۱۹۹۳ء کو اوکھلا کے ذاکر نگر میں آخری سانس لی، لیکن اُن کا جسدِ خاکی اُن کے آبائی قصبے قائم گنج لے جایا گیا اور خاندانی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

نمونۂ کلام:

غزل

کبھی جلوہ جلوہ رُخِ نظر، کبھی بام و در میں اُلجھ گئی
اُسے کون بادِ صبا کہے جو شجر شجر میں اُلجھ گئی

کبھی نا تمام سی قربتیں، کبھی نا تمام سی دوریاں
مری رہ گزر تھی کہ بے طرح تری رہ گزر میں اُلجھ گئی

کسی داستان سے عجیب تر مری زندگی کی حقیقتیں
وہ فروغِ درد کی رات تھی جو کسی سحر میں اُلجھ گئی

میں چلا تو میری نگاہ میں کوئی خواب تھا نہ سراب تھا
سرِ رہ گزر کوئی آرزو بھی مری نظر میں اُلجھ گئی

رہِ وزمِ شوق کی قید بھی بڑی خوشگوار سی قید تھی
مجھے یوں لگا کوئی شاخِ گل مرے بال و پر میں اُلجھ گئی

کوئی رنج ہے نہ ملال ہے، مجھے صرف اتنا خیال ہے
وہ عجیب دانشِ عصر تھی جو تلاشِ زر میں اُلجھ گئی

○

لمحہ درد کو اعجاز تمنا جانو
ظرف کی بات ہے قاتل کو مسیحا جانو

ایک ہیں موجِ صبا، موجِ شرر، موجِ نمو
پھول کھل جائیں تو ظالم کا سراپا جانو

تم نے کب دیکھے وہ لمحے جو گزرتے ہی نہیں
درد کی رات کسے کہتے ہیں تم کیا جانو

وقت بے درد سہی، ساقی بے فیض سہی
مے کشو تلخی ایام کو صہبا جانو

آرزو سرکش و بے باک ہوئی جاتی ہے

شوق کہتا ہے تغافل کو تقاضا جانو

یوں تو ہر جلوۂ رنگیں کو تماشہ سمجھو

اُن کی محفل میں مگر خود کو تماشا جانو

عشق کرنا ہے تو آدابِ وفا بھی سیکھو

زہر پینا ہے تو پینے کا سلیقہ جانو

دل میں خوں گشتہ تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں

اب یہ تم پر ہے چمن سمجھو کہ صحرا جانو

کیسے گزرو گے مراحل سے سفر کے تاباںؔ

تم کہ منزل سے شناسا ہو نہ رستا جانو

O

لوگ حالات سے مجبور بھی ہوتے ہوں گے

پاس آنے کے لیے دور بھی ہوتے ہوں گے

جن کی قسمت میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

ان کے خوابوں میں کئی طور بھی ہوتے ہوں گے

طنز کے سنگ کبھی تہمت والزام کے سنگ

آئینے روز یہاں چور بھی ہوتے ہوں گے

جو گزرنا ہے سفینوں پہ گزر جائے گی

ورنہ دریا تو بدستور بھی ہوتے ہوں گے

زخم پہ زخم شکستوں پہ شکستیں کھا کر

آدمی ہیں کبھی مغرور بھی ہوتے ہوں گے

لب پہ سامانِ تبسم کی نمائش تاباںؔ

اور دل میں کئی ناسور بھی ہوتے ہوں گے

○

لطف کا ربط ہے کوئی نہ جفا کا رشتہ
دل سے کچھ اور ہے ظالم کی انا کا رشتہ

دستِ عیسیٰ بھی وہی بازوئے قاتل بھی وہی
کتنا نازک ہے چراغوں سے ہوا کا رشتہ

جبرِ حالات کہو، غم کی مکافات کہو
ٹوٹ بھی جاتا ہے ہونٹوں سے نوا کا رشتہ

سوچیے تو سبھی اپنے ہیں کوئی غیر نہیں
حاکمِ شہر سے ہے جرم و سزا کا رشتہ

منظرِ زیست میں کچھ رنگ تو بھر دیتا ہے
خار زاروں سے کسی آبلہ پا کا رشتہ

پھول نایاب سہی، زخم تو نایاب نہیں
آج بھی دل سے رہا آب و ہوا کا رشتہ

کیا کریں رسمِ زمانہ کی شکایت تاباںؔ
درد سے رکھتے ہیں ہم لوگ سدا کا رشتہ

○

جرمِ احساس کی فطرت نے سزا دی ہے مجھے
ہونٹ جل جاتے ہیں جس سے، وہ نوا دی ہے مجھے

میں تو سمجھا تھا کہ سب ٹوٹ چکے ہیں ناتے
میرے ماضی نے کئی بار صدا دی ہے مجھے

اور پیغامِ جہانِ گزراں کچھ بھی نہیں
وقت نے خود مری روداد سُنا دی ہے مجھے

نا امیدی سے جھلکتا رہے امّید کا رنگ
کون تھا جس نے یہ دلچسپ سزا دی ہے مجھے

کتنی ویران تھی، سنسان تھی مجھ سے پہلے
وادیِ شوق نے کیا کیا نہ دُعا دی ہے مجھے

تن چھپانے کے لیے اور تو کیا تھا تاباںؔ
میرے احباب نے زخموں کی قبا دی ہے مجھے

○

اہلِ خرد کو عشق و محبت سے کیا غرض
اک کوچہ گردِ شہرِ ملامت سے کیا غرض

جن کی سیاستیں ہوں زر و جاہ کی غلام
اُن کو نگاہ و دل کی سیاست سے کیا غرض

وہ عقل تھی جو مصلحتوں کا ہوئی شکار
دل سے حریصِ غم کو فراغت سے کیا غرض

حاصل ہو جس کو پیرِ مُغاں کی ملازمت
اُس بے دماغ عیش کو جنّت سے کیا غرض

تاباںؔ نہ آپ صاحبِ منصب نہ اہلِ زر
آخر کسی حسین کو حضرت سے کیا غرض

□□

فاروق ارگلی

کنور محمد فاروق جو رسائل ہو جرائد اور اردو ہندی بک پبلشرز کی دنیا میں فاروق ارگلی کے نام سے مشہور ہیں بنیادی طور پر نثر نگار ہیں اور قلم کے دھنی کہلائے جاتے ہیں۔ فی البدیہہ شعر کہنے والے شاعروں کی طرح ہر قسم کے موضوعات پر قلم برداشتہ اور بے محابہ خوبصورت نثر لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں بدیہہ گوئی اور زود نویسی کا یہ عالم ہے کہ دوسرے قلمی ناموں سے بھی لکھتے ہیں۔ اردو ہندی کے متعدد نیم ادبی، نیم فلمی رسائل کی ادارت کر چکے ہیں۔ باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ انجمن آرائی اور ہنگامہ آرائی کے علاوہ فلم، آرٹس اور پروڈکشن سے بھی مس رکھتے ہیں۔
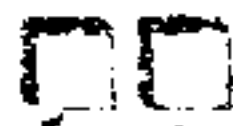
فاروق ارگلی ۳ر جنوری ۱۹۴۰ء کو موضع مسی ضلع فتح پور ہسوہ کے ایک مسلم راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد راجپوت راجہ ارگل کے ونش سے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے مولد کی جگہ اجداد کی کنّیت اختیار کر کے ارگلی کو اپنے نام کا ایک جز بنالیا۔ عالم گنج فتح پور ہسوہ کے پرائمری اسکول میں صرف چوتھی جماعت تک تعلیم پائی۔ گھریلو ناآسودگی کو آسودگی میں بدلنے اور ذریعۂ معاش ڈھونڈنے کے لیے ۱۹۵۷ء میں دہلی آئے۔ کتب بینی کا شوق بچپن سے تھا، یہاں اردو اخبارات و رسائل اور کتب خانوں کی ملازمت کے دوران اس شوق کو جلا ملی اور ذہنی تربیت ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں قلم پکڑا اور " نئے

داغ، "نئے پھول" کے عنوان سے ناول لکھ کر ادبی سفر کا آغاز کیا اور اب تک متعدد ناولوں کے علاوہ علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی اور فلمی موضوعات پر تقریباً دو ڈھائی سو کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ "شاعرِ ہند فراق گورکھپوری" فاروق ارگلی کی ایک اہم ادبی سوغات ہے جسے عالمی اردو کانفرنس نے شائع کیا۔

علی صدیقی مرحوم کی ادبی تنظیم "عالمی اردو کانفرنس" سے پیشہ وارانہ وابستگی، کانفرنس کی طرف سے منعقد کیے جانے والے عالمی مشاعروں اور چھوٹے بڑے شعراء کی صحبتوں اور رفاقتوں نے فاروق ارگلی کے باطن میں کنبھ کرن کی نیند سوئے ہوئے شاعر کو جگا دیا۔ ۱۹۸۷ء سے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ اور اب تک دو شعری مجموعے "عبارت سرِ دیوار" ۱۹۸۷ء، "لوحِ آبِ رواں" ۲۰۰۲ء منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

بنامِ حرفِ صداقت سخن وری کرنا
شکم پُری کے لیے میر جعفری کرنا

ہمارے عہد نے ہم کو دیا ہے یہ منصب
خود اپنے قتل میں قاتل کی رہبری کرنا

بڑا ہے وہ تو پھر اپنی بڑائی بھی رکھے
کہ چھوٹا سیکھ نہ جائے برابری کرنا

غمِ حیات سے ڈر جانا بزدلوں کی طرح
پھر اپنی ذات سے اظہارِ برتری کرنا

غبارِ راہ کو صاحب یہ فن بھی آتا ہے
ہوا میں اڑنا، ستاروں کی ہمسری کرنا

غلام ہو کے بھی وہ بادشاہ ہوتا ہے
لکھا ہو جس کے مقدر میں قنبری[1] کرنا

۱۔ خادم حضرت علیؓ حضرت قنبر سے مراد ہے

○

بلندیوں میں تو پربت مہان ہوتا ہے
پر اس کے سر پہ یہی آسمان ہوتا ہے
تمھارے جھوٹ میں تہذیب کی مٹھاس تو تھی
وگرنہ سچ تو بہت بد زبان ہوتا ہے
نیا تھا رنگ، مگر شکل ایک جیسی تھی
مصیبتوں کا بھی کیا خاندان ہوتا ہے
کوئی خوشی اسے خالی نہیں کرا سکتی
کہ دل تو درد کا ذاتی مکان ہوتا ہے
ہمیشہ خونِ جگر سے ادا کیا میں نے
زمینِ عشق پہ کیسا لگان ہوتا ہے
اُگا رہا ہوں میں خوابوں کی فصل کاغذ پر
مری طرح کا بھی کوئی کسان ہوتا ہے
خودی کی آگ کو کیسے بجھاؤ گے فاروقؔ
یہ شعلہ خون میں پل کر جوان ہوتا ہے

○

دیارِ اہلِ کرم کا طواف اپنی جگہ
اُبھر رہا ہے کہیں انحراف اپنی جگہ
بصیرتیں تو ہوا کے خلاف چلتی ہیں
ہوا کرے یہ زمانہ خلاف اپنی جگہ
مری کتاب کا بین السطور ہے کچھ اور
بڑائیوں کا تری اعتراف اپنی جگہ
حسین چہروں کی بے چہرگی ہے ایک طرف
نظر پہ حسنِ نظر کا غلاف اپنی جگہ

ہو کی، ہائے کی تہذیب ہے بلندی پر
خلوص و مہر کا گرتا گراف اپنی جگہ
وہ روج ٹی وی پہ تا جا خبر سنائے گا
سنبھالے بیٹھے ہو شیٖن قاف اپنی جگہ
اُنھی کو ملتا ہے اعزاز دور بینی کا
جنھیں دکھائی نہ دے صاف صاف اپنی جگہ
حیات و موت ہیں اقدارِ مشترک فاروقؔ
خدا کے باب میں ہر اختلاف اپنی جگہ

○

میں گر کر شاخ سے اڑنے لگا ہوں
اچانک کتنا اونچا ہوگیا ہوں
ستم سہہ کر بھی چپ رہنے لگا ہوں
مجھے لگتا ہے شاید مرگیا ہوں
کہوں کیسے کہ وہ میرا نہیں ہے
جسے سو بار اپنا کہہ چکا ہوں
مجھے شاید خدا کا ڈر نہیں ہے
خودی محفوظ رکھنا چاہتا ہوں
مرے بارے میں وہ کیا سوچتا ہے
یہی اک بات اکثر سوچتا ہوں
اصولوں کی عمارت گر چکی ہے
میں خود اپنے ہی ملبے میں دبا ہوں
مجھے فاروقؔ کوئی نوٹ کر لے
کئی انجان گلیوں کا پتا ہوں

○

بہا کر خون بھی روزی میسّر کیوں نہیں ہوتی
اجارہ داریوں کی حد مقرر کیوں نہیں ہوتی

سیاست نے بدل ڈالے سبھی مفہوم لفظوں کے
شرافت اب دغا بازی سے بہتر کیوں نہیں ہوتی

اپاہج باپ تو کہتا ہے گھر کی روشنی اس کو
وہ گھر کی روشنی، ہر رات گھر پر کیوں نہیں ہوتی

گلوں کی زخم کاری کا عمل جاری ہے مدت سے
طبیعت نرم خو کانٹوں کی خوگر کیوں نہیں ہوتی

بس اس طبّی حقیقت پر امیرِ شہر حیراں ہے
کہ رکشہ کھینچنے والے کو شوگر کیوں نہیں ہوتی

مزاجوں کا تغیّر ہے کہ، موسم میں ہے تبدیلی
وہ پہلی سی خوشی اب تم سے مل کر کیوں نہیں ہوتی

○

چھپے ہیں آپ کی عظمت کے اشتہار بہت
پھنسیں گے جال میں میری طرح شکار بہت

خبر ہے ان دنوں بازار بھاؤ اچھا ہے
اُٹھان پر ہے ضمیروں کا کاروبار بہت

خریدنے کی بھلا ہم کو کیا ضرورت ہے
کرائے پر بھی میسّر ہیں وفادار بہت

یہ زندگی ہے، یہاں ملنا اور بچھڑنا کیا
ملیں گے ہم کو بھی دِلبر، تمھیں بھی یار بہت

تھا محوِ خواب اندھیروں کی گود میں کب سے
جگا کے مجھ کو اُجالے ہیں شرمسار بہت
گناہ کہتے تھے تم ہی تو خونِ ناحق کو
تمھارے قول پہ ہم کو تھا اعتبار بہت
ہمیں کسی کی حکومت سے کیا غرض فاروقؔ
یہ شہرِ دل ہے یہاں اپنا اقتدار بہت

□□

فداؔ خالدی

عبدالحمید، جوشعری دنیا میں فداؔ خالدی کے قلمی نام سے مشہور ہوئے ۱۹۲۳ء کو محلّہ شاہ گنج دہلی کے ایک ذی علم اور مذہب پرست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد کا سلسلۂ نسب حضرت خالد بن ولیدؓ سے ملتا تھا اس نسبت سے خالدی کا لاحقہ اختیار کیا۔ اُس زمانے کی مروجہ تعلیم حاصل کی اور فارسی و اردو زبان کے اعلیٰ امتحانات پاس کیے۔ شعری و ادبی ماحول میں پرورش پائی تھی اور موزوں طبیعت تھے چنانچہ اوائلِ عمر میں شاعری شروع کی اور وحید العصر حضرت بیخودؔ دہلوی کے تلامذہ میں داخل ہو گئے۔

حضرتِ بیخودؔ دہلوی غزل کے مسلم الثبوت استاد شاعر تھے اور شاگردوں کی اُسی نہج پر ذہنی تربیت کیا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام شاگردوں نے غزل ہی میں طبع آزمائی کی اور نام کمایا لیکن فداؔ خالدی نے رُباعی جیسی مشکل صنف کو طبع آزمائی کے لیے منتخب کیا، اس کی گہرائیوں اور پنہائیوں سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ رُباعی ان کی شعری شناخت بن گئی۔

فداؔ خالدی غزل کے بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ خالص دہلی والا ہونے کے ناطے اُن کی غزلوں میں شوخی و لطافت، روزمرہ و محاورہ کی چاشنی موجود ہے لیکن غزلوں کے مقابلے میں ان کی رُباعیاں زیادہ پسند کی جاتی تھیں یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیوں کا مجموعہ ''آتشِ خوابیدہ'' دوبار زیورِ طبع سے آراستہ ہوا لیکن کوئی غزلیہ مجموعہ منصۂ شہود پر نہیں آ سکا۔

فدا خالدی ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے گئے جہاں ۴ر مارچ ۲۰۰۱ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

نمونۂ کلام:

رُباعیات

کب چھوڑتا ہے غمزہ و انداز کوئی
نادار کا بنتا نہیں ہمراز کوئی
اللہ رے سرمایہ پرستی کا عروج
سنتا نہیں مزدور کی آواز کوئی

○

آرام کے اسباب مٹانے والے
دیوانہ ، محبت میں بنانے والے
زینتِ گہِ آغوش نظر جانا تھا
غم بن کے مرے دل میں سمانے والے

○

اب رخ کو زمانے سے چھپانے کے لیے
ہاں سوئے عدم دہر سے جانے کے لیے
پیری میں کمر اس لیے خم ہے اپنی
بیٹھیں گے زمیں سر پہ اٹھانے کے لیے

○

تسکین کا سامان کہاں ملتا ہے
اس درد کا درمان کہاں ملتا ہے
اللہ تو ہر چیز میں ملتا ہے مگر
اس دور میں انسان کہاں ملتا ہے

○

باغیچۂ عشرت میں پلے ہیں کانٹے
گہوارۂ نکہت میں پلے ہیں کانٹے
دیکھو نہ حقارت کی نظر سے اُن کو
پھولوں کی حفاظت میں پلے ہیں کانٹے

○

اب روح نہ رہ سکے گی نچلی ساقی
لِلّٰہ کرم کہ جان نکلی ساقی
آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی ہے کب سے
شیشے میں چمک رہی ہے بجلی ساقی

○

ہر طرح سے آمادۂ پیکار رہے
خود اپنی ہی ہستی پہ گراں بار رہے
کانٹوں کی کسی طور نہ بدلی فطرت
سائے میں رہے گل کے مگر خار رہے

○

بخشش تری مسرور کیے دیتی ہے
عصیاں کا الم دور کیے دیتی ہے
بچتا ہوں گناہوں سے میں جتنا یارب
رحمت تری مجبور کیے دیتی ہے

○

ہر صبح ترے حسن سے رخشندہ ہے
ہر شام ترے فیض سے پائندہ ہے
کونین کو کونین بنانے والے
ہر شے ترے احسان سے شرمندہ ہے

○

آلام کو پیغام مسرت سمجھو
جو دم بھی گزر جائے غنیمت سمجھو
مل جائے اگر گوشۂ راحت کوئی
یہ اس کا کرم اس کی عنایت سمجھو

○

ہر نقش دلاویز ابھر جاتا ہے
ہر غنچۂ امید سنور جاتا ہے
پڑ جاتی ہے جس وقت نگاہِ ساقی
چہرہ، غمِ ہستی کا اتر جاتا ہے

○

احساسِ خلش، دل سے مٹانے دے مجھے
اے دوست نہ چھیڑ گنگنانے دے مجھے
معلوم ہے کل صیدِ الم ہونا ہے
دل کھول کے آج مسکرانے دے مجھے

○

دوری کا ہر احساس مٹا جاتی ہے
پیغامِ طرب خیز سنا جاتی ہے
جس وقت ترا ہجر ستاتا ہے مجھے
آواز تری کان میں آجاتی ہے

غزل

ہر اک مقام سے گزروں گا زندگی کے لیے
تمام رنج گوارا تری خوشی کے لیے
کرم کیا مری جانب جو تم نے دیکھ لیا
تڑپ رہا تھا اندھیروں میں روشنی کے لیے
بسے ہوئے ہیں انھیں سے تمام ویرانے
بہار ڈھونڈ رہے تھے جو زندگی کے لیے
بغیر درد کسے کون یاد کرتا ہے
یہیں تو غم کی ضرورت ہے آدمی کے لیے
یقیں ہے کہ سحر تک پہنچ ہی جاؤں گا
گزر رہا ہوں اندھیروں میں روشنی کے لیے
بغیر سعی مسلسل تو کچھ نہیں ہوتا
جنوں بھی کتنا ضروری ہے آگہی کے لیے
سمجھ چکا ہوں کہ آداب دوستی کیا ہیں
خلوصِ دل کی ضرورت ہے دوستی کے لیے
نہ جانے کتنے پتنگوں کو کردیا بے نور
چراغ کس نے جلایا ہے روشنی کے لیے
کسی کو حسن دیا ہے کسی کو عشق فدا
ہر ایک چیز نہیں ہے ہر اک کسی کے لیے

○

اظہارِ غمِ عشق، نظر سے نہ زباں سے
رُخ ہم بھی فسانے کا بدلتے ہیں یہاں سے
دیکھا تو بہت نقش وہاں چھوڑ گئے ہم
دامن کو بچاتے ہوئے گزرے تھے جہاں سے

ہم سے ہی کیا ہم کو فراموش انھوں نے
جو لوگ نظر آئے ہمارے نگراں سے

ہر لمحہ نیا درد ، نئے زخم، نیا غم
ملتا ہے بہت کچھ ہمیں اربابِ جہاں سے

یہ نور بھری رات یہ خاموش فضائیں
بیدار ہوئے ہم بھی کہاں خوابِ گراں سے

اے شرم ہمیں یاد نہیں بھول گئے ہیں
کیا جرم تھا، کیوں نکلے تھے ہم باغِ جناں سے

اول بھی ترا ذکر ہے ، آخر بھی ترا ذکر
آغاز کریں اپنے فسانے کا کہاں سے

اے بیخودی شوق سہارا دے سہارا
سوچا ہے گزر جائیں حدِ کون و مکاں سے

ہر شے کو توجہ سے فدؔا دیکھ رہا ہوں
معلوم نہیں کوئی نمایاں ہو کہاں سے

□□

فریاد آزر

بنارس کے ایک پرائمری اسکول میں زمانۂ طالب علمی کے دوران بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی نظمیں اور شعر کہنے والے سیّد فریاد علی نے جب اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۷ء میں باقاعدہ شاعری شروع کی تو اردو کے ادبی منظرنامے پر فریاد آزر بن کر اُبھرا۔ فریاد آزر ۱۰ر جولائی ۱۹۵۶ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے مولد میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیمی مدارج دہلی میں طے کیے۔ جامعہ سے اردو میں ایم۔ اے کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور آجکل دہلی سرکار کے اسکول میں مدرس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ فریاد آزر مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں لیکن خالص ادبی رسائل و جرائد کے حوالے سے شعر و ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے یہ نام خاصا جانا پہچانا ہے۔

''خزاں میرا موسم'' فریاد آزر کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۹۶ء میں طبع ہوا۔ اس کے علاوہ اردو اکادمی، دہلی نے ۱۹۹۸ء میں فریاد آزر کا بچوں کے لیے ایک کتاب'' بچوں کا مشاعرہ'' بھی شائع کی۔

نمونۂ کلام:

غزل

وسعتِ صحرا کے آگے آسماں چھوٹا لگا
دھوپ ایسی تھی کہ سر کو سائباں چھوٹا لگا

لوگ خوش فہمی کے پنجوں پر کھڑے تھے فطرتاً
اور یوں قد میرا ان کے درمیاں چھوٹا لگا

یاس، محرومی، تذبذب، کرب، خوش فہمی، انا
اتنے ساماں تھے، مرا تنہا مکاں چھوٹا لگا

جی رہا ہے وعدۂ فردا پہ تیرے اے خدا
ورنہ اس بندے کو تیرا یہ جہاں چھوٹا لگا

ایک اک لمحے کا جب مانگا گیا مجھ سے حساب
جانے کیوں ذہنِ شہنشاہِ زماں چھوٹا لگا

دور سے قطرہ بھی اک دریا نظر آیا مجھے
قربتوں کی زد میں بحرِ بیکراں چھوٹا لگا

○

پڑا تھا لکھنا مجھے خود ہی مرثیہ اپنا
کہ میرے بعد بھلا اور کون تھا اپنا

عجیب طور کی مجھ کو سزا سنائی گئی
بدن کے نیزے پہ سر رکھ دیا گیا اپنا

یہی کہ سانس بھی لینے نہ دے گی اب مجھ کو
زیادہ اور بگاڑے گی کیا ہوا اپنا

بھٹک رہا ہوں میں لاوارثی کے عالم میں
بنا کے بھول گیا ہے مجھے خدا اپنا

مرے سفر کو تو صدیاں گزر گئیں لیکن
فلک پہ اب ہی قائم نشانِ پا اپنا
بس ایک بار ملا تھا مجھے کہیں آزر
بنا گیا وہ مجھی کو مجسمہ اپنا

○

صبح ہوتی ہے تو دفتر میں بدل جاتا ہے
یہ مکاں رات کو پھر گھر میں بدل جاتا ہے
اب تو ہر شہر ہے، اک شہرِ طلسمی کہ جہاں
جو بھی جاتا ہے وہ پتھر میں بدل جاتا ہے
ظلم جب حد سے گزرتا ہے تو پھر آخر کار
غول چڑیوں کا بھی لشکر میں بدل جاتا ہے
نقش ابھرتا ہے امیدوں کا فلک پر کوئی
اور پھر دُھند کی چادر میں بدل جاتا ہے
بند ہو جاتا ہے کوزے میں کبھی دریا بھی
اور کبھی قطرہ سمندر میں بدل جاتا ہے
وقت گرگٹ کو بھی لگتا ہے بدلنے میں ذرا
اور یہ آدمی پل بھر میں بدل جاتا ہے

○

وہ لے رہا تھا مرا امتحان قسطوں میں
خبر نہ تھی کہ نکالے گا جان قسطوں میں
تمام عمر بھٹکتا رہا میں خانہ بدوش
خرید بھی نہ سکا اک مکان قسطوں میں
تمام قرض ادا کر کے ساہو کاروں کا
بچا ہی لوں گا بزرگوں کی آن قسطوں میں

ہم ایک ساتھ ہر اک شے خریدتے کیوں کر
ہم ایسے لوگ بڑھاتے ہیں شان قسطوں میں
بسا رہا ہے ہر اک فرد اک الگ ہی جہاں
بکھر رہا ہے ہر اک خاندان قسطوں میں
ہم اپنے بچوں کو اردو سے رکھ کے ناواقف
مٹا رہے ہیں سنہری زبان قسطوں میں

□□

فلکؔ دہلوی

ہیرا لال فلکؔ دہلوی گرچہ دہلی کے ایک اردو پرست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن انھوں نے ہندی میں دھارمک افسانہ بند اور عشقیہ نظمیں لکھ کر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اور ''ناگ لیلا''، ''لوکش'' اور ''سری کشن یدھ'' وغیرہ جیسی خوبصورت افسانہ بند نظمیں لکھیں جو مذہبی تہواروں کے موقعوں پر ہندی داں عوام میں آج بھی ذوق وشوق سے سنی جاتی ہیں۔ ممکن تھا کہ فلکؔ دہلوی ایسی ہی دھارمک افسانہ بند نظمیں لکھتے رہتے اور اردو والے ان کے نام سے بھی ناواقف رہتے لیکن ایک ڈرامے میں بہزادؔ لکھنوی کی گائی ہوئی غزل نے ان کا رُخ اردو غزل کی طرف موڑ دیا اور وہ پھر غزل کے ہی ہو رہے۔

فلکؔ دہلوی نے غزل گوئی کے ابتدائی دور میں حضرتِ بیخودؔ دہلوی سے اصلاح لی لیکن استاد شاگردی کا یہ سلسلہ چند غزلوں سے آگے نہ بڑھا۔ استاد بیخودؔ نے فلکؔ کو باضابطہ شاگرد بنانے کی بجائے اساتذہ کا کلام پڑھنے اور مشقِ سخن جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ فلکؔ نے استاد کی ہدایت پر سختی سے عمل کیا۔ اساتذۂ کرام کے دواوین کے مطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور خاموشی سے مشقِ سخن جاری رکھی اور دہلی کی شعری وادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کی۔

ہیرا لال فلکؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ انھوں نے دوسری اصناف میں بھی شاعری کی۔ لیکن ان کو عوامی مقبولیت غزل کی بجائے ان موضوعاتی نظموں سے ہی ملی جو آج

بھی عام جنتا اور کم پڑھے لکھے سامعین میں دلچسپی سے سنی جاتی ہیں۔ فلک اپنی موضوعاتی نظموں کی سادگی کی وجہ سے عوام میں ہمیشہ پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن عجب اتفاق ہے کہ فلک نے اپنے شعری مجموعے ''حرف وصدا'' میں جو ۱۹۸۲ء میں منظرِ عام پر آیا، نظموں کو شامل نہیں کیا۔

فلک ایک معمولی سرکاری ملازم تھے، زندگی بھر نامساعد حالات میں ادب کی خدمت کرتے رہے اور خاموشی سے پرلوک سدھار گئے۔

نمونۂ کلام:

غزل

تُو دورِ نو کے تقاضوں کو اپنے دھیان میں رکھ
مِلا ہے علم قدم اپنے آسمان میں رکھ

سُنا ہے چشمِ مورخ میں روشنی کم ہے
سنہری حرف بھی کچھ اپنی داستان میں رکھ

یہاں سے دوسری دنیا میں تجھ کو جانا ہے
تُو اپنی روح کا پھیلاؤ دو جہان میں رکھ

کبھی بھی بات سے اپنی پھرا نہیں کرتے
اگر ہے مرد تو کچھ پختگی زبان میں رکھ

کرم خدا کا کسی پر یونہی نہیں ہوتا
یقیں کے ساتھ تو سجدوں کو امتحان میں رکھ

کسی کو تیر کے آگے جگر تو لانے دے
نہ چھوڑ وقت سے پہلے اسے کمان میں رکھ

نہ داغ دامنِ قاتل پہ اور بھی ہوں فلک
شناخت اپنے لہو کی کسی نشان میں رکھ

○

شوخی و ناز جدا رنگ جدا مانگے ہے
نازکی، حسن کی پھولوں کی ادا مانگے ہے
سوچتا ہوں کہ ملا کیا ہے خدا کے در سے
سانس لینے کو بھی انسان ہوا مانگے ہے
عہدِ حاضر میں وہ بہتات ہے رنج و غم کی
بندہ گھبرا کے کوئی اور خدا مانگے ہے
ایک سجدے کو بھی تیار نہیں دل میرا
در مگر رحمتِ یزداں کا کھلا مانگے ہے
دیکھ کس حال کو پہنچا ہے یہ بیمارِ الم
چارہ گر منہ کو تکے ہے جو دوا مانگے ہے
بوئے گل دیکھ کہیں تیری ضرورت تو نہیں
چھیڑ کر زلف کو کچھ بادِ صبا مانگے ہے
اے فلک خود کو سنبھالوں کہ بچاؤں کشتی
ہوش کیا جاں بھی مری موجِ بلا مانگے ہے

○

حیات بخش دلِ مہرباں نہیں ملتا
مجھے زمیں پہ کوئی آسماں نہیں ملتا
ہزار حشر اُٹھاتے ہیں خاک کے پُتلے
پھر ایک روز کسی کا نشاں نہیں ملتا
نیا ہے شہر کہاں جا کے سر چھپاؤں گا
وہ اجنبی ہوں جسے ہم زباں نہیں ملتا
یہ وہ ہے گل جو کھٹکتا ہے خار کی صورت
وفا پرست کو دشمن کہاں نہیں ملتا

مزا تو جب تھا تڑپتی ہی چرخ پر رہتی
کسی کا گھر تجھے برقِ تپاں نہیں ملتا

بس ایک دائرہ ہے جس میں گھومتا ہوں میں
مرے سفینے کو آبِ رواں نہیں ملتا

ہوا کی تیزی سے ہوتا ہے لرزہ براندام
وہ ناخدا جسے عزمِ جواں نہیں ملتا

کمی بہار کی ہے اور نہ غنچہ و گل کی
سکون پھر بھی سرِ گلستاں نہیں ملتا

میں خار و خس کو ہٹاتا ہوں راستوں سے فلکؔ
لٹا ہوا جو کوئی کارواں نہیں ملتا

○

کوئے جاناں میں نہیں کوئی گزر کی صورت
دل اُڑا پھرتا ہے ٹوٹے ہوئے پر کی صورت

ہم تو منزل کے طلب گار تھے لیکن منزل
آگے بڑھتی ہی گئی راہ گزر کی صورت

وہ رہیں سامنے میرے تو تسلّی ورنہ
دل بھی کمبخت بھٹکتا ہے نظر کی صورت

روح افسردہ پریشان خیالات میں گم
ایسی پہلے کبھی دیکھی تھی بشر کی صورت

میری قسمت میں محبت نے یہی لکھا ہے
درد بھی دل میں رہے زخمِ جگر کی صورت

بیٹھ جائیں کسی گوشے میں سمٹ کر اے دوست
کون گردش میں رہے شمس و قمر کی صورت

وہ گئے گھر سے تو پھر ہم نے بھی گھر کو چھوڑا
ہم سے دیکھی گئی دیوار نہ در کی صورت
چند آنسو ہی مرے دل پہ فلک گر جائیں
آتشِ غم سے سلگتا ہے شرر کی صورت

O

اشکِ غم وہ ہے جو دنیا کو دکھا بھی نہ سکوں
اور گر جائے زمیں پر تو اٹھا بھی نہ سکوں
یہ مرے غم کا فسانہ ہے رہے گا لب پر
تیری روداد نہیں ہے کہ سنا بھی نہ سکوں
پرتوِ حسن ہوں اس واسطے محدود ہوں میں
حسن ہو جاؤں تو دنیا میں سما بھی نہ سکوں
تیز کچھ وقت کی رفتار نہیں ہے لیکن
تم اگر ساتھ نہ دو پاؤں بڑھا بھی نہ سکوں
اب وہی لوگ بگاڑی ہے جنھوں نے قسمت
چاہتے ہیں کہ میں تقدیر بنا بھی نہ سکوں
آج ناکام سہی کل کا بھروسہ ہے مجھے
عشق پھر کیا جو تجھے اپنا بنا بھی نہ سکوں
دل کہاں ایک سیہ خانہ ہے رنج و غم کا
اس قدر داغ لگے ہیں کہ مٹا بھی نہ سکوں
دل کی گہرائی سے اے دوست ذرا کہہ تو سہی
جان ایسی تو نہیں جس کو گنوا بھی نہ سکوں
عمر گزری کبھی ساقی نے فلک یہ نہ کہا
اتنی پی لے کہ تجھے ہوش میں لا بھی نہ سکوں

□□

قمر سنبھلی

عام طور پر دینی مدارس کے فارغ التحصیل اور خالص مولویانہ وضع قطع رکھنے والے شعراء حضرات سے اچھی اور دل و دماغ کو متاثر کرنے یا جھنجھوڑ دینے والی شاعری کی توقع نہیں کی جاتی۔ ایسے شعراء حضرات کے تخلیقی سوتے نیم بنجر اور ویران زمین سے پھوٹتے ہیں اور شاعری صرف قافیہ پیمائی تک محدود رہتی ہے۔

سلطان الدین قمر سنبھلی بھی مدارسِ دینیہ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ حافظِ قرآن، قاری اور فاضلِ دینیات ہیں اور سنبھل کے ایک علمی و مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ نماز، روزے اور اسلامی شعار کے سخت پابند ہیں۔ ان کی مولویانہ وضع قطع دیکھ کر بھی یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ اشعار ادق بحروں میں ہوں گے۔ زبان مشکل اور شاعری فکر سے خالی قافیہ پیمائی تک محدود ہوگی لیکن چند ہی اشعار سننے یا پڑھنے کے بعد یہ مفروضہ ہوا میں تحلیل ہوجاتا ہے اور ایک لطیف و خوشگوار جھونکے کا احساس ہوتا ہے۔

قمر سنبھلی ۲۲ ستمبر ۱۹۴۲ء کو سنبھل میں مولانا حافظ حکیم قاری حمید الدین صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے۔ حکیم قاری حمید الدین مرحوم سنبھل کے مشہور اور معزز لوگوں میں سے تھے۔ قمر سنبھلی ۱۹۵۶ء سے بہ سلسلۂ روزگار دہلی میں مقیم ہیں۔ شاعری میں حضرت زاہر حیدری کے شاگرد ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں۔ کسی زمانے میں

مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ ترنم اور کلام سے سامعین پر خوشگوار اور دیرپا اثر مرتب کرتے تھے لیکن جماعتی گروہ بندی اور پبلک ریلیشننگ Public Relationing کے اس دور میں قلندرانہ مزاج نے قمر سنبھلی کو مشاعروں سے دور کر دیا ہے۔

قمر سنبھلی کا پہلا شعری مجموعہ ''آواز کالمس'' اردو اکادمی، دہلی کے تعاون سے ۱۹۹۹ء میں منصۂ شہود پر آیا، جس کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ دیوناگری میں غزلوں کا انتخاب ''جزیرے خواب کے'' زیر طبع ہے۔ قمر سنبھلی نے بچوں کے لیے بھی نظمیں کہی ہیں جو بچوں کے رسائل میں چھپ کر کافی مقبول ہوئی ہیں۔ ان نظموں کا مجموعہ ''پھول آنگن کے'' زیرِ طباعت ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

چھت کاٹ رہی ہے کبھی در کاٹ رہا ہے
خالی ہے مکینوں سے تو گھر کاٹ رہا ہے

تلووں میں چُبھے جاتے ہیں احساس کے کانٹے
''تم ساتھ نہیں ہو تو سفر کاٹ رہا ہے''

الفاظ کی تاثیر کہ جادو ہے زباں کا؟
لہجے سے وہ پتھر کا جگر کاٹ رہا ہے

دوکان سجائی ہے کہاں شیشہ گروں نے
ہر شخص جہاں دستِ ہنر کاٹ رہا ہے

دامن ہوا جاتا ہے سمندر کا کشادہ !
ہر آن کناروں کو بھنور کاٹ رہا ہے

رشتوں کا تقدّس ہے نہ کچھ پاس لہو کا
اک بھائی یہاں بھائی کا سر کاٹ رہا ہے

گرتی ہوئی دیوار کا لمحہ ہے نظر میں !
سہمے ہوئے بچوں کو وہ ڈر کاٹ رہا ہے

ہے شغل بھی زندانیِ دنیا کا قمرؔ خوب
کٹتی نہیں زنجیر مگر کاٹ رہا ہے

○

ترے سخن کے مہ و خور، تری نظر کے چراغ!
اُنھیں کے دم سے ہیں روشن مرے ہنر کے چراغ

زمیں سے تا بہ فلک، کہکشاں سی بکھری ہوئی
حقیقتاً ہیں فروزاں کسی سفر کے چراغ

بہ ہر زمانہ انھیں آندھیوں سے لڑنا ہے
تمھارے گھر کے دیے ہوں کہ میرے گھر کے چراغ

وہاں پہ بھی اِسی تہذیب کا اُجالا ہے
جلے اُدھر کی مُنڈیروں پہ بھی اِدھر کے چراغ

اب ان کے ساتھ ہوا دیکھیں کیا سلوک کرے
جلا تو آئے ہیں ہم فکرِ معتبر کے چراغ

بچائے رکھیں ذرا آپ اپنے دامن کو
نہ دے اٹھیں کہیں لو میری چشمِ تر کے چراغ

کبھی جو آخرِ شب آنکھیں نم ہوئیں اپنی
دعاء کے ہونٹوں پہ روشن ہوئے اثر کے چراغ

ورق ورق ہیں منور جو شعر کی صورت
خدا کرے نہ کبھی گل ہوں یہ قمرؔ کے چراغ

○

ہم فیض روشنی سے اٹھائیں گے کتنی دیر
جگنو ہمارے صحن میں ٹھہریں گے کتنی دیر

کب تک نمو پذیر رہے گا یہ دشتِ دل
بادل خوشی کے برسیں تو برسیں گے کتنی دیر

توڑو تعلقات کی بیساکھیاں تمام !!
جھوٹے سہارے ساتھ نباہیں گے کتنی دیر

سایہ سروں کو دیں گے کہاں تک بزرگ لوگ؟
بے برگ، خشک پیڑ ہوا دیں گے کتنی دیر

کب تک رہیں گے قیدِ انا کے حصار میں
کاغذ کی ناؤ آپ چلائیں گے کتنی دیر!

شعلہ بھڑک کے ختم ہوا ، راکھ ہو گیا
ہم راکھ میں شرر کوئی ڈھونڈیں گے کتنی دیر

تارِ نفس کے ساتھ تھے رشتوں کے سلسلے
میرے عزیز قبر پہ ٹھہریں گے کتنی دیر؟

دو چار لہریں میرے سفینے کو ہیں بہت
ساحل سے آپ ڈوبتے دیکھیں گے کتنی دیر

کتنا کوئی کسی کے بچھڑنے کا غم کرے
ہم بھی کسی کے واسطے روئیں گے کتنی دیر

موندے رہیں گے کب تلک آنکھوں کو، ہم قمرؔ
خوابوں کو ٹوٹنے سے بچائیں گے کتنی دیر

○

بُریدہ پر تھے ، جسارت پرند کیا کرتے؟
ہوا سے لڑنے کی ہمت پرند کیا کرتے

پروں کو تولا بہت یوں تو اب کی رُت میں بھی
تھے آگے برف کے پربت پرند کیا کرتے؟

قفس سے چھوٹ کے بھی آسماں کا رُخ نہ کیا
کہ ترک برسوں کی عادت پرند کیا کرتے

ہر ایک تیر کا رُخ تھا اُنھیں کی سمت یہاں
کسی سے کوئی شکایت پرند کیا کرتے
ہیں دسترس میں تری، تیر بھی، ہوائیں بھی
ترے خلاف بغاوت پرند کیا کرتے؟
وہ پیڑ کٹ گئے جن پر تھا آشیاں اُن کا
اگر نہ ہوتی مری چھت! پرند کیا کرتے؟
ہوئی گرفت ذرا ڈھیلی ، کر گئے پرواز
شکاریوں سے مروت پرند کیا کرتے
فضا میں چھائی تھی حدِ نظر تک آگ ہی آگ
اُڑان بھرنے کی جراُت پرند کیا کرتے
چمن کو چھوڑ کے جاں بچ گئی غنیمت ہے
قمرؔ! نہ کرتے جو ہجرت، پرند کیا کرتے؟

O

سفر تھا پانو سے لپٹا ، سفر میں رہنا تھا
کہاں نصیب ہمیں اپنے گھر میں رہنا تھا
جو نقش کھینچوں میں کاغذ پہ شاہکار بنے
کمال اتنا تو دستِ ہنر میں رہنا تھا
اب اپنے صحن سے کرچیں سمیٹتے رہیے
کچھ احتیاط سے شیشے کے گھر میں رہنا تھا
ہوا کے رُخ کی تمھیں کچھ خبر، نہ طوفاں کی
تمھاری ناؤ کو پھر تو بھنور میں رہنا تھا
ضرور کوئی کمی تھی خلوص میں ، ورنہ
مری دعاؤں کو بابِ اثر میں رہنا تھا
یہ کیسے چھوٹ گیا احتیاط کا دامن؟
ہمیں تو ان کے حصارِ نظر میں رہنا تھا

وہ سہل راہ کوئی اختیار کیا کرتے؟
جنھیں ہمیشہ رہِ پُر خطر میں رہنا تھا
کچھ اپنا حق بھی تو بنتا تھا روشنی پہ قمر
کوئی چراغ ہمارے بھی گھر میں رہنا تھا

○

کبھی ہنسے، کبھی آنسو بہائے تنہائی
ہزار طرح مجھے آزمائے تنہائی
نہ میں اُسے، نہ مجھے چھوڑ پائے تنہائی
جہاں بھی جاؤں مرے ساتھ جائے تنہائی
کسے پکاریے، آواز دیجیے کس کو؟
یہاں کوئی بھی نہیں ہے سوائے تنہائی
رفاقت اس کی، ہماری بہت پرانی ہے
یہ کون اس سے کہے، گھر سے جائے تنہائی
ہزار چاہا کہ خود سے ملوں اکیلے میں
مگر ہوئی نہ جدا مجھ سے ہائے تنہائی
اُداس چھت، در و دیوار چپ، فضا خاموش
اگر کتابیں نہ ہوں، کاٹ کھائے تنہائی
کبھی جو پیاس کے کانٹے مری زباں پہ چبھیں
ہزار قہقہے مجھ پر لگائے تنہائی
قمر! یہ ساتھ کوئی پانچ دس برس کا نہیں
تمام عمر چلی سائے سائے تنہائی

□□

قیس رامپوری

دہلی کے شعری، ادبی، صحافتی اور آرٹ کے حلقوں میں قیس رامپوری کے قلمی نام سے شہرت پانے والے سید سجاد علی ۱۶ر مئی ۱۹۴۳ء کو رامپور کے ایک ایسے ذی علم گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں فارسی کا چلن تھا اور فارسی شاعری کی تمام روایتیں زندہ تھیں۔ ان کے والد سید احمد علی صاحب ناصح ایک پختہ گو شاعر تھے اور رامپور کی عام شعری روایت کے برعکس صرف فارسی میں ہی شعر کہا کرتے تھے۔ قیس رامپوری کو شعر گوئی ورثے میں ملی لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتوں نے اردو میں آنکھ کھولی۔ طالب علمی کے زمانے میں شعر کہنا شروع کیا اور حضرتِ شاد عارفی جیسے قادر الکلام شاعر کا تلمذ اختیار کیا۔

گریجویشن کے بعد مصوری اور صحافت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ دو تین دہوں تک دہلی کے مختلف اخبارات و رسائل کی تزئین و ترتیب کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آج کل روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی ایڈیشن کے ایڈیٹوریل بورڈ سے وابستہ ہیں۔ قیس رامپوری کے تین شعری مجموعے ''صحرا صحرا''، ''شوخیِ لب'' اور ''سمندر در سمندر'' اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

خدا تھا منتظر اک آدمی کا
یہ قصہ ہے کسی روشن صدی کا
ملے جلتا ہوا گھر جب کسی کا
تو لکھنا مرثیہ تم روشنی کا
جو ممکن ہو تو زندہ رکھنا رشتہ
انا کا اور نیزے کی اَنی کا
کہیں خوشبو نفس کی اُڑ نہ جائے
لفافہ بند رکھنا زندگی کا
شریفِ شہر سمجھے گا بھی کیسے
مزہ ہم جیسوں کی آوارگی کا

○

کچھ اس طرح تری تفسیر کر رہے ہیں ہم
چھلکتے جام کو تصویر کر رہے ہیں ہم
ہمارے بچوں کے سر مانگتی ہیں بنیادیں
یہ کیسے شہر کی تعمیر کر رہے ہیں ہم
وہ دور راہ میں انساں نہ جل رہا ہو کوئی
جسے چراغ سے تعبیر کر رہے ہیں ہم
تم اپنے زخموں کا کوئی حساب مت رکھنا
بیاضِ قلب پہ تحریر کر رہے ہیں ہم

تری خرد کو کسی دن جکڑ کے رکھ دیں گے
ابھی جنون کو زنجیر کر رہے ہیں ہم
ہے کیسا کرب کہ اپنی ہی سرزمین پہ قیس
دفاعِ سنتِ شبّیر کر رہے ہیں ہم

○

ایک شب میں کمرے کا روپ ڈھل گیا کیسے
وہ تو گیلی لکڑی تھا رات جل گیا کیسے
ایک طرفہ چاہت بھی کیسا درد ہوتی ہے
میں ہوں آج تک پتھر، وہ بدل گیا کیسے
کل تمام بستی میں سیلِ خوں بہا لیکن
ایک سرپھرا قاتل کل سنبھل گیا کیسے
وہ زمین زادوں کی خوں کشی کا عادی تھا
آج اپنا خوں پی کر دم نکل گیا کیسے
چاند کی حقیقت کو خوب جانتا ہوں میں
پھر بھی چاند راتوں کا جادو چل گیا کیسے

○

جو چند لوگ مرے شعر سن کے جاتے ہیں
طلسمِ ہوشربا پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں
مسرتوں کو سمجھنے کی کیسی رُت آئی
سگانِ شہر بھی اب قہقہے لگاتے ہیں
لباس مانگ کے پہنا ہے کچھ رفیقوں نے
اور اس پہ لطف، مجھے آئنہ دکھاتے ہیں

وہی بتائیں گے تنہا شبوں کی معراجیں
جو اپنی ذات کے مدفن میں ڈوب جاتے ہیں
ہر ایک لمحہ کسی جارہی ہیں زنجیریں
عجب غلام ہیں ہم ، پھر بھی مسکراتے ہیں
نجانے کون مجھے یاد کرکے رویا قیس
ہوا کے دوش پہ اشکوں کے جام آتے ہیں

○

فصیلِ شہر سے نکلو بھلا اسی میں ہے
کہ زلزلوں کی حکومت گلی گلی میں ہے
دیا کہیں بھی جلانا ، مجھے خبر کرنا
مرے لہو کا اجالا بھی روشنی میں ہے
وہ مسکرا کے خدا کا پتا بتاتا ہے
نہ جانے کون سا جادو اس آدمی میں ہے
چلا ہوں موت کے پیکر کو قتل کرنے مگر
یہ وصفِ خاص تو خود میری زندگی میں ہے
دریچے اپنے کھلے رکھنا شب کے پچھلے پہر
سنا ہے عشق کا انداز چاندنی میں ہے

○

زاویہ ہونٹوں کا وہ دلکش بناتا کس طرح
روح زخمیدہ بہت تھی مسکراتا۔کس طرح
انگلیاں بھی قوتِ بینائی رکھتی ہیں بہت
میں کسی کے جسم کو یہ سچ بتاتا کس طرح

کل مرے بچے بھی آسکتے ہیں خوشبو کے لیے
شہرِ گل میں زہر کے کانٹے بچھاتا کس طرح

فن کی دولت بڑھ گئی تو دل کے ٹکڑے ہو گئے
میں سمندر بن گیا تو گھر بچاتا کس طرح

میں ہوں اک پتھر مگر دستِ ہنر میں رہ گیا
شیش محلوں کی ہے قسمت کیا، بتاتا کس طرح

□□

قیصر حیدری

نور احمد جو قیصر حیدری کے روپ میں دہلی کی شعری و ادبی دنیا میں اُبھرے ۱۷ر جون ۱۹۲۸ء کو دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد جناب بشیر احمد کاروباری دنیا کے آدمی تھے اور شعر وادب سے کوئی علاقہ نہیں تھا لیکن ان کی نانیہال کا ماحول خالص علمی، ادبی اور شاعرانہ تھا۔ خیام الہند حضرت حیدر دہلوی ان کے سگے ماموں تھے۔ حضرت حیدر دہلوی سے اس تعلقِ خاص اور ان کی خدمت میں صبح وشام کی حاضری نے قیصر حیدری کو شعر وادب کے کوچے میں پہنچا دیا۔ حیدر دہلوی جیسے جیّد اور قادرالکلام استاد سے بہتر قیصر حیدری کو استاد بھلا کہاں ملتا، چنانچہ حیدر صاحب کا تلمذ اختیار کیا۔

قیصر حیدری بارہویں جماعت تک پڑھے ہوئے تھے۔ شاعری گرچہ ذریعۂ معاش نہیں تھا لیکن زندگی بھر شاعری ہی کی۔ شاعری کے ساتھ علمِ نجوم سے بھی شغف تھا جس سے تھوڑی بہت یافت ہوتی اور زندگی کی گاڑی چلتی تھی۔ قیصر حیدری گرچہ پتلے دبلے تھے لیکن بلند ترنم میں پڑھتے تھے اور سامعین پر چھا جاتے تھے۔ نہایت وضعدار، روایت پسند، کم گو خاموش صفت اور مخلص انسان تھے۔ آمدنی کی طرح ضروریات بھی محدود تھیں۔ گلی قاسم جان کے نکڑ پر واقع نیو پبلک پریس کا ایک چھوٹا سا کونا ان کا گھر تھا۔ روزانہ شام کو عصر کی نماز کے بعد اپنے شاگردِ رشید مختار عثمانی کے ساتھ بلیماران ہوتے ہوئے پیدل جامع مسجد پہنچتے، ایک مخصوص چائے خانے میں ایک مخصوص سیٹ پر بیٹھتے، کوئی شاعر وادیب دوست

آجاتا تو ادبی گفتگو میں وقت گزرتا۔ یہ روزانہ کا معمول تھا جس کو انھوں نے زندگی بھر نبھایا۔

قیصر حیدری بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ غزل میں ان کا مزاج دبستانِ دہلی کی کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہے۔ قیصر حیدری کے تین مختصر شعری مجموعے ''تلافی''، ''موجیں'' اور ''خطِ غبار'' شائع ہوئے۔ اردو اکادمی، دہلی نے ان کی وفات سے چند سال پیشتر اقتصادی طور پر کمزور تخلیق کاروں کی معاونت کی اسکیم کے تحت قیصر حیدری کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

قیصر حیدری کا انتقال ۹ رفروری ۱۹۹۲ء کو دہلی میں ہوا اور قبرستان دہلی گیٹ میں تدفین ہوئی۔

نمونۂ کلام:

غزل

جو ممکن ہو تو سوزِ شمع پروانے میں رکھ دینا
اب اس افسانے کا عنوان اُس افسانے میں رکھ دینا

بڑی کافر کشش ایماں میں ہے اے عازمِ کعبہ!
نہ لے جانا دل اپنے ساتھ بُت خانے میں رکھ دینا

ابھی آئینۂ تصویر، ابھی ہشیار، ابھی غافل
تمھیں آتا ہے ہر انداز دیوانے میں رکھ دینا

مرا پیمانۂ ہستی اگر ساقی چھلک جائے
مرے حصّے کا خالی جام میخانے میں رکھ دینا

شریکِ مے جنابِ شیخ بھی ہو جائیں گے ساقی
ذرا ظرفِ وضو کا ڈھنگ پیمانے میں رکھ دینا

یہ کیا دستِ اجل کو کام سونپا ہے مشیّت نے
چمن سے توڑنا پھول اور ویرانے میں رکھ دینا

وفورِ یاس میں قیصر چلے ہیں دل سے چند آنسو
یہ لاشیں ہیں انھیں آنکھوں کے خس خانے میں رکھ دینا

○

بہ آسانی کہیں شاداں، دلِ ناشاد ہوتا ہے
بڑی بربادیوں کے بعد یہ آباد ہوتا ہے
ٹھہر اے گردشِ دوراں! وہ لب جنبش میں آتے ہیں
سراپا گوش ہو کر سن کہ کیا ارشاد ہوتا ہے
درِ ساقی سے آزادِ دو عالم اٹھ نہیں سکتا
قیودِ مذہب و ملّت سے رند آزاد ہوتا ہے
گزشتہ حالِ الفت کیا سنو گے کیا سناؤں گا؟
یہ قصّہ کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے یاد ہوتا ہے
پیامِ صد مصیبت جانتا ہوں اک تبسّم کو
لرز جاتا ہوں جس دن خوش دلِ ناشاد ہوتا ہے
قفس کی تیلیو! اٹھو، گلے مل لو لپٹ جاؤ
کہ قیدِ زندگی سے اک اسیر آزاد ہوتا ہے
کہاں پہلی سی قیصؔر رسمِ شاگردی و استادی
جو اک مصرع بھی کہہ لیتا ہے اب استاد ہوتا ہے

○

حسیں اور اُس پہ خود بیں وہ ستم گر یوں بھی ہے یوں بھی
نظارہ قبضۂ قدرت سے باہر یوں بھی ہے یوں بھی
جو یہ بسمل حیا سے ہے تو وہ مجروح شوخی سے
نگاہِ ناز اُس قاتل کی خنجر یوں بھی ہے یوں بھی
جبیں اُس در پہ ہے وہ در ہے اونچا عرشِ اعظم سے
بلند اوجِ ثریا سے مقدر یوں بھی ہے یوں بھی
اُدھر وہ مجھ سے برہم ہیں اِدھر مایوسِ نظارہ
کہ میری عمر کا لبریز ساغر یوں بھی ہے یوں بھی

عقیدت تجھ سے بھی ہے بیعتِ دستِ سبو بھی ہے
جو ساقی رند ہے مقدارِ کوثر یوں بھی ہے یوں بھی

مری منزل کا پہلا نام دنیا دوسرا دیں ہے
کہ راہِ عشق میرے حق میں بہتر یوں بھی ہے یوں بھی

میں خواہر زادۂ حیدرؔ بھی ہوں شاگردِ حیدرؔ بھی
مرا ملکِ سخن پہ قبضہ قیصرؔ یوں بھی ہے یوں بھی

○

علاوہ جلوۂ معنیٰ کے کل جہاں دیکھا
جو چیز دیکھنے کی تھی اُسے کہاں دیکھا

چھپائے رکھا ہمیشہ نگاہِ گلچیں سے
نہ دیکھنے کی طرح سوئے آشیاں دیکھا

یہ یاد ہے کہ ملاقات تو ہوئی تھی کہیں
مگر یہ یاد نہیں ہے تمھیں کہاں دیکھا

قفس میں نیند بھی کیسے فریب دیتی ہے
کھلی جو آنکھ تو گلشن نہ آشیاں دیکھا

ق

زمیں کے ظلم بھی برداشت ہم نے ہنس کے کیے
ترا بھی دبدبۂ جورِ آسماں دیکھا

ہزاروں زخم تھے انسانیت کی میّت پر
تمام دامنِ فطرت کو خونچکاں دیکھا

جو لوگ حفظِ زباں کی زبان دیتے تھے
تو قیصرؔ اُن کو ہی غارت گرِ زباں دیکھا

○

جب تری زلفِ سیہ فام سنورتی ہوگی
کتنی دنیا ترے جلووں سے نکھرتی ہوگی

آج تک بھی ترے جلووں کو نہ پہنچیں نظریں
کب کوئی آنکھ ترے رُخ پہ ٹھہرتی ہوگی

اے مرے دل! یہ غریب الوطنی کیسی ہے
کس کے پہلو میں تری رات گزرتی ہوگی

وقت کے سائے تو چڑھتے ہیں اُتر جاتے ہیں
اپنے محور پہ کہاں دھوپ ٹھہرتی ہوگی

جس طرح رات گزر جاتی ہے تنہائی میں
غالبًا ایسے ہی تُربت میں گزرتی ہوگی

وہ مقدر نہیں الزام نہ جس پر آئے
قیصرؔ اُس دور میں کس طرح گزرتی ہوگی

○

فریاد نہیں ، اشک نہیں ، آہ نہیں ہے
اے عشق! ترا کوئی ہوا خواہ نہیں ہے

گو دردِ تمنا کو بڑھاتا ہے ترا ذکر
دل پھر بھی ترے نام سے آگاہ نہیں ہے

اے حسنِ یقیں، دیر و حرم کی ہے فضا تنگ
اُس در سے پلٹنے کی کوئی راہ نہیں ہے

یہ کس نے اڑائی کہ مجھے عشق ہے تم سے
ہاں! تم کو یقیں آئے تو افواہ نہیں ہے

آسائشِ تن روح کا آزار ہے قیصرؔ
دنیا میں غمِ عشق سی تنخواہ نہیں ہے

کامل قریشی

فضل حق جو علم و ادب کی دنیا میں کامل قریشی کے نام سے مشہور ہوئے ۹/اپریل ۱۹۳۵ء کو عبدالحق صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے۔ عبدالحق صاحب دہلی کی مشہور قریشی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ کامل قریشی کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے آسودہ حال تایا بابو عبدالرب قریشی صاحب نے کی جو تاجر پیشہ ہونے کے باوجود شعر و ادب کے دلدادہ تھے اور اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی لٹریچر پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے۔ تایا کی شعر و ادب سے دلچسپی نے کامل کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ اینگلو عربک اسکول میں غلام احمد فرقت کاکوروی اور رہبر پرتا بگڈھی جیسے استادوں کی تعلیم اور ذہنی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ تایا مرحوم کے مشورے پر زبان و بیان میں سلیقہ پیدا کرنے اور رموزِ شاعری سیکھنے کے لیے سیّد وحید الدین بیخود دہلوی جیسے باکمال استاد کے سامنے زانوئے ادب طے کیا اور باضابطہ شاگردی اختیار کی۔ استاد بیخود دہلوی کی شاگردی، اینگلو عربک اسکول کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادبی ماحول نے فضل حق کو کامل قریشی بنا دیا جس نے دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے مشاعروں میں اپنی جگہ بنانی شروع کر دی تھی۔

کامل قریشی شعر و شاعری کے ساتھ تعلیم کی اعلیٰ منزلوں کو سر کرنا چاہتے تھے لیکن علیگڑھ سے انٹر کرنے کے بعد گھریلو ذمہ داریوں اور خانگی تقاضوں نے کچھ ایسے حالات

پیدا کیے کہ تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا۔ لیکن نا مساعد حالات اور تلاشِ معاش کے تقاضوں نے کامل قریشی کے حصولِ تعلیم کے جذبوں کو سرد نہیں پڑنے دیا۔ مستقل مزاجی، ثابت قدمی، عزم کے جلو میں کامل نامساعد حالات سے نبرد آزما رہے، تعلیمِ بالغان اور سوشل سروس کو جزوی طور پر ضروریاتِ زندگی کا وسیلہ بنایا اور ۱۹۵۹ء میں دہلی کے کروڑی مل کالج میں بی۔اے کے سالِ اول میں داخلہ لے کر ایک بار پھر تعلیم سے رشتہ جوڑا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر خلیق انجم کروڑی مل کالج میں لیکچرار اور صدر شعبۂ اردو تھے۔ اینگلو عربک اسکول کی دوستی یہاں استاد اور شاگرد کے رشتے میں تبدیل ہوگئی۔ کامل قریشی نے کروڑی مل کالج سے بی۔اے کے بعد دہلی کالج سے اردو میں ایم۔اے کیا اور خواجہ میر اثر دہلوی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۶۶ء میں کروڑی مل کالج کے شعبۂ اردو میں شامل ہو گئے۔

کامل قریشی میں کام کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ معلم، محقق، شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے منتظم اور مہتمم بھی تھے۔ بعض اداروں اور انجمنوں کی ادبی سرگرمیاں ان کے وجود سے عبارت تھیں۔ انھوں نے اس شہر کی ثقافتی زندگی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہوئے صرف شاعری ہی نہیں کی اور ''مہِ کامل'' ۱۹۷۰ء اور ''شاعر کا لہو'' ۱۹۸۲ء جیسے شعری مجموعے ہی نہیں دیے بلکہ نا قابلِ فراموش تحقیقی وتنقیدی کام بھی کیا اور اردو دنیا کو ترتیب، تالیف اور تصنیف کی شکل میں یہ کتابیں دیں جن کی ادبی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

(۱)	اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب		۱۹۷۹
(۲)	ہندوستانی ادب کے معمار: بلھے شاہ	(ترجمہ)	۱۹۹۲
(۳)	فراق گورکھپوری	مرتبہ	۱۹۶۷
(۴)	بیخود دہلوی	مرتبہ	۱۹۸۰
(۵)	بزمِ آخر	مرتبہ	۱۹۸۶
(۶)	تلاشِ تنقید	(مضامین)	۱۹۹۳
(۷)	تگ وتاز	(مضامین)	۱۹۹۳
(۸)	اردو غزل	مرتبہ	۱۹۸۷

(ہندو پاک غزل سمینار میں پڑھے گئے مضامین)

(۹) مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب مرتبہ ۱۹۸۷

(۱۰) داغ دہلوی حیات اور کارنامے مرتبہ ۱۹۸۶

(داغ سمینار میں پڑھے گئے مضامین)

کامل قریشی اردو اکادمی، دہلی کے متعدد بار ممبر نامزد کیے گئے۔ اکادمی کی ممبری کے دوران کامل قریشی نے اردو غزل اور داغ دہلوی پر بڑے پیمانے پر ہندو پاک سمینار منعقد کرائے جن کی کامیابی کی بازگشت دہلی کے ادبی حلقوں میں آج بھی سنائی دیتی ہے۔

کامل قریشی ۱۵ر جون ۱۹۹۳ء کو مختصر سی علالت کے بعد دہلی میں انتقال کر گئے۔

نمونۂ کلام:

غزل

ہم اپنے غم کی کبھی خود سے گفتگو کرتے
تمام عمر ہی گزری یہ آرزو کرتے

جگر کو خون تو دل کو لہو لہو کرتے
کسی طرح تو محبت کو سرخ رو کرتے

زبان ضبطِ مسلسل سے بند ہے ورنہ
وہ دوستوں نے کیا ہے نہ جو عدو کرتے

نہ مسکراتیں کبھی نورِ صبح کی کرنیں
شبِ فراق جو گل شمع آرزو کرتے

جو دیکھ لیتے تری مست انکھڑیاں میخوار
نہ خود کو غرقِ مے وشیشہ وسبو کرتے

تری تلاش نے فرصت نہ دی ہمیں اے دوست
کہ ہم ذرا کبھی اپنی بھی جستجو کرتے

حضور، قیدئ زنداں نہ کرتے کاملؔ کو
اسیرِ سلسلۂ زلفِ مشک بو کرتے

○

آجاؤ تصوّر میں تصویر بنالیں گے
ہم شامِ جدائی کی تقدیر بنالیں گے
ہم گیسوئے دوراں کی مانگ آؤ سجاڈالیں
لوگ اس کو مقدّر کی تحریر بنالیں گے
تم ریشمی زلفوں کو شانوں پہ تو بکھراؤ
دیوانے انھیں اپنی زنجیر بنالیں گے
کیسے ہی سہی لیکن کچھ خواب ہمیں دے دو
ہم ان کی کوئی رنگیں تعبیر بنالیں گے
صہبا نہ سہی یارو، تم زہر ہی دے دیکھو
ہم تشنۂ مے اس کو اکسیر بنالیں گے
تم کاکلِ پیچاں کو رُخ پر سے ہٹا ڈالو
ہم تیرگیٔ شب کی تنویر بنالیں گے
دے جاں کے عوض یارب اک عشق ہمیں ورنہ
اس کو بھی ہوس والے جاگیر بنالیں گے
وہ پھول سے ہاتھوں کو کیوں قتل کی زحمت دیں
ہر نوکِ پلک ان کی ہم تیر بنالیں گے
وہ پیکرِ صد جنّت اک بار جو آجائے
دلّی کو بھی کاملؔ ہم کشمیر بنالیں گے

○

طلوعِ صبح اندھیرا ہے میرے ساتھ چلو
بڑا اُداس سویرا ہے میرے ساتھ چلو
غمِ حیات کے مارو، بھٹک رہے ہو کہاں
تمھارا درد تو میرا ہے میرے ساتھ چلو

رُخِ جہاں پہ پریشاں ہے گیسوؤں کی قسم
قدم قدم پہ اندھیرا ہے میرے ساتھ چلو

نہ کوئی مونس و ہمدم نہ کوئی یار و عزیز
کوئی تمھارا نہ میرا ہے میرے ساتھ چلو

مہِ تمام کو سمجھو نہ نور راہرو
تہہِ چراغ اندھیرا ہے میرے ساتھ چلو

نچا رہا ہے زمانے کو بین پر اپنی
یہ وقت ایک سپیرا ہے میرے ساتھ چلو

کہاں کے منصف و حاکم، کہاں کے رہبر و خضر
تمام شہر لٹیرا ہے میرے ساتھ چلو

جو چل پڑے ہو تو آوارگانِ منزلِ شوق
جدھر خلوص کا ڈیرا ہے میرے ساتھ چلو

نئی نئی ہے ڈگر تم کہیں نہ کھو جاؤ
مرا تو روز کا پھیرا ہے میرے ساتھ چلو

رہِ حیات میں رُکنا تو موت ہے یارو!
تمھیں دُکھوں نے جو گھیرا ہے میرے ساتھ چلو

ابھر رہی ہیں شبِ غم سے نور کی کرنیں
اٹھو، اٹھو وہ سویرا ہے میرے ساتھ چلو

نکل پڑا ہوں اکیلا تلاشِ منزل میں
مرا تو عزم ہی میرا ہے میرے ساتھ چلو

مسافرانِ جہاں زندگی دراز نہیں
یہ ایک شب کا بسیرا ہے میرے ساتھ چلو

جلا رہا ہوں میں شمعِ حیات اے کامل
جہاں جہاں بھی اندھیرا ہے میرے ساتھ چلو

○

ہر سمت دو عالم میں بس اک جلوۂ ہُو ہے
ہم خود بھی ہیں موجود کہاں ہم میں بھی تُو ہے

لفظوں کے گُل و لالہ میں جو رنگ جو بُو ہے
کچھ اور نہیں یارو ، یہ شاعر کا لہُو ہے

دشمن کا گلِا لب پہ نہ کچھ ذکرِ عدو ہے
جو اصل میں قاتل ہے وہ اک اپنا لہُو ہے

ہر ظلم کے سہنے کی مجھے اس لیے خُو ہے
دشمن کی جفاؤں میں کسی دوست کی بُو ہے

تسلیم مجھے کوئی نہیں ہے مرا قاتل
کیسا یہ مگر آپ کے خنجر پہ لہُو ہے

دل، جان، جگر، آرزو، ارمان، تمنّا
اک عشق کی بنیاد میں کس کس کا لہُو ہے

خورشیدِ قیامت بھی اگر ہو تو جھلس جائے
اس دور میں وہ گردشِ حالات کی لُو ہے

دامن کے بھی ٹکڑے ہیں گریباں کے بھی ٹکڑے
صدیوں سے قبا عشق کی محرومِ رفو ہے

جینے نہیں دیتا ہمیں مرنے نہیں دیتا
اپنا نہ کوئی دوست ہے سچّا نہ عدو ہے

رُخ زرد و پریشان ہیں گل، تنگ ہیں کلیاں
اس فصل میں گلشن کا عجب، جوشِ نمو ہے

شعروں میں نہ ہو کس لیے بھرپور رنگِ صداقت
کاملؔ میں تصنّع ، نہ تکلّف ، نہ غلو ہے

○

وہ ہمیں ہیں جو غمِ خلق میں یونہی شمع بن کے پگھل گئے
کبھی اِس کی آگ میں جل گئے کبھی اُس کی آگ میں جل گئے
انھیں زندگی کا مزا ملا جو غموں کے سائے میں پل گئے
وہ نہیں رہے وہ نہیں رہے جو حدودِ غم سے نکل گئے
مری اک حیات کا ذکر کیا رُخِ کائنات بدل گئے
تری چشمِ مست کے جام مے جو نظر نظر ہی میں چل گئے
کہیں دور کعبہ و دیر سے کسی بادہ خانۂ عشق میں
جو سنبھل گئے وہ بہک گئے جو بہک گئے وہ سنبھل گئے
ملے جس قدر، تھے وہ کم نظر، نہ پرکھ سکے کبھی سیم و زر
وہ جو کھوٹے سکّے تھے بیشتر ترے عہد میں وہی چل گئے
دل و سینہ زخموں کے باغ ہیں کہ حیات پر ہمیں داغ ہیں
کسی بے نوا کے چراغ ہیں کبھی بجھ گئے کبھی جل گئے
رہے جدوجہد میں اس قدر، مٹے زندگی ہی میں ہم مگر
نہ تو زلفِ بخت کے خم گئے نہ جبینِ وقت کے بل گئے
کسے فکر ہجر و وصال کا، کسے ہوش حال کا، قال کا
کہ وہ اک نظر فقط اک نظر میں یہ زندگی ہی بدل گئے
جو ہیں روحِ کاملؔ خستہ تن، جو ہیں جانِ جاں، جو ہیں جانِ من
وہی درد و غم وہی فکر و فن مرے اشک و آہ میں ڈھل گئے

○

غمِ جہاں کے شکارو، تمھارے ساتھ ہوں میں
فریبِ وقت کے مارو، تمھارے ساتھ ہوں میں
خرد کی بھول بھلّیاں ہزار بھٹکائیں
جنوں کی راہ گزارو، تمھارے ساتھ ہوں میں

کبھی تو آؤ مرے ساتھ تم بھی طوفاں میں
شکست خوردہ کنارو، تمھارے ساتھ ہوں میں

رہِ حیات میں تم نے دیا نہ ساتھ تو کیا
سیاہ بخت ستارو ، تمھارے ساتھ ہوں میں

سیاہیوں سے نکلے گی صبحِ نو اے نجوم
یہ رات اور گزارو ، تمھارے ساتھ ہوں میں

جہادِ زیست میں تنہا نہیں ہو تم یارو !
جہاں جہاں ہو پکارو ، تمھارے ساتھ ہوں میں

شکستِ دل ہے تجسّس کی موت ہمسفرو !
کبھی نہ حوصلہ ہارو ، تمھارے ساتھ ہوں میں

مری حیاتِ پریشاں کا کوئی غم نہ کرو
تم اپنی زلف سنوارو ، تمھارے ساتھ ہوں میں

کشاں کشاں نہ چلو، کہکشاں کی طرح چلو
مری زمیں کے ستارو ، تمھارے ساتھ ہوں میں

کسی کا زخم سہی، زخمِ نسلِ آدم ہے
کہاں ہو سینہ فگارو ، تمھارے ساتھ ہوں میں

رُتوں کے ساتھ بدلتے نہیں بشر کامل
خزاں نصیب بہارو ، تمھارے ساتھ ہوں میں

□□

کامل نظامی

ملک کے بٹوارے سے قبل اور اُس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک بچے کھچے، پڑھے لکھے دہلی والے زبان و بیان کے معاملے میں اپنے آگے کسی کو گردانتے نہیں تھے اور دہلویت کا جذبہ تعصب اور دیوانگی کی حد تک شدید تھا۔ اُن کے نزدیک دلّی صرف شاہجہاں آباد یعنی فصیل بند شہر کا نام تھا اور اندرونِ فصیل کے رہنے والے ہی صرف دلّی والے تھے جن کی زبان معتبر و مستند تھی۔ ان کے نزدیک باڑہ ہندوراؤ، صدر بازار اور فصیل سے باہر کے دوسرے علاقے خارجی تھے اور وہاں کے رہنے والوں کی زبان غیر فصیح اور غیر مستند تھی۔ کامل نظامی جو ایک طویل عرصہ تک مقامی و بیرونی مشاعروں میں دبستانِ دہلی کی نمائندگی کرتے رہے اور مشاعرے لوٹتے رہے باڑہ ہندوراؤ کے رہنے والے تھے۔

نوک پلک درست کر کے شعر کہتے تھے اور اپنے مخصوص شاعرانہ ترنم سے مشاعروں میں چھاجایا کرتے تھے۔ نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی جیسے استاد کے شاگرد تھے۔ تاجر برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن زبان و بیان پر بھرپور دسترس حاصل تھی۔ مجاہدے سے خود استاد کے درجے کو پہنچ چکے تھے اور اپنا ایک چھوٹا سا حلقہ رکھتے تھے۔

کامل نظامی کا انتقال ۱۹۷۲ء یا ۱۹۷۳ء کو دہلی میں ہوا۔ افسوس کا مقام ہے کہ وارثین اور شاگردوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ان کا تمام شعری اثاثہ ضائع ہو گیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

یہاں زباں نہیں کھلتی ہے گفتگو کے لیے
یہ خامشی ہے محبت کی آبرو کے لیے
نگاہِ شوق کی بے تابیاں معاذ اللہ
یہ اہتمام ہے تجدیدِ آرزو کے لیے
بہار آئی ہے لیکن عجیب عالم ہے
ترس رہا ہوں تماشائے رنگ و بو کے لیے
تسلّیِ دل صد چاک ہوگئی کامل
کسی کا تارِ نظر مل گیا رفو کے لیے

○

مل بھی جائے گی راحت منحرف زمانے میں سے
سوچا بھی ہے پہلے آشیاں بنانے سے
اس لیے محبت میں راحتوں کا منکر ہوں
زندگی نہ مٹ جائے نقشِ غم مٹانے سے
گلستاں میں کیا ڈالیں وہ بنا نشیمن کی
لاگ بجلیوں کو ہے جن کے آشیانے سے
داغِ دل کی افزائش روکشِ گلستاں ہے
ہر بہار شرمندہ اس بہار خانے سے
آج بربطِ دل پر کون یہ غزل خواں ہے
زندگیِ الفت کی نبض ہے ٹھکانے سے

مستقل خدا رکھے کاش اِن بہاروں کو
زندگی مہک اٹھی تیرے مسکرانے سے

یہ بچے بھی اے کاملؔ ہیں شریر کس درجہ
لے چلے ہیں زاہد کو وعظ کے بہانے سے

○

نشاط و رنج کا رشتہ بھی کتنا محکم ہے
ہر اک الم ہے مسرّت ، ہر اک خوشی غم ہے
کسی سے ربطِ محبت کوئی گناہ نہیں !
ازل سے عشق شریکِ سرشتِ آدم ہے
مری نگاہ میں وہ ہیں بہار کے آنسو
سمجھ رہا ہے زمانہ جنھیں کہ شبنم ہے

○

مبارک طالبانِ دید وہ ہوتے ہیں بے پردہ
بقدرِ ظرف جلووں کا تماشا دیکھتے جاؤ
غمِ امروز کی تاریکیوں سے کھیلنے والو
جلاتا ہوں چراغِ عیشِ فردا دیکھتے جاؤ
اٹھی ہے اب مشیت غیظ کی طغیانیاں لے کر
ابھی کیا ہے ، ابھی ہوتا ہے کیا کیا دیکھتے جاؤ

○

ذرا دم لے کہ پوری حسرتیں برق تپاں کرلوں
نثارِ آشیاں ہولوں طوافِ آشیاں کرلوں
تہیہ ہے کہ شرحِ حالتِ سوزِ نہاں کرلوں
شریکِ غم تجھے اب رازِ دل کا ترجماں کرلوں

نہ ہو بیتابِ جلوہ اس قدر اے شوقِ نظارہ
مناسب ہے ابھی ظرفِ نظر کا امتحاں کرلوں

○

تری نظر کے اشارے اُداس رہتے ہیں
یہ زندگی کے سہارے اُداس رہتے ہیں
مجھی سے ہوتی ہے بیدار موجِ خوابیدہ
مرے بغیر کنارے اُداس رہتے ہیں
ترا جمال رہینِ نقاب ہے جب سے
فلک پہ چاند ستارے اُداس رہتے ہیں

□□

کرشن موہن

دو درجن سے زیادہ شعری مجموعوں کے خالق کرشن موہن ۲۸ نومبر ۱۹۲۲ء کو سیالکوٹ جیسے مردم خیز شہر میں پیدا ہوئے۔ آزادیٔ وطن کے بعد کرنال میں ویلفیئر آفیسر رہے۔ کچھ عرصہ آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اور دہلی سے وابستہ رہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے مشہور جریدے ''آواز'' کے سب ایڈیٹر اور بعد میں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ''آواز'' سے نکل کر وزارتِ اطلاعات ونشریات کے پریس انفارمیشن بیورو میں صحافی کے فرائض انجام دیے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں کرشن موہن کا سفر جاری رہا اور شعر وادب اور صحافت کی دنیا سے نکل کر ۱۹۵۴ء میں مالیات کی دنیا میں پہنچے اور انکم ٹیکس آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ میں پچیس چھبیس سال عوام وخواص کی آمدنی اور دولت کا محاسبہ کرتے ہوئے ۱۹۸۰ء میں انکم ٹیکس کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور دہلی میں پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں اور شعر وادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

کرشن موہن اردو کے اُن چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے ادبی رسائل و جرائد میں مسلسل چھپ کر اپنی شناخت بنائی ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد شعری مجموعے منظرِ عام پر لاتے رہے ہیں۔ ''شبنم شبنم''، ''دلِ ناداں''، ''تماشائی''، ''غزل''، ''نگاہِ ناز''، ''آہنگِ وطن''، ''کونپل کونپل''، ''بیراگی بھنورہ''، ''شیرازہ''، ''مژگاں''،

''ہرجائی''، ''تیری خوشبو''، ''گیان مارگ کی نظمیں''، ''کوئے ملامت''، ''من کے منکے''، ''کفرستان''، ''اداسی کے پانچ روپ'' اور ''سمے سحرا'' جو اسی سال منظرِ عام پر آیا ہے کرشن موہن کے مشہور مجموعے ہیں۔ جنوری ۲۰۰۴ء کو کرشن موہن کا انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

ہوئی ہے ختم کہانی یقیں نہیں آتا
گزر گئی ہے جوانی یقیں نہیں آتا

تمھارا حسن ہے فانی یقیں نہیں آتا
ہمارا عشق ہے فانی یقیں نہیں آتا

یہ آئینے میں نہیں آپ اور ہے کوئی
کوئی ہے آپ کا ثانی یقیں نہیں آتا

ہوئی ہے میری مذمت مرے حریفوں میں
اور آپ ہی کی زبانی یقیں نہیں آتا

سنا کے اپنی کہانی جو میں نے دیکھا ہے
تمھاری آنکھوں میں پانی یقیں نہیں آتا

صلائے فکر و نظر دے رہی ہے دُنیا کو
ہماری شوخ بیانی یقیں نہیں آتا

ترے جنونِ محبت میں کرشن موہن نے
بنوں کی خاک نہ چھانی یقیں نہیں آتا

○

ہمارے حوصلے پر ہنس گئی ہے
ہمیں طعنوں سے دُنیا ڈس گئی ہے
شکستِ پے بہ پے سے دل ہے بے دم
ہماری زیست سے ڈھارس گئی ہے

جوانی ، شوق و مستی کی کہانی
لُٹا کر کامنا کا رس، گئی ہے
ملن کی شام ہے مستی کا پیغام
مری نس نس میں خوشبو بس گئی ہے
تری چاہت ہے گو راحت کی دشمن
کمر، میرے جنوں کی، کس گئی ہے
مجھے گھیرے ہیں مکروہاتِ عالم
مری کشتی بھنور میں پھنس گئی ہے
چمک چت چور چنچل آنچلوں کی
ہمارے ذہن میں رچ بس گئی ہے
امنگ اُس سے ملن کی کرشن موہن
مچل کر آئی تھی ، بے بس گئی ہے

○

سے کہاں تھا کہ ہم تیری آرزو کرتے
حیات بیت گئی، اپنی جستجو کرتے
تلاشِ یارِ طرحدار کو بکو کرتے
ترس گیا ہوں تمنائے رنگ و بو کرتے
جمال دیکھ کے تیرا، عرق عرق ہوتا
اگر تجھے کبھی ہم گل کے روبرو کرتے
یہ اور بات کہ میں سر فراز ہو نہ سکا
تمام عمر کٹی کوششِ نمو کرتے
تمھارے دل کے بھرم اور بھید کھل نہ سکے
کبھی تو ہم سے بھی تم کھل کے گفتگو کرتے
اگر یہ جانتے ہم، تیرا دل نہ پگھلے گا
تری تلاش میں کیوں اپنا دل لہو کرتے

پنپ نہ پائے، روایت پرست، سوکھ گئے
قدیم رنگ کی تقلید ہو بہو کرتے
دُعائے مغفرتِ دل قبول ہوجاتی
جو اشک ہائے ندامت سے ہم وضو کرتے
ادائے ناز ہے، نازک بدن کی خوشبو سے
مجھے جو آپ سرافراز و سرخ رو کرتے
ہمیں عروج و فرازِ جنوں کہاں ملتا
اگر نہ عشق میں نیلام آبرو کرتے
ہوس ہماری محبت سے بھی اُبھر آتی
کہاں تک اپنی کثافت کی شُستہ وشُو کرتے
برنگِ میؔر چمک اٹھتے کرش موہن ہم
جو صَرف خونِ غزل میں کبھو کبھو کرتے

O

اے عشق ترے ہاتھ میں کشکول رہا ہے
لیکن تیرا انداز تو انمول رہا ہے
دریوزہ گری نے بھی تری قدر نہ کم کی
ہر عہد میں بالا ہی ترا بول رہا ہے
گو کشمکشِ ہوش و خرد میں ہوں گرفتار
ہر شعر مرا، رازِ جنوں کھول رہا ہے
وہ بولتا ہے جھوٹ بھی کچھ ایسی ادا سے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ سچ بول رہا ہے
پوچھے گا بھلا کون یہاں حال ہمارا
جب حسنِ دل افروز ہی پر تول رہا ہے
کس قُرب کا غمّاز ہے، کس پیار کا انداز
یہ ساز جو آواز میں رس گھول رہا ہے

ہر شہر میں آشوب ہے ہر قریہ میں فتنہ
وہ منظرِ وحشت ہے کہ دل ڈول رہا ہے
کیوں محفلِ بیزار میں دل اشک بہا کر
مٹی میں تمنّا کے گہر رول رہا ہے
سچ ہے کہ نہیں راست زمانے کا چلن کرشن
موہن ترے کردار میں بھی جھول رہا ہے

○

اپنے گرد و پیش کو اندوہ افزا کر دیا
کیوں دلِ معصوم کو وقفِ تمنا کر دیا
اپنی خاموشی بھی رسوائی کا باعث بن گئی
ضبطِ غم نے بھی ہمارا راز افشا کر دیا
اے تماشہ گر خرد کی آزمائش کے لیے
تو نے ہر انسان میں شیطان پیدا کر دیا
آدمی ہونے کا دعویٰ کر نہیں پایا خدا
آدمی نے تو خدا ہونے کا دعویٰ کر دیا
زندگی کا سامنا کرنا بڑا دُشوار تھا
شامِ غم کو ہم نے وقفِ جام و مینا کر دیا
عشق نے دکھلا کے اپنا ناز پرور آئینہ
حسنِ بے پروا کو خود بیں و خود آرا کر دیا
بھوگ میں من کھو گیا گو نام روشن ہو گیا
اپنا پاون یوگ ہم نے نذر دنیا کر دیا
من کے سونے پن کا درپن ہی رہا پیشِ نظر
سوچ نے مجھ کو بھری محفل میں تنہا کر دیا

کوزہ گر تو نے بصد افسوں دلِ بے تاب کو
کوزہ تن میں سمویا اور دریا کردیا
کرشن موہن مضطرب ہو اٹھے اہلِ انجمن
ایک فتنہ گر نے آکر حشر برپا کردیا

دلدل

مرا ذہن بنتا چلا جا رہا ہے خیالاتِ فاسد کی دلدل
کہ محسوس ہونے لگا ہے
مری زندگی میں رہے گی ہمیشہ ہوس کارفرما
ہو سرما کہ گرما
کبھی پیاس بجھتی نہیں ہے
پیوں جتنی بھی مے
فسونِ ملاقات ہے باعثِ بیقراری
جنونِ ملاقات رہتا ہے طاری
کہ اکثر ملاقات ہوتی ہے لیکن ملاقات کو جی ترستا ہے نسدن
کئی بار اس کیفیت پر ہنسا ہوں
ہے یہ کیسی دلدل کہ جس میں پھنسا ہوں
ابھرتا ہوں میں اس کی گہرائی سے بھی
مگر جیسے پھر ڈوب جانے کی خاطر
غضب ہے ہوس کا یہ کس بل
مرا ذہن بنتا چلا جا رہا ہے خیالاتِ فاسد کی دلدل

کام شکتی

کہتے ہیں گینڈے کے سینگوں کا سفوف
کام شکتی کو بڑھانے کی دوا میں کام آتا ہے بہت
جانے کس تحقیق سے حاصل ہوا تھا یہ وقوف
بھاری بھرکم جانور
اس قدر کامی نہیں جتنا بشر
اور اُدھر
یہ بھی کہتے ہیں چڑے کا بھی دماغ
جنسیت کا ہے چراغ
اس کو ادرک میں ملا کر کھاتے ہیں اہلِ ہوس
جس سے بڑھ جاتا ہے اُن کے جسم کا کس، کام رس
ایک ننھا سا پرندہ نہ بھی ہے کتنا پُر اثر
بھاری بھرکم جانور
اور ننھا سا پرندہ... ان سے ہے ماخوذ مانو کام شکتی کا سفر
روپ ہیں جس کے انیک
سچ تو یہ ہے پھر بھی کوئی جانور
اس قدر کامی نہیں جتنا بشر

□□

کِرن کاشمیری

کشمیری النسل بلدیوراج کِرن کاشمیری گرچہ بنیادی طور پر صحافی ہیں لیکن ان کا قلم ہمہ جہت ہے۔ انھوں نے ناول لکھے ہیں، انگنت افسانے سپردِ قلم کیے ہیں اور شاعری بھی کی ہے لیکن شاعری میں صرف نظم کو ہی جذبات واحساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔

کرن کاشمیری ۱۲/اپریل ۱۹۳۴ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد آنجہانی ہربنس لال چوپڑہ بھی صاحبِ قلم تھے۔ اردو میں ہربنس کنول کے قلمی نام سے کہانیاں، ریڈیو ڈرامے لکھا کرتے تھے اور ریڈیائی فیچر کے حوالے سے کافی مشہور تھے۔ ہربنس کنوؔل صاحب ڈوگری زبان کے مشہور شاعر بھی تھے۔ کرن کاشمیری کی صحافتی زندگی آل انڈیا ریڈیو کے نیوز ڈویژن میں سرکاری نوکری سے شروع ہوئی جہاں سے وہ جوائنٹ ڈائرکٹر نیوز کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ سرکاری نوکری سے سبکدوش ہونے کے بعد کرن نے بڑے ذوق اور شوق سے ''جرسِ کارواں'' شروع کیا جو اردو میں اپنی نوعیت کا منفرد ہفت روزہ ہے۔

''شہرِ گل، شہرِ خموشاں'' کرن کاشمیری کا شعری مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ دو ناول ''خوابوں کے قافلے''، ''رات اور زاف'' اور دو افسانوی مجموعے ''ادھورے سپنے''، ''تنہا درخت'' بھی منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

شہرِ گل، شہرِ خموشاں

عجب عالم ہے شہرِ گل کا اب کے
اگر دیکھو، تو کتنا پُرسکون ہے
خموشی!
جس کی خاطر اہلِ بینش
رشی، صوفی، ولی اور فلسفی سب
پہاڑوں جنگلوں کو بھاگتے تھے
اب اپنے شہر میں گھر گھر ملے گی
مگر خاموشیاں کوہ و دمن کی
زبان رکھتی نہیں پر بولتی ہیں
تھکے ذہنوں کو لوری سی سنا کر
حسیں سپنوں کی دنیا بخشتی ہیں
عجب عالم ہے لیکن شہرِ گل کا
یہاں دیکھو تو ہر منہ میں زباں ہے
صدا پر برف سی لیکن جمی ہے
کوئی آواز
کوئی قہقہہ
یا کوئی سسکی
کسی جانب سے آتی ہی نہیں ہے
اگر آواز ہے تو رائفلوں کی۔

ایمرجنسی

اب تو خوش ہو؟

ناچو گاؤ!!

میں نے اپنے فاؤنٹین پین کو خوب دبا کر

اس کے نب کو توڑ دیا ہے!

میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے

اپنے سپنوں، ارمانوں کو

اپنے گیتوں اور آہوں کو

ان کا منصف قاتل بنا کر

موت کا حکم سنا ڈالا ہے

ان سب کو پھانسی پہ چڑھا دو

خوش ہو جاؤ

ناچو گاؤ!

میں منصف تھا

تم مدعی

ملزم؟

میرے گیت اور آہیں

میرا پیار

خواب اور ارماں

میں نے صرف تمھاری خاطر

قتلِ عام کا حکم دیا ہے؟

اب ہونٹوں پر کبھی کوئی نغمہ نہ جگے گا

کوئی گیت نہیں لرزے گا

میں نے قلم کو توڑ دیا ہے
لو اب جھومو
خوش ہو جاؤ۔

انتباہ

ہماری رسم ہے
تم جانتے ہو؟
کئی صدیوں سے ہم یہ کر رہے ہیں
بڑی محنت سے خونِ دل جلا کر
صبح و شب نور آنکھوں کو پلا کر
تراشے سنگ مرمر، سخت پتھر
اور ان سے خوبصورت بت بنائے
بٹھا کر مندروں میں ویدیوں پر
انھیں پوجا انھیں سجدے کیے ہیں
ہماری رسم ہے
تم جانتے ہو
کہ کھنڈت ہو گئی ہے مورتی جب
تو ہم نے تج دیا
دیکھا نہ مڑ کر
وہ تنہا رہ گئے یگ کی ڈگر پر
نہ کوئی بھگت نہ کوئی پجاری
نہ کوئی آرتی
نہ دھوپ دیپک

زیادہ سے زیادہ یہ ہوا ہے
عجائب گھر کی زینت ہو گئے ہیں
ہماری رسم ہی چوں کہ یہی ہے
تمھارا فرض ہے
محتاط رہنا
شکست و ریخت سے خود کو بچانا
صنم ہو گوشت کے زندہ
یا پتھر
خراش آئی اگر رُخ پر، بدن پر
تو کوئی بھی تمھیں سجدہ نہ ہوگا
اگر سالم رہے
سجدے بھی ہوں گے۔

راجیو گاندھی کا قتل

وہ کہتا تھا
لوگوں کے دُکھ دیکھ دیکھ کر
میرا دل رونے لگتا ہے
اور ٹکڑے ہونے لگتا ہے
ہم نے سوچا
کیوں نہ اس کا درد بانٹ لیں؟
اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں!
اور اکٹھے بیٹھ کر روئیں!!

لہر

درد کی بس ایک لہر سی تھی، گئی آئی نہ پوچھ
کتنی چھوٹی ہوگئی تھی شامِ تنہائی نہ پوچھ
یاد کی رادھا کی پائل کون زخمی کرگیا؟
کھوگیا کس ورنداون میں دل کا کنہائی نہ پوچھ
شب کی حبشن کی رگوں سے خون نچڑا کس طرح
کیسے رخسار سحر پر کھیلی رعنائی نہ پوچھ
ذہن میں قوس قزح ابھری نگہ میں خون رنگ
دل میں ملنے کی کسک کیا گل کھلا آئی نہ پوچھ
آخرش سایہ بھی پگھلا، بہہ گیا ہالہ بنا
ہم پہ پورے چاند نے جو آگ برسائی نہ پوچھ!

○

میں نے تجھ پر شعر کہے جو، آج سنائے غیروں کو
تیرے میرے دل کی باتیں پہنچ گئیں دیواروں کو
تم بھی دل کا درد لیے ہو ہم بھی دل سے ہیں مجبور
تم کو اب سمجھائیں کیا؟ سمجھاتے ہیں نادانوں کو
دل پر ہاتھ، بھنچے ہونٹوں پر اک مسکان سرک آئی
ایسے وقت تو لوگ بلاتے ہیں اپنوں بیگانوں کو
شاید ہم دونوں آپہنچے وقت کے اس دوراہے پر
جب تم پھول بھری راہ چاہو، اور ہم ڈھونڈیں کانٹوں کو
مستقبل کے خواب سجائے ہم یادوں پر جیتے ہیں
وہ زندہ ہیں آج کی خاطر، کیا سمجھیں ان باتوں کو

میری نظر ہے آسمان پر، اور تمھاری دھرتی پر
کب ٹھوکر کی لذت جانے، دیکھ چلے جو راہوں کو
اب تو رخصت کرو خزاں کو دو آواز بہاروں کو
گلشن گلشن کرو چراغاں مہکاؤ گلیاروں کو
اسے ایذا طلبی کا یا حسن پرستی کا دو نام
میں نے پھول سمجھ کر اکثر چوم لیا انگاروں کو
عیسیٰ اور منصور کے بعد ہوئے خاموش، کرنؔ جی بھی
اب کوئی بھی سچ نہ کہے گا خوشخبری دو یاروں کو

□□

کفیل آزر

برِصغیر ہندوستان و پاکستان کے مشہور و مقبول گلوکار جگجیت سنگھ نے ۱۹۷۷ء میں جب ایک خوبصورت سی نظم کی صدا بندی کی تھی اور اپنی مدھر و خوبصورت آواز میں اُس نظم کا پہلا مصرع ''بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی'' اٹھایا تھا تو شاید اُسے بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ نظم اس کو اور شاعر کو شہرت اور مقبولیت کی انتہا تک پہنچا دے گی۔ گائیکی سے مزین جب اس نظم کا ریکارڈ مارکیٹ میں آیا تو جگجیت سنگھ کے سابقہ گانوں کے ریکارڈ ٹوٹ گئے اور یہ نظم اس کی پہچان بن گئی۔ اس نظم کے خالق تھے اس زمانے کے گمنام نغمہ نگار اور ادبی جرائد و رسائل کے حوالے سے پہچانے جانے والے شاعر کفیل آزر۔

کفیل آزر کا خاندانی نام کفیل احمد صدیقی ہے۔ ۲۲/اپریل ۱۹۴۰ء کو امروہہ میں جناب خلیل احمد صدیقی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اوائلِ عمر میں باپ اور دادا کی شفقت اور سائے سے محروم ہو گئے۔ دادیہال کے دوسرے بزرگوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے نویں جماعت کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ حصولِ معاش کے لیے دہلی کا رُخ کیا۔ یہاں کچھ دفتروں میں نوکریاں کی، اپنا ادبی رسالہ نکالا لیکن جب کامیابی کہیں نظر نہیں آئی تو بمبئی کا رُخ کیا۔ کمال امروہوی کے اسٹوڈیوز سے لے کر متعدد اسٹوڈیوز میں چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کی، دوسرے اور تیسرے درجے کی فلموں کے لیے کہانیاں، مکالمے اور گیت لکھے

لیکن کسی بڑے اور ہٹ ڈائرکٹر، پروڈیوسر کے ساتھ کام کرنے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ اس لیے فلمی دنیا میں کوئی نام نہیں کما سکے۔

کفیل آزر دس سال کی عمر سے شاعری کر رہے ہیں۔ تلمیذ الرحمٰن ہیں۔ فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کرتے ہوئے کفیل آزر کی شاعری کو زنگ نہیں لگا بلکہ ادبی رسالوں سے ان کا تعلق برابر جاری رہا اور ان کی سنجیدہ شاعری ادب کے سنجیدہ قارئین تک برابر پہنچتی رہی۔ ''دھوپ کا دریچہ'' اور ''آسمان خوابوں کا'' کفیل آزر کے دو شعری مجموعے ہیں جو ۱۹۹۳ء اور ۲۰۰۱ء میں منظرِ عام پر آچکے۔ فلمی دنیا کو ترک کر کے کفیل آزر پچھلے دس پندرہ برسوں سے دہلی میں مقیم ہیں اور دہلی اردو اکادمی کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

اندیشہ

بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی
لوگ بے وجہ اداسی کا سبب پوچھیں گے
یہ بھی پوچھیں گے کہ تم اتنی پریشاں کیوں ہو
جگمگاتے ہوئے لمحوں سے گریزاں کیوں ہو
انگلیاں اٹھیں گی سوکھے ہوئے بالوں کی طرف
چوڑیوں پر بھی بہت طنز کیے جائیں گے
کانپتے ہاتھوں پہ فقرے بھی کسے جائیں گے
اک نظر دیکھیں گے گزرے ہوئے سالوں کی طرف
پھر کہیں کہ ہنسی میں بھی خفا ہوتی ہیں
اب تو روحی کی نمازیں بھی قضا ہوتی ہیں
لوگ ظالم ہیں ہر اک بات کا طعنہ دیں گے
باتوں باتوں میں مرا ذکر بھی لے آئیں گے
ان کی باتوں کا ذرا سا بھی اثر مت لینا
ورنہ چہرے کے تاثر سے سمجھ جائیں گے

چاہے کچھ بھی ہو سوالات نہ کرنا ان سے
میرے بارے میں کوئی بات نہ کرنا ان سے
بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی

غزل

پورے ہر شخص کے ارمان نہیں ہوتے ہیں
اتنا مایوس مری جان نہیں ہوتے ہیں
فرق جو کرتے ہیں اللہ میں اور ایشور میں
جانور ہوتے ہیں انسان نہیں ہوتے ہیں
تو پریشاں ہے تو خوابوں میں بسالے مجھ کو
اشک آنکھوں کے نگہبان نہیں ہوتے ہیں
بات مندر کی ہو مسجد کی ہو گردوارے کی
لوگ اب صاحبِ ایمان نہیں ہوتے ہیں
تیری قربت، تری دوری، تری یادوں کی قسم
ہم کبھی بے سرو سامان نہیں ہوتے ہیں
گھر میں زندہ ہی جلا دیتے ہیں انسانوں کو
احمد آباد میں شمشان نہیں ہوتے ہیں
آپ سے ملنے کی ہر لمحہ تمنا ہے مگر
آپ سے ملنے کے امکان نہیں ہوتے ہیں
جب بھی گھبراؤ کسی غم سے بلا لینا ہمیں
اپنے ہیں، اپنوں کے احسان نہیں ہوتے ہیں
بھول بھی جاؤ وہ غالب کا زمانہ یارو
زود کیا، لوگ پشیمان نہیں ہوتے ہیں
ہر قدم سوچ سمجھ کر ہی بڑھانا آزر
مرحلے زیست کے آسان نہیں ہوتے ہیں

○

رات کے دشت میں پھیلا ہوا سناٹا ہوں
اپنے سائے سے بچھڑنے کی سزا پاتا ہوں
میں کبھی اپنے لیے غیر نہیں تھا اتنا
آئینہ دیکھ کے کل رات بہت رویا ہوں
تم سے ملنے کی خوشی ہے نہ بچھڑنے کا ملال
خود فریبی کے اب اس موڑ پہ آ پہنچا ہوں
کوئی ملتا ہی نہیں آنکھ ملانے والا
میں ترے شہر میں سورج کی طرح تنہا ہوں
زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے آزر
اور میں ہوں کہ ضرورت کی طرح زندہ ہوں

○

دیکھ لو خواب مگر خواب کا چرچا نہ کرو
لوگ جل جائیں گے سورج کی تمنا نہ کرو
کرچیاں ٹوٹے ہوئے عکس کی چبھ جائیں گی
اور کچھ روز ابھی آئینہ دیکھا نہ کرو
اجنبی لگنے لگے خود تمھیں اپنا ہی وجود
اپنے دن رات کو اتنا بھی اکیلا نہ کرو
خواب بچوں کے کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں
خواب دیکھا نہ کرو خواب دکھایا نہ کرو
بے خیالی میں کبھی انگلیاں جل جائیں گی
راکھ گزرے ہوئے لمحوں کی کریدا نہ کرو
موم کے رشتے ہیں گرمی سے پگھل جائیں گے
دھوپ کے شہر میں آزر یہ تماشا نہ کرو

O

سکوں تھوڑا سا پایا دھوپ کے ٹھنڈے مکانوں میں
بہت جلنے لگا تھا جسم برفیلی چٹانوں میں

کب آؤ گے یہ گھر نے مجھ سے چلتے وقت پوچھا تھا
یہی آواز اب تک گونجتی ہے میرے کانوں میں

جنازہ میری تنہائی کا لے کر لوگ جب نکلے
میں خود شامل تھا اپنی زندگی کے نوحہ خوانوں میں

تماشہ ہم بھی اپنی بے بسی کا دیکھ لیتے ہیں
تری یادوں کے پھولوں کو سجا کر پھول دانوں میں

زمیں پیروں کے چھالے روز چن لیتی ہے پلکوں سے
تخیل روز لے اڑتا ہے مجھ کو آسمانوں میں

میں اپنے آپ سے ہردم خفا رہتا ہوں یوں آزر
پرانی دشمنی ہو جس طرح دو خاندانوں میں

O

لے گیا مجھ سے مجھے روٹھ کے جانے والا
کاش یہ حادثہ بھی ہوتا بھلانے والا

پھول جب روز کتابوں میں کھلا کرتے تھے
وہ زمانہ نہیں اب لوٹ کے آنے والا

اب دعاؤں سے مقدر نہیں بدلا کرتے
آپ بھی کام کریں کوئی زمانے والا

مدتوں پاس سمندر کے رہا میں، لیکن
ایک قطرہ نہ ملا پیاس بجھانے والا

اب فسادوں کی خبر سن کے لرز جاتا ہوں
گھر میں بس ایک ہی بیٹا تھا کمانے والا

شہر آنکھوں کا بہت دن سے ہے سونا آزر
حادثہ کوئی تو ہو دل کو دکھانے والا

فریب

ہر اک شام مجھے یوں خیال آتا ہے
کہ جیسے ٹاٹ کا میلا پھٹا ہوا پردہ
تمھارے ہاتھ کی جنبش سے کانپ جائے گا
کہ جیسے تم ابھی دفتر سے لوٹ آؤ گے
مجھے تو یاد نہیں کچھ تمھارے سر کی قسم
مگر پڑوس کی لڑکی بتا رہی تھی کہ میں
اب اپنی مانگ میں افشاں نہیں سجاتی ہوں
توے پہ روٹیاں اکثر جلائی ہیں میں نے
شکر کے بدلے نمک چائے میں ملاتی ہوں
وہ کہہ رہی تھی کہ سُونی کلائیاں میری
تمام عمر یونہی چوڑیوں کو ترسیں گی
غموں کی دھوپ میں جلتے ہوئے اِس آنگن پر
مسرتوں کی گھٹائیں کبھی نہ برسیں گی
وہ کہہ رہی تھی کہ اب تم کبھی نہ آؤ گے
گلی کے موڑ پہ لیکن ہر ایک شام مجھے
تمھارے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے
ہر ایک شام مجھے یوں خیال آتا ہے
کہ جیسے تم ابھی دفتر سے لوٹ آؤ گی

کلدیپ گوہؔر

کشمیری نژاد کلدیپ نرائن تِکّو المتخلص بہ کلدیپ گوہؔر ۲۰ردسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق دیال سنگھ ہائی اسکول لاہور کی دین ہے جہاں کسی زمانے میں پنڈت دیرین پرشاد فداؔ لاہوری اور جناب جگن ناتھ آزاد جیسے شعراء اردو اور انگریزی کی تعلیم دیتے تھے اور اسکول ادبی ماحول کا حامل تھا۔ کلدیپ گوہؔر نے ۱۹۴۴ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ ابتداء میں فداؔ لاہوری سے مشورۂ سخن کیا۔ دیال سنگھ کالج میں تعلیم کے دوران علامہ تاجؔور نجیب آبادی اور سید عابد علی عابدؔ جیسے جید اساتذہ سے ذہنی تربیت حاصل کی۔ ۱۹۴۹ء میں منشی بشیشور پرساد منور لکھنوی کے تلامذہ میں داخل ہوئے۔

حکومتِ ہند کے محکمہ سی پی ڈبلو ڈی میں ملازم تھے جہاں سے ۲ردسمبر ۱۹۸۷ء کو ریٹائر ہوئے۔ گوشہ نشین شاعر ہیں۔ مشاعروں اور شعری و ادبی نشستوں سے دور رہتے ہیں۔ کلدیپ گوہؔر کی غزلیات اکثر ریڈیو سے نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ''نوائے احساس'' غزلوں اور نظموں پر مشتمل شعری مجموعے کا نام ہے جو ۲۰۰۱ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

سفر میں زندگی کے ہم انھیں رہبر سمجھتے ہیں
جو سنگِ راہ کو پھولوں ہی کا بستر سمجھتے ہیں

بشر نے ہی نہیں سمجھے رموزِ گردشِ پیہم
رموزِ گردشِ پیہم مہ و اختر سمجھتے ہیں

الٰہی رازِ ہستی ایک ایسا راز ہے جس کو
نہ دیوانے سمجھتے ہیں نہ دانش ور سمجھتے ہیں

خیالوں سے ہی سچائی کا اندازہ نہیں ہوتا
کہ منظر دیکھنے والے ہی پس منظر سمجھتے ہیں

حقیقت کو سمجھنے میں خودی کا زعم حائل ہے
حقیقت ہم متاعِ بےخودی پا کر سمجھتے ہیں

بشر نے جنگ کا میداں بنایا ہے انھیں ورنہ
پرندے مندر و مسجد کو اپنا گھر سمجھتے ہیں

جنونِ عشق کے ماروں کی خوبی ہے یہی گوہؔر
وہ ہر بیداد گر کو اپنا چارہ گر سمجھتے ہیں

○

کم کسی طور نہ ہوگی یہ گرانی سر سے
اب نہیں جائے گا آزارِ نہانی سر سے

کیوں ابھرتا ہی نہیں جذبۂ اخلاص و وفا
کیوں نکلتی ہی نہیں ریشہ دوانی سر سے

ابھی ٹوٹی ہی کہاں آہنی دیوارِ رسوم
ابھی نکلا ہی کہاں جوشِ جوانی سر سے

میری غیرت کا تقاضا ہے کہ اِمداد نہ لوں
اونچا ہوتا ہے تو ہوتا رہے پانی سر سے
ہوچکا عہدِ وفا ختم ہمارا کب کا
اب تو واللہ نکالو یہ کہانی سر سے
ہم نے گرنے نہ دِیا پرچمِ انوارِ خودی
جب تلک جاری رہی خوں کی روانی سر سے
جب بھی ہوتا ہے سخن گوئی پہ مائل گوہؔر
خود چھلک پڑتے ہیں الفاظ و معانی سر سے

O

کہاں سے مفہومِ شعر آئے نیا نیا سا
چراغِ فکر و خیال ہو جب بجھا بجھا سا
غبارِ نفرت، نہ گرد کینہ، نہ داغِ رنجش
چلے بھی آؤ کہ آج دل ہے دُھلا دُھلا سا
خدایا سب کی نگاہیں اُس پر ہی پڑ رہی ہیں
ہے گلستاں میں جو اک شگوفہ کھلا کھلا سا
یہ اُس کے حسن و جمال کی طرفگی ہے شاید
وہ بھیڑ میں ہے مگر ہے سب سے جُدا جُدا سا
ہیں میری نظریں بھی آج کچھ کچھ جھکی جھکی سی
تمھارا بھی رنگِ رُخ ہے کچھ کچھ اُڑا اُڑا سا
سخن کے سیلاب کا یہ منظر عجیب سا ہے
رواں رواں سا ہے گاہے گاہے رُکا رُکا سا
اگرچہ فکر و نظر میں گوہؔر کے ہے بلندی
مگر وہ رکھتا ہے سر ہمیشہ جھکا جھکا سا

○

پوچھ لیتے ہیں وہ اکثر کہ ہے حالت کیسی
ہم پہ ہو جاتی ہے اُن کی یہ عنایت کیسی
کبھی بیمارِ محبت سے رجوع کیجیے گا
جاننا چاہو کہ ہے درد کی لذّت کیسی
عہدِ حاضر میں تو ہے ذکر بھی ان کا بے سود
کیسا آئینِ وفا اور مروّت کیسی
غیر کے غم میں بھی بے ساختہ رو دیتے ہیں
ہم کو اللہ نے بخشی ہے طبیعت کیسی
عشق صادق ہے ہمارا تو ہمیں کیا معلوم
شکوہ کیا ہوتا ہے، ہوتی ہے شکایت کیسی
دستِ قدرت کا کرشمہ اسے سمجھیں ورنہ
خار اور گل میں بھلا، باہمی صحبت کیسی
آپ آئے ہیں عیادت کو تو دم بھر ٹھہریں
حالِ دل پوچھنے میں ایسی بھی عجلت کیسی
ہم تو ہر حال میں راضی بہ رضا ہیں گوہر
ہم نہیں جانتے ہوتی ہے عبادت کیسی

○

وہی ہے طرزِ تغافل وہی ہے خو مجھ میں
اُتر گیا ہو وہ جیسے کہ ہو بہو مجھ میں
میری نگاہ میں ہیں منزلیں بھی راہگزر
کہاں سے اُمڈا ہے یہ شوقِ جستجو مجھ میں
خوشی یہی ہے بالآخر کسی کے کام آئے
بچا ہو ایسے جو اک بوند بھر نہ ہو مجھ میں

یہ کس کے دم سے چراغاں ہے میری بزمِ خیال
یہ کون کرتا ہے رہ رہ کے گفتگو مجھ میں
کسی طرح بھی میری برتری نہ ہونے دی
خیالِ دوست بھی بن کر رہا عدو مجھ میں
مجھے یقین ہے وہ دن ضرور آئے گا
کہ جب میں تجھ میں سماؤں گا اور تو مجھ میں
بنا ہے مرجعِ احباب گھر میرا گوہرؔ
در آئی مہر و مروّت کی جب سے بو مجھ میں

○

تن پر احباب کے ہم خونیں قبا دیکھتے ہیں
کون اس جرم کی پاتا ہے سزا دیکھتے ہیں
نا خدا نے ہمیں منجھدار میں لاکر چھوڑا
کیا ہے اپنے لیے فرمانِ خدا دیکھتے ہیں
ہمیں کر دیتا ہے احساسِ ندامت زخمی
نطق جب اوڑھے خموشی کی ردا دیکھتے ہیں
گل شرر بار نہیں، شبنم بھی لہو روتی ہے
مژدہ کیا لائے ہے اب موجِ صبا دیکھتے ہیں
پھر ہے معصومیتِ حسن پہ یلغارِ گنہ
پھر لہو رنگ ہوا دستِ حنا دیکھتے ہیں
دین و ایماں کے پرستار بچارے دن رات
سہمے سہمے ہوئے تاثیر دعا دیکھتے ہیں
عشق ہی بخشے ہے خوش منظری ہم کو گوہرؔ
ورنہ یاں سلسلۂ رقصِ قضا دیکھتے ہیں

□□

کمار پاشی

انیس سو پچاس پچپن کے آس پاس دہلی کے ہندی علاقوں میں اردو شاعری کے نام پر منعقد کی جانے والی چھوٹی بڑی نشستوں میں نئی لفظیات، نئی اپروچ، نئی تعبیرات کی حامل منفرد رنگ کی نظمیں سنانے والا نوجوان شاعر کمار پاشی بھی غیر منقسم پنجاب میں پیدا ہونے والے اُن شاعروں میں تھا جن کی ہجرت نصیب شاعری نے دہلی میں آنکھ کھولی۔

کمار پاشی، جن کا خاندانی نام شنکر دت کمار تھا، ۳؍جولائی ۱۹۳۵ء کو غیر منقسم ہندوستان کی ریاست بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ وطن کے وقت کمار پاشی کا خاندان ہجرت کر کے پہلے جے پور پہنچا اور پھر دہلی کو اپنا مستقر بنایا۔ یہیں کمار پاشی کی تعلیم و تربیت ہوئی اور ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔

کمار پاشی کی شاعری اور ان کی نظمیں اپنی لفظیات، اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے کسی روایت پرست استاد شاعر کے تلمذ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں اس لیے پاشی نے اپنے وجدان کو رہبر بنایا اور اپنی تربیت خود کی۔ اس خود آگہی اور خود تربیتی نے پاشی کو اردو شاعری کے منظرنامے پر ایک منفرد شاعر بنا دیا تھا۔

کمار پاشی ایک ہمہ جہت تخلیقی شخصیت کا نام تھا، اس نے شاعری کے ساتھ نثر پر بھی توجہ دی اور شاعری کی طرح نثر میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ اس کے افسانوں اور

ڈراموں کے مجموعے "پہلے آسمان کا زوال" اور "جملوں کی بنیاد" ان کی نثری کاوشیں ہیں۔ کمار پاشی کی نثری کاوشوں نے یقیناً اہلِ نظر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی لیکن اردو دنیا میں کمار پاشی کی نظمیں ہی اس کی پہچان ہیں۔ کمار پاشی نے صرف ۵۷ سال کی عمر پائی اور ۱۷ر ستمبر ۱۹۹۲ء کو اس کا انتقال ہوا۔ اس طرح اس کی شاعری کی عمر زیادہ طویل نہیں ہے، لیکن اس مدت میں کمار پاشی نے اردو دنیا کو "پرانے موسموں کی آواز"، "خواب تماشا"، "ولاس یاترا"، "انتظار کی رات"، "روبرو"، ایک موسم مرے دل کے اندر، اک موسم مرے باہر" اور "زوال شب کا منظر" جیسے شعری مجموعے دیے، جن کی اشاعت کے ساتھ ہی ہم عصر اردو شاعری کے منظر نامے میں ایسے رنگ کا اضافہ ہوا جو دوسرے رنگوں سے مختلف ہی نہیں منفرد بھی تھا۔

نمونۂ کلام:

سات جزیروں والی عورت

نویں نکور بدن والی وہ اُجلی عورت
سات جزیروں پر قابض تھی

رات اُس کی زلفوں پر
سر رکھ کر سوتی تھی
سورج اس کی پلکوں کے در کھول کے
چپکے چپکے سے
باہر آتا تھا
اور اس کی ساتوں سرسبز زمینوں پر
ہولے ہولے سے
دور دور تک
دھوپ کی چادر پھیلاتا تھا

پھول اس کی آواز کو سن کر کھِل جاتے تھے
جس جانب وہ چل دیتی تھی
اُسے اجالوں والے رستے مل جاتے تھے
اُس کے دریاؤں میں میری آنکھ کھلی تو
سات جزیروں پر وحشی بادل چھائے تھے
سات جزیروں والی پگلی!
کیا جانے، کس اندھی دنیا سے آئے تھے

اُس میں چڑھتے دن کا اُجالا
مجھ میں گہری رات نہاں تھی
چڑیا سی وہ بھولی بھالی
اُس میں اتنی سوچ کہاں تھی
اُس کے گوشت کو اوڑھے تھا میں،
وہ عریاں تھی
جی ہاں... سچ ہے
سات جزیروں والی عورت
میری ماں تھی۔

مٹھی کھول

چاروں طرف اندھیرا ہے
اور اُس کی مٹھی میں جگنو ہیں
میں کہتا ہوں:
مٹھی کھول

مٹھی کھول، اجالا ہوگا
سب بولے: وہ منظر دیکھنے والا ہوگا

وہ کہتا ہے:
مٹھی کھول
آسمان پر چاند
نہ کوئی ستارا ہے
چاروں طرف اندھیارا ہے

''لیکن میرے ہاتھ میں تو انگارا ہے''

لفظ نہیں بولتے

سنا یہی ہے
کہ لفظ اب بولتے نہیں ہیں
جو مجھ پہ اب تک گزر چکا ہے
گزر رہا ہے
وہ لفظ در لفظ مر رہا ہے
میں ہر طرف سے
مرے ہوؤں میں گھرا ہوا ہوں
کبھی کبھی میں
ڈرا ڈرا سا
سبھی کو چپ چاپ دیکھتا ہوں
کبھی کبھی سر اُٹھا کے مُردے

اداس آنکھوں سے
دیکھتے ہیں:
میں موت کی وادیوں میں جیسے اُتر گیا ہوں
کہ جیسے میں آج مر گیا ہوں

ٹھہرو! میں آتا ہوں

اگر میرے فسانے میں مسرت کا کوئی پہلو نظر آئے
سمجھ لینا
تمھارے واسطے میں رات کے گنجان جنگل سے
چمکتے جگنوؤں کی قیمتی سوغات لایا ہوں
مرے اندر اندھیرے کا سمندر ہے
اُبھرتا ڈوبتا رہتا ہوں میں جس میں
تمھیں معلوم ہے: میرا عمل اب ختم ہے، اور رات باقی ہے
ابھی اک گھات باقی ہے
مرے آکاش کی حد میں ابھی سورج نہیں پہنچا
گھنی تاریکیوں میں چھٹ پٹاتا ہوں
میں اپنے جسم کے دیوار و در سے سر کو ٹکراتا ہوں
پل میں ٹوٹ جاتا ہوں

نہ گھبراؤ کہ پھر سے خود کو یکجا کر رہا ہوں میں
نسوں میں اپنی پھر تازہ لہو کو بھر رہا ہوں میں
تمھارے واسطے میں رات کے گنجان جنگل سے
چمکتے جگنوؤں کی قیمتی سوغات لاتا ہوں
ذرا ٹھہرو! میں آتا ہوں

غزل

کچھ کچھ ہم بھی سمجھ چکے ہیں لوگوں کے سمجھانے پر
صحرا میں بھی پھول کھلیں گے پر اُن کے آجانے پر

اب کے بھی جھلسے گی بستی اب کے بھی ترسیں گے لوگ
اب کے بھی ساون برسے گا دور کسی ویرانے پر

خوف ہے اس کو کہیں نہ اس کے دیوار و در ہل جائیں
شاہ کے گھر میں واویلا ہے میرے چپ ہو جانے پر

ہر پل سوچتا رہتا ہے وہ میرے زیاں کے بارے میں
ہر پل وہ تیار ہے میرے گھر کی آگ بجھانے پر

کرتا ہے اعلان وہ ہر جا، اپنی شفقت کا پاشی
جڑوں میں میری لیکن پانی دیتا ہے مرجھانے پر

○

غفلت زدوں کے شہر میں ہشیار کون ہے
جب میں ہی سو رہا ہوں تو بیدار کون ہے

خود بڑھ کے روک دیتا ہے وہ راستہ مرا
پھر پوچھتا ہے: راہ کی دیوار کون ہے

مجھ سا یہ ہو بہو مرے اندر چھپا ہوا
ناراض سب سے، خود سے یہ بیزار کون ہے

نیکی کرو کنویں میں گرا دو خلوص کو
اس جنسِ رائگاں کا خریدار کون ہے

کس نے دیے جلائے ہیں پاشی مرے لیے
مجھ کو بلا رہا ہے جو اس پار کون ہے

○

گھر کے اندر جگہ جگہ منظر وہ سنہرا رکھ دے گا
لیکن گھر کے باہر سنگینوں کا پہرا رکھ دے گا

اس کا زور کہ ساری عمر نہ خود کو میں پہچان سکوں
وہ میرے آئینے میں کسی اور کا چہرا رکھ دے گا

میری بصارت چھینے گا وہ تاریکی پھیلا دے گا
پھر میری خدمت پر کوئی ملازم بہرا رکھ دے گا

جب میری مایوسی مجھ کو اکسائے گی بغاوت پر
تب وہ میری آنکھوں میں اک خواب سنہرا رکھ دے گا

جب جب بھی میں قدم بڑھاؤں گا ہاشمی منزل کی طرف
وہ میرے رستے میں کوئی سمندر گہرا رکھ دے گا

□□

کمال احمد صدیقی

کمال احمد صدیقی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ایک زمانے میں شاعری ہی ان کی پہچان تھی اور وہ اردو دنیا میں ایک معتبر شاعر کے طور پر ہی جانے پہچانے جاتے تھے لیکن تین دہے قبل جب انھوں نے اشہبِ قلم کا رُخ عروض، تحقیق وتنقید اور تاریخ کے میدانوں کی طرف موڑ کر باگیں کھینچ لیں اور '' تاریخِ ہند: ازمنۂ وسطیٰ'' (۱۹۷۰ء)، '' بیاضِ غالب: تحقیقی جائزہ'' (۱۹۷۱ء)، '' عروض ومعروض'' (۱۹۸۸ء)، '' آہنگ اور عروض'' (۱۹۸۹ء) اور '' اردو: ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل وابلاغ کی زبان'' (۱۹۹۸ء) جیسی علمی وادبی کتابیں سپردِ قلم کیں تو ان کی شاعری پسِ منظر میں چلی گئی اور اردو دنیا انھیں ایک نثر نگار، محقق ونقاد اور ماہرِ عروض کے طور پر جاننے اور پہچاننے لگی لیکن ادبی رسائل و جرائد میں کمال احمد صدیقی کی گاہے بگاہے چھپنے والی غزلیں اور نظمیں اس امر کی غماز ہیں کہ ان کے تخلیقی سوتے آج بھی رواں ہیں۔

کمال احمد صدیقی ۱۷ر فروری ۱۹۲۶ء کو لکھنؤ کے ایک معزز اور علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ محترم ڈاکٹر محمد احمد صدیقی گرچہ خود شاعر نہیں تھے لیکن شاعر نواز تھے اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان کے دو چھوٹے بھائی عالی لکھنوی اور بشیر لکھنوی شاعر تھے۔ گھر کے بزرگوں کے پاس شعراء کی آمد و رفت اور

آ ئے دن کی شعری محفلوں نے کمال احمد صدیقی کے ذہن پر شاعرانہ اثرات مرتب کیے اور اوائلِ عمر میں شعر ڈھلنے لگے۔ رہی سہی کسر اسکول میں پوری ہوگئی جہاں بیت بازی کے مقابلوں کے لیے نہ صرف اشعار یاد کرائے جاتے تھے بلکہ ان کی تقطیع کرنی بھی سکھائی جاتی تھی۔

کمال احمد صدیقی نے شاعری کے ابتدائی دور میں اپنے دونوں چچاؤں سے مشورۂ سخن کیا بعد میں ان بزرگوں کی ایماء پر حضرت سراؔج لکھنوی کا تلمذ اختیار کیا۔ جناب سراؔج لکھنوی گر چہ استاد تھے، غزلوں پر اصلاح کرتے اور کمال احمد صدیقی کو شعری نکات سمجھاتے تھے لیکن ان کی ذہنی تربیت صحیح معنوں میں اپنے وقت کے مشہور کہانی کار سیّد رفیق حسین مرحوم نے کی جو اردو، فارسی اور انگریزی کے شعری ادب پر گہری نظر رکھتے تھے اور کمال احمد صدیقی کے ماموں تھے۔ سید رفیق حسین مرحوم خود شاعر نہیں تھے لیکن صائب شعری مشورے دینے میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔

کمال احمد صدیقی نے اتر پردیش کے محکمۂ خوراک کی انسپکٹری سے عملی زندگی کا آغاز کیا اور مختلف سرکاری محکموں سے ہوتے ہوئے ۱۹۴۹ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے جہاں سے وہ ۱۹۸۵ء میں ڈپٹی چیف پروڈیوسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور آج کل تصنیف و تالیف کے ساتھ جز وقتی درس و تدریس کے مشغلے سے وابستہ ہیں۔

کمال احمد صدیقی کی پانچ چھ نثری کتابوں کے، چار شعری مجموعے ''بادبان'' آزاد نظموں کا مجموعہ مطبوعہ ۱۹۴۸ء، ''جواہرات'' ۱۹۶۵ء، ''کوہسار گاتے ہیں'' ۱۹۶۵ء اور ''انتخابِ کلام: انجمن ترقی اردو ہند'' منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

حقیقتوں کا عکس ایک خواب زاد ہی نہ ہو
یہ آئینہ بھی زندگی کا راز دار ہی نہ ہو

مری وہ اک نگاہ کوئی شاہکار ہی نہ ہو
کسی حسین زندگی کا اعتبار ہی نہ ہو

فضاؤں کا سکوت، خشک پتّیوں کے ساز پر
کسی اُداس لے میں نغمۂ بہار ہی نہ ہو

شفق! عروسِ شام کے لبوں کا آتشیں خیال
کسی سنہرے آفتاب کا مزار ہی نہ ہو

وہ اک نظر جو تیری سمت اُٹھ گئی کبھی کبھی
ہماری کم نگاہیوں کی پردہ دار ہی نہ ہو

پھوار کے حسین رقص میں نہ آئے زندگی
اگر یہ پتّیوں پہ ہلکا سا غبار ہی نہ ہو

سکوں، ہماری قوتوں کی برہمی سے کانپ اٹھا
سکوں! ہماری قوتوں کا انتشار ہی نہ ہو

خود اپنی تلخیوں میں زندگی بھی کھو کے رہ گئی
حقیقتوں سے کھیلنا بھی اک فرار ہی نہ ہو

سرود و رقص اور جام کا جہاں، کمال کا جہاں
بہشت بھی تخیّلِ گناہ گار ہی نہ ہو!

○

باتیں جو تھیں دوست پرانے نصاب میں
اُن میں سے ایک بھی تو نہیں ہے کتاب میں

ہر بات جو غلط تھی پرانے نصاب میں
چن کے اس کو رکھا گیا ہے کتاب میں
ساقی نے پوچھا کون ہے شراب میں
میں ہوش میں تھا، جام اٹھایا جواب میں
جو روبرو کہا۔نہ گیا اضطراب میں
کہہ دوں گا، آپ یاد کریں گے جو خواب میں
کل رات ڈھل رہا تھا مرا دل شراب میں
جبریل ساغر لائے تھے میری جناب میں
ہوش و حواس ہی تو ہیں جوہر حیات کا
آتا ہے ہوش، ذہن جو ڈوبے شراب میں
ماضی کے واقعات نظر آئے سامنے
آئینہ میرے ہاتھ میں تھا، میں تھا خواب میں
چاہو تو میرے جام میں اس کو نچوڑ دو
دامن تمھارا بھیگ گیا ہے شراب میں
جو کل حقیقتیں تھیں، حکایات بن گئیں
ہوتے رہیں گے روز اضافے کتاب میں
یہ ذہن ہے کہ کارگہِ آئینہ گراں
یہ ساری کائنات ہے اک لمحہ خواب میں
پانی کی طرح اہلِ ہوس نے شراب پی
لکھی گئی ہے تشنہ لبوں کے حساب میں
وہ رات بھی تھی کتنی حسیں رات اے کمالؔ
وہ رات جو کٹی ہے سوال و جواب میں

○

ہر اک قدم پہ ٹھوکروں کا حوصلا بھی چاہیے
مسرّتوں کو تلخیوں کا آئینا بھی چاہیے

خلاؤں میں بھٹک کے کون پا سکا ہے زندگی
خودی کی پرورش کے واسطے فضا بھی چاہیے
ابھی خودی تو کمتری کا کاسۂ گدائی ہے
فریبِ ذوقِ آرزو کی انتہا بھی چاہیے
کھنک رہی ہیں ساغروں میں مضطرب حقیقتیں
حقیقتوں کی دلکشی کا تجزیا بھی چاہیے
خیال آفرینیوں کا نام تو نہیں حیات
تسلّیوں کو خاک وخوں کا راستا بھی چاہیے
ابھی تھے لب پہ سرخوشی کے گیت اب یہ ہچکیاں
معاف کر! شکستِ ساز کو صدا بھی چاہیے
ہوں تنگ میکدہ! بہارِ میکدہ کو اے کمالؔ
مری ہی تشنگی کا لیکن آسرا بھی چاہیے

○

پہلے دل تھام لیجیے صاحب
پھر مرا نام لیجیے صاحب
مےِ گلفام لیجیے صاحب
جام پر جام لیجیے صاحب
یہ حسیں شام ہم نے کردی ہے
آپ کے نام ، لیجیے صاحب
چبھ نہ جائے کہیں بغل میں چھری
رام کا نام لیجیے صاحب
بے قراری سی بے قراری ہے
میرا دل تھام لیجیے صاحب

اس نے ہم کو بہت خراب کیا
دل کا مت نام لیجیے صاحب
عشق یا بے وفائی، اپنے سر
کچھ تو الزام لیجیے صاحب
بے وفا پر کمالؔ مرتے ہیں
عقل سے کام لیجیے صاحب

○

وہ کُم شراب میں کیوں آئے، ہم کو کیا معلوم
ہم احتساب میں کیوں آئے، ہم کو کیا معلوم
لکھا تھا ہم نے کہ چہرا تمھارا بھول گئے
وہ خود جواب میں کیوں آئے، ہم کو کیا معلوم
انھیں پسند نہیں ہے، ہماری گستاخی
ہم اُن کے خواب میں کیوں آئے، ہم کو کیا معلوم
وہ سانحے جو تصور میں ہم پہ گزرے تھے
تری کتاب میں کیوں آئے، ہم کو کیا معلوم
جنھیں تھا زعم بہت اپنی پارسائی کا
وہ سو حجاب میں کیوں آئے، ہم کو کیا معلوم
وہ تشنہ لب، کہ جنھیں تشنگی کا عرفاں تھا
وہی سراب میں کیوں آئے، ہم کو کیا معلوم
یہ پوچھنا ہے تو پوچھو نگاہِ قاتل سے
ہم انتخاب میں کیوں آئے، ہم کو کیا معلوم
کمالؔ اور بھی شاعر تھے رات محفل میں
تمھیں عتاب میں کیوں آئے، ہم کو کیا معلوم

○

سجدۂ شیخ پہ لغزش کا گماں ہوتا ہے
میری مستی پہ پرستش کا گماں ہوتا ہے
ہم نشیں تجھ سے وہ صدمات اٹھائے ہیں، کہ اب
مہربانی پہ بھی سازش کا گماں ہوتا ہے
وقت و ماحول کا، حالات کا خمیازہ ہے
جس پہ ساقی کی نوازش کا گماں ہوتا ہے
پسِ چلمن ہیں، تو چلمن کو اٹھا ہی دیجیے
اس تکلف پہ نمائش کا گماں ہوتا ہے
بات کیا ہے کہ ترے خط کے ہر اک جملے پر
اپنے اندازِ نگارش کا گماں ہوتا ہے
ان کے چہرے کی ضیا ہے کہ مرے دل کی چمک
کچھ تو ہے جس پہ یہ تابش کا گماں ہوتا ہے
گردشِ چشم نہیں، گردشِ دوراں ہے کمالؔ
جس پہ پیمانوں کی گردش کا گماں ہوتا ہے

○

اس کی ایک اک بات کا ہم نے کیسا کیسا پاس کیا
جسم کو اس نے لباس کہا تو ہم نے ترکِ لباس کیا
اس کو دیکھ کے میں چپ تھا، اس نے سمجھا سکتہ ہے
آئینے پر آنسو چھڑکے، جانے کیا احساس کیا
جو پتھر بھی میرے سر پہ لگا، وہ آخر موم ہوا
جس پر اس کا دل آیا اس پتھر کو الماس کیا
منصف ایک قطار میں شرمندہ شرمندہ بیٹھے تھے
سناٹا تھا جب سرمد نے عدالت میں اجلاس کیا

نکہتِ گل میں اس کے بدن کی خوشبو بادِ صبا لائی
اس کی یاد نے دل کو مسوسا، جی کو بہت ہی اداس کیا
لال ہوئی انساں کے لہو سے ایودھیا کی ساری دھرتی
رام کو چودہ سال نہیں، جیون بھر کو بن باس کیا
ہم کو دیکھ کے اس کے ہونٹوں پر آئی تھی اک مسکان
ہم کو گماں ہوئے ہیں کیا کیا، کیا کیا ہم نے قیاس کیا
ایک حسیں کو کہتے سنا، وہ کتنا خودسر شاعر تھا
ہم نے کماؔل کو سدھ کیا ہے، ہم نے کماؔل کو داس کیا

خواب خریدوں کس سے

میں نے خوابوں میں سکوں چاہا تھا ،
اور خوابوں کو حقیقت سے نچوڑا ہے
جیسے انگور سے مے پیرِ مغاں کھینچتا ہے

میں اِنھیں خوابوں میں سرشار رہا
اور چاہا کہ مرے خواب حقیقت ہو جائیں
کوئی انسان پریشان نہ رہے
اور دنیا میں کوئی غم نہ رہے!
میں نے خوابوں کو حقیقت کا بدل کب جانا
میں نے خوابوں سے حقیقت کو بدلنا چاہا
خواب ٹکرائے حقیقت سے، دھماکا بھی ہوا
خواب تو ٹوٹ گئے اور حقیقت ہے وہی
ہر طرف خوابوں کے ٹوٹے ہوئے آئینے ہیں

اور کچھ لوگ یہ آئینے دکھاتے ہیں مجھے!
جو یہ آئینے دکھاتے ہیں مجھے
وہ مرے خوابوں کے دلاّل ہیں، سوداگر ہیں!
سادگی ہے کہ یہ عیاّری ہے
اور شاید مری مجبوری ہے
کہ مرے خوابوں کے دلاّلوں نے
اپنے بازار میں پکڑا ہے مجھے
جس طرف جاؤں، مرے خواب ہیں شوکیسوں میں
اور جب غور سے دیکھوں تو پتہ چلتا ہے
یہ مرے خواب نہیں
یہ مرے خوابوں کے وہ چہرے ہیں
جن میں خوابوں کا ہر اک رنگ تو ہے، روح نہیں

کتنا مجبور ہوں میں
زندگی ایسی اجیرن ہے کہ خوابوں کے بغیر
ایک لمحہ بھی گزاروں تو قیامت گزرے
خواب درکار ہیں، میں خواب خریدوں کس سے؟
نقلی خوابوں ہی کے دلاّل مجھے گھیرے ہیں!!

آفاق

اُفق سے تا بہ اُفق ـــــ
(افق کہ جو مری نظروں کی سرحدوں میں ہیں
افق، جو آج بھی اوجھل مری نگاہ سے ہیں)

اُفق سے تا بہ اُفق زندگی دھڑکتی ہے!

زمیں سے تا بہ فلک ـــــ
(فلک کہ جن کے ستارے مری نگاہ میں ہیں
فلک کہ میری بصارت سے بھی پرے جو ہیں!
فلک کہ ایک حقیقت ہیں، پھر بھی جن کا وجود
مری نظر میں نہیں ہے، مرے شعور میں ہے!
فلک، کہ جن کے ستاروں کی روشنی میں نے
نظر سے دیکھی نہیں، پھر بھی جانتا ہوں میں
کہ ان میں کاہکشائیں مدام رقص میں ہیں
میں اُن کے رقص کے انداز سے نہیں واقف
مگر سُنی ہے وہ آواز میرے آلوں نے
جو ان کی برق کی پازیب سے نکلتی ہے)
زمیں سے تا بہ فلک، اور فلک سے تا بہ زمیں
نہیں ہے کوئی بھی شے جو نہ ہو مرا موضوع!
حقیقتیں، کہ جو پہلے مری نگاہ میں تھیں
حقیقتیں کہ جو کل اور آئینہ ہوں گی
حقیقتیں، کہ جو القا کریں گی رازِ حیات
حقیقتیں کہ جو آج بھی ہیں پُر اسرار
کچھ آشکار ہوئی ہیں، کچھ اور بھی ہوں گی!

مری نگاہ ازل سے بھٹک رہی ہے، مگر
میں جانتا ہوں کہ آوارگیِ قلب ونظر
کوئی فریب نہیں ہے، کوئی فرار نہیں!

اُس ایک بات کی مجھ کو تلاش ہے، جس سے
ہر ایک راز زماں و مکاں کا کھل جائے
یہ آشکار ہو مجھ پر کہ کائنات ہے کیا؟
یہ آشکار ہو مجھ پر کہ کائنات ہے کیوں؟
حقیقتیں کہ جو بکھری ہوئی ہیں ہر جانب
ہیں جزو ایک حقیقت کا، اور وہ کیا ہے؟
ازل سے اس کا تعلق ہے کیا، ابد کیا ہے؟
ازل بھی کوئی حقیقت ہے یا کہ واہمہ ہے
ابد بھی کوئی حقیقت ہے یا کہ واہمہ ہے
یہ بات بھی مجھے اب تک نہ ہو سکی معلوم
ابد ازل ہی کا پرتو ہے، یا کہ خود بھی ہے
مکاں کے بعد کوئی لامکاں بھی ہے کہ نہیں
زماں، مکاں میں تعلق اگر ہے۔ وہ کیا ہے؟
یہ باتیں راز ہیں۔ یہ راز فاش ہونا ہیں
یہ راز! جب بھی کھلیں، آج یہ حقیقت ہے
حیاتِ نو کے تقاضے بُلا رہے ہیں مجھے
حیاتِ نو! کہ ہے جس کی تلاش مجھ کو بھی،
حیاتِ نو! کہ جو خود بھی مری تلاش میں ہے!!

□□

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ ۹؍مارچ ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ وہ گورونانک دیوجی کے خاندان کے براہِ راست سترہویں پشت میں سے تھے۔ ان کے خاندان کو مذہبی تقدس ہی نہیں دنیاوی امتیاز بھی حاصل تھا۔ اور غیر منقسم پنجاب کا ایک بڑا زمیندار گھرانہ تھا۔ مذہبی تقدس کی وجہ سے عوام میں مقبولیت، عزت وتوقیر اور تمول اس خاندان کی میراث تھا۔ اس وقت کے انگریز حکمراں صوبے میں آرام سے حکومت چلانے کے لیے اس خاندان کا تعاون حاصل کرنا عینِ سعادت سمجھتے تھے۔

اُس وقت تک ان کے بزرگ انگریز حکام کو صرف خاموش آشیرواد دیا کرتے تھے لیکن کنور مہندر سنگھ بیدی نے صوبائی ملازمت اختیار کر کے اُس آشیرواد کو عملی تعاون کا روپ دے دیا اور انگریزوں کے دورِ اقتدار میں ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی حیثیت سے اور آزادیِ وطن کے بعد بھی حکومت کے معاون و دستِ راست رہے اور کاروبارِ مملکت چلانے میں حکامِ وقت کی مدد کی اور اپنے حسنِ تدبر اور انتظامی صلاحیتوں سے عوام کے دل جیتے۔

تقسیمِ ملک کے نتیجے میں جب دہلی بری طرح متاثر ہوئی، یہاں کا امن واماں درہم برہم ہوگیا، فرقہ وارانہ ہنگاموں نے یہاں کی فضا کو نفرت، بدگمانی کے غبار سے بھر دیا تو

شہر کا امن و امان بحال کرنے اور شہریوں میں باہمی اعتماد و یگانگت کا ماحول پیدا کرنے کے لیے یہاں کے مسلمانوں کے مطالبے پر وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کنور مہندر سنگھ بیدی کو خصوصی طور پر دہلی میں متعین کیا اور حالات کو سنبھالنے کی ذمہ داری ان کو سپرد کی۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں اگر کنور مہندر سنگھ بیدی جیسا انسان دوست افسر دہلی میں متعین نہ کیا جاتا تو شاید دہلی مسلمانوں کے وجود سے یکسر خالی ہو جاتی اور شہر میر و غالب میں اردو کا کوئی نام لیوا نہ ہوتا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی اس کسوٹی پر پورے اترے۔ انھوں نے سٹی مجسٹریٹ کے طور پر نہ صرف فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے فضا بنائی بلکہ یہاں کے پا بہ رکاب مسلمانوں کو ڈھارس دی۔ ان کا حوصلہ بڑھایا اور اردو کی شمع جلا کر ان میں اعتماد پیدا کیا۔ یہ اُن کے حسنِ تدبر اور کوششوں کے ساتھ یہ اُن کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ دہلی کی سماجی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی زندگی اپنے مدار پر لوٹ آئی۔

وہ اگر اعلیٰ سیاسی اور سرکاری حلقوں میں اپنی انتظامی صلاحیتوں اور طریقۂ کار کی وجہ سے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے تو وہ دہلی کے عوام میں اپنی شخصیت، وسیع النظری اور مختلف اور متضاد قسم کے رئیسانہ مشاغل کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔ پہلوانی، مُرغ بازی، تیتر بازی، پتنگ بازی اور بٹیر بازی ان کے ایسے دوسرے شوق تھے جن کی وجہ سے وہ عوام سے جُڑے ہوئے تھے اور ان کھیلوں کے استادوں کے لیے ان کے گھر اور دفتر کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ لیکن اردو شعر و ادب ان کا پہلا اور آخری شوق تھا، ایک ایسا شوق جس نے اُن کو وہ عزت و شہرت دی جس کا عشرِ عشیر بھی مستقبل میں شاید ہی کسی کو مل پائے۔

ان کی شخصیت مشاعروں اور اردو کے نیم سرکاری و سرکاری اداروں کے لیے لازم و ملزوم تھی۔ وہ ایک طویل عرصہ تک آل انڈیا ریڈیو اینڈ ٹی۔ وی کی اردو ایڈوائزری کمیٹی کے فعال ممبر اور اردو ترقی بورڈ آف انڈیا کے وائس چیئر مین رہے۔ اردو اکادمی، دہلی کے قیام سے لے کر تا دمِ مرگ وہ ممبر اور وائس چیئر مین کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کے علاوہ غالب اکیڈمی، غالب انسٹی ٹیوٹ جیسے اداروں نے اُن کی خدمات سے کافی فیض اٹھایا۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے تقریباً پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور تقریباً ستر سال تک اردو کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''طلوعِ سحر'' (۱۹۶۰ء) کے آس پاس منظرِ عام پر آیا اور جلد ہی نایاب ہوگیا۔ ''یادوں کا جشن'' ان کی دلچسپ نثری آپ بیتی ہے جسے جشنِ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کمیٹی نے ۱۹۸۶ء میں نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ ''کلیاتِ سحر'' جس میں ان کا تمام شعری سرمایہ محفوظ کردیا گیا ان کی حیات ہی میں جناب کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی نے مرتب کرکے ۱۹۹۲ء میں شائع کیا۔

اردو کے اس بے لوث خادم کا انتقال ۱۷ر جولائی ۱۹۹۲ء کو دہلی میں ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

ابھی وہ کمسن اُبھر رہا ہے ابھی ہے اُس پر شباب آدھا
ابھی جگر میں خلش ہے آدھی، ابھی ہے مجھ پر عتاب آدھا
حجاب و جلوہ کی کشمکش میں اٹھایا اُس نے نقاب آدھا
ادھر ہویدا سحاب آدھا، اُدھر عیاں ماہتاب آدھا
مرے سوالِ وصال پر تم نظر جھکا کر کھڑے ہوئے ہو
تمھیں بتاؤ یہ بات کیا ہے سوال پورا جواب آدھا
لپک کے مجھ کو گلے لگایا، خدا کی رحمت نے روزِ محشر
ابھی سنایا تھا محتسب نے، مرے گنہ کا حساب آدھا
بجا کہ اب بال تو سیہ ہیں مگر بدن میں سکت نہیں ہے
شباب لایا خضاب لیکن خضاب لایا شباب آدھا
لگا کے لاسے یہ لے تو آیا ہوں شیخ صاحب کو میکدے تک
اگر یہ دو گھونٹ آج پی لیں ملے گا مجھ کو ثواب آدھا
کبھی ستم ہے کبھی کرم ہے، کبھی توجہ، کبھی تغافل
یہ صاف ظاہر ہے مجھ پہ اب تک ہوا ہوں میں کامیاب آدھا

کسی کی چشمِ سرور آور سے اشک عارض پہ ڈھل رہا ہے
اگر شعورِ نظر ہے دیکھو شراب آدھی گلاب آدھا

پرانے وقتوں کے لوگ خوش ہیں مگر ترقی پسند خاموش
تری غزل نے کیا ہے برپا سحر ابھی انقلاب آدھا

○

ذرا ذرا سی آن میں وہ جانِ جاں بدل گیا
کبھی تو بات کاٹ دی کبھی زباں بدل گیا

ہمیں تو یہ گلہ نہیں کہ جانِ جاں بدل گیا
گلہ یہ ہے کہ وہ بحقِ دیگراں بدل گیا

بہار تو بہار تھی خزاں بھی اب بہار ہے
نظامِ گلستاں مزاج باغباں بدل گیا

بجا کہ ہے تغیرِ چمن سے زینتِ چمن
مگر یہ کیا کہ گلستاں کا گلستاں بدل گیا

فغان و ضبط آہ میں یہی ہے فرق اور کیا
کہ آگ تو لگی رہی مگر دھواں بدل گیا

رہِ حیات سے ہزاروں راستے نکل گئے
کسے یہ اب خیال ہے کوئی کہاں بدل گیا

تری نگاہ تھی تو اک جہان سازگار تھا
تری نگاہ پھر گئی تو اک جہاں بدل گیا

وہی فریبِ دشمناں ہے اس کا غم نہیں ہمیں
ہمیں تو غم یہ ہے خلوصِ دوستاں بدل گیا

جنوں نے سونپ دی خرد کے ہاتھ رسمِ رہبری
لو اہلِ کارواں امیرِ کارواں بدل گیا

وجود سے عدم کو یوں چلا گیا ہے اک غریب
کرایہ دار جس طرح کوئی ، مکاں بدل گیا
حرم سے جو خلوص تھا، ہے دیر سے وہی خلوص
جبیں وہی ہے کیا ہوا جو آستاں بدل گیا

○

مرے سر پر اجل منڈلا گئی کیا تم نہ آؤ گے
نہ آنا تھا جسے وہ آ گئی، کیا تم نہ آؤ گے
غمِ فرقت نے اس انداز سے آواز دی مجھ کو
اجل بھی دیکھ کر شرما گئی ، کیا تم نہ آؤ گے
ہجومِ یاس ، طوفانِ الم، سیلابِ ناکامی
قیامت پر قیامت آ گئی، کیا تم نہ آؤ گے
لبِ جو، موسمِ گل، بادۂ و جام و سبو سب ہیں
وہ کالی گھٹا بھی آ گئی، کیا تم نہ آؤ گے
تبسّم سے گلوں تک کو مسرت بخش دی تم نے
مرے دل کی کلی مرجھا گئی ، کیا تم نہ آؤ گے
بہ قدرِ ضبط جس میں داستانِ دردِ پنہاں تھی
ہچکی بھی بالآخر آ گئی، کیا تم نہ آؤ گے
تمھاری یاد میں دریا بہائے عمر بھر جس نے
چشمِ شوق اب پتھرا گئی کیا تم نہ آؤ گے
فریبِ وعدۂ فردا کی جس سے شان قائم تھی
وہی صبحِ قیامت آ گئی ، کیا تم نہ آؤ گے
سحر واقف ہے لطفِ انتظارِ دید سے بیشک
طبیعت اب مگر گھبرا گئی ، کیا تم نہ آؤ گے

○

بُرا ہوگیا یا بھلا ہوگیا
محبت میں جو کچھ ہوا ہوگیا
محبت کا اعجاز ہے اور کیا
کہ جس بُت کو چاہا خدا ہوگیا
محبت کریں بھی تو کس سے کریں
زمانہ بڑا بے وفا ہوگیا
کبھی میل ہم سے عدو سے کبھی
جو تم نے کیا وہ روا ہوگیا
وہ رندِ خرابات اپنا سحر
سنا ہے کہ اب پارسا ہوگیا

○

مرے پہلو سے اٹھے غیر کے پہلو میں جا بیٹھے
جو تم اٹھے تو کیا اٹھے جو تم بیٹھے تو کیا بیٹھے
تری محفل میں گر ساقی کوئی بھولے سے آ بیٹھے
بہ شکلِ رند اٹھے گو بہ شکلِ پارسا بیٹھے
اچانک گر مری آنکھوں سے تم آنکھیں ملا بیٹھے
میں یہ سمجھا کہ بے ساغر مجھے تم مے پلا بیٹھے
تہی دستانِ قسمت کا بھی اُٹھنا بیٹھنا کیا ہے
ترے کوچے سے اُٹھے تھے ترے کوچے میں آ بیٹھے
جہانِ رنگ و بو میں تھا فقط اک دل ہی دل اپنا
یہی لے دے کے پونجی تھی اسے بھی ہم لٹا بیٹھے

○

سب میں رہتے ہو مگر سب سے جدا لگتے ہو
اور بُت ہوں گے مگر تم تو خدا لگتے ہو

تم جب آتے ہو تو آرام بھی آ جاتا ہے
درد بھی تم ہو مگر تم ہی دوا لگتے ہو

جانِ دل، جانِ نظر، جانِ تمنا تم ہو
دل سے نکلی کسی عاشق کی دُعا لگتے ہو

حسنِ نظّارہ طلب اور حیا ضبط طلب
کسی خاموش سوالی کی صدا لگتے ہو

جان و ایمانِ سحرؔ تم ہو خدا شاہد ہے
کیا کہوں اس کے سوا اور کہ کیا لگتے ہو

کنولؔ جی۔آر

(ڈاکٹر) گلشن رائے جو دہلی کی شعری و ادبی محفلوں میں جی۔آر۔کنولؔ کے نام سے مشہور ہیں ۱۹ر نومبر ۱۹۳۵ء کو لاہور کے ایک تعلیم یافتہ اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اردو ماحول میں چوں کہ آنکھ کھولی تھی اور ابتدائی تعلیم پائی تھی اس لیے ان کو اردو سے مَس تھا، چنانچہ تعلیمی میدان میں اردو کو ہم رکاب رکھا، اردو میں آنرز کرنے کے بعد انگریزی زبان وادب میں ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگریاں لیں۔

جی۔آر۔کنولؔ زندگی بھر درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہے اور اسکول کے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد آج وہ پہلے سے بھی فعّال اور متحرک ہیں۔ متعدد اسکولوں اور تعلیمی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ ایک انگریزی ماہنامے The Compus World کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کل وقتی تعلیمی اور صحافتی ذمہ داریوں کے باوجود کنولؔ شعری وادبی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ وہ ''حلقۂ تشنگانِ ادب'' کے نائب صدر ہیں۔ ''حلقۂ تشنگانِ ادب'' ایک تیس چالیس سالہ پرانی ادبی تنظیم ہے جس کی ماہانہ شعری نشستیں نئی دہلی کی دور دراز پھیلی ہوئی کالونیوں میں باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ کنول اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ باڈی کے ممبر رہ چکے ہیں۔

کنولؔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔ صرف استاد رساؔ دہلوی کی صحبتیں اٹھائی ہیں اور ان سے شاعری کے رموز سیکھے ہیں۔ ''شیشہ ٹوٹ جائے گا'' شعری مجموعہ کا نام ہے جسے دہلی اردو اکادمی، دہلی نے انعام سے نوازا تھا۔

نمونۂ کلام:

غزل

دل و دماغ میں ڈھلتے رہے سوال بہت
غضب کی آگ تھی جلتے رہے سوال بہت

جواب ملنے کی صورت نہ تھی کوئی لیکن
ہر ایک لب سے نکلتے رہے سوال بہت

نگاہِ حسن سے آیا نہ جب جواب کوئی
نگاہِ عشق میں پلتے رہے سوال بہت

وہ جس کے پاس ذخیرہ تھا سب جوابوں کا
اُسی کی بزم میں ٹلتے رہے سوال بہت

خدا نے بخشی تھی مجھ کو کمال کی گرمی
مرے لہو میں پگھلتے رہے سوال بہت

سفر تمام ہوا رُک گئے قدم پھر بھی
رہِ حیات میں چلتے رہے سوال بہت

اگرچہ مل گئی آخر کسی سمندر میں
ندی کے دل میں سلگتے رہے سوال بہت

اُسی کے دم سے کنولؔ زندگی میں رونق تھی
وہ جس کے دم سے مچلتے رہے سوال بہت

○

مرے نصیب میں تھی دوستو کتاب غلط
کہیں سوال غلط تھا کہیں جواب غلط

مرے حریف کو احساس اِس کا تھا شاید
ہوا تھا میرے مقابل وہ کامیاب غلط

مرے گناہ سے بڑھ کر سزا ملی مجھ کو
لکھا گیا تھا یقیناً مرا حساب غلط
قدم قدم پہ مجھے شرمسار ہونا پڑا!
کہیں گناہ غلط تھا کہیں ثواب غلط
عجیب سلسلہ تھا زندگی کی راتوں کا
کبھی تو نیند غلط تھی کبھی تھا خواب غلط
ہر ایک شخص نے دھوکہ مری نظر کو دیا
ہر ایک شخص تھا اوڑھے ہوئے نقاب غلط
میں اپنی تشنہ لبی کا علاج کیا کرتا
کہیں تو جام غلط تھا کہیں شراب غلط
مری نظر ہی کنولؔ روشنی سے ڈرتی تھی
نہ آفتاب غلط تھا نہ ماہتاب غلط

O

جہاں میں ہوں وہاں حالات کا منظر نہیں بدلا
وہی ہیں چاند تارے رات کا منظر نہیں بدلا
اُسی انداز سے گرتی ہے بجلی آشیانے پر
ہوا گستاخ ہے برسات کا منظر نہیں بدلا
اگر بدلا ہے کچھ کچھ جسم و جاں کا ظاہری رشتہ
وہی ہے روح میری ذات کا منظر نہیں بدلا
خوشی سے ناچتے ہیں دیر تک گبرو محبت کے
گلی کوچوں میں اِس بارات کا منظر نہیں بدلا
بہت بدلی ہے طرزِ زندگی انسان کی لیکن
غزل کے ساز پر جذبات کا منظر نہیں بدلا

نظر حیران ہے یہ دیکھ کر یاروں کی محفل میں
نیا ماحول ہے پر بات کا منظر نہیں بدلا
ہزاروں لوگ اب بھی ہاتھ پھیلاتے ہیں سڑکوں پر
ہمارے شہر میں خیرات کا منظر نہیں بدلا
کنولؔ اک مہرباں نے دی تھی جو مجھ کو محبت میں
کسی موسم میں اُس سوغات کا منظر نہیں بدلا

O

کیا خبر ہے چل رہی ہے اب کدھر تازہ ہوا
ایک مدت سے نہیں آئی اِدھر تازہ ہوا
میں کوئی دریا نہیں ، پربت نہیں ، گلشن نہیں
مانگتے ہیں مجھ سے کیوں دیوار و در تازہ ہوا
میرے ہاتھوں میں نہیں جب موسموں کا انتظام
میں کہاں سے دوں تجھے اے ہم سفر تازہ ہوا
بھر دیا ہے آدمی نے زہر جب ماحول میں
غیر ممکن ہے چلے شام و سحر تازہ ہوا
ایک عرصہ ہوگیا ہے منتظر ہے کارواں
دیکھیے کب لے کے آئے راہبر تازہ ہوا
ہے جو اس کے پاس اس سے مطمئن رہتی نہیں
مانگتی ہے زندگی کی رہگزر تازہ ہوا
گوش بر آواز ہوں میں ہر جگہ یہ سوچ کر
لانے والی ہے ابھی اس کی خبر تازہ ہوا
آتے آتے آ ہی جائے گی مگر اے دوستو!
بند کمروں پر کرے گی کیا اثر تازہ ہوا
ہے مرے سر میں بھی کچھ سودا کنولؔ ایسا کہ اب
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں بھی در بدر تازہ ہوا

○

نگاہِ دوست سوال و جواب مت کرنا
میں بے حساب ہوں مجھ سے حساب مت کرنا

مجھے خدا نے چھپایا ہے لاکھ پردوں میں
جو ہو سکے تو مجھے بے حجاب مت کرنا

نقاب پوشی میں یہ دل ہے اک دُلہن کی طرح
کسی جگہ بھی اِسے بے نقاب مت کرنا

میں زندگی کے سفر کا حسین آدم ہوں
مجھے سنبھال کے رکھنا خراب مت کرنا

مجھے سکون ملے گا تو صرف پانی سے
مری پیاس کو وقفِ شراب مت کرنا

میں خود سوال ہوں اپنے خموش ہونٹوں پر
سوال کر کے مجھے لاجواب مت کرنا

یہ زندگی ہے مکمل ہر ایک چیز کے ساتھ
کسی بھی شے کا یہاں انتخاب مت کرنا

جو کامیاب ہے وہ آرزو سے خالی ہے
ترے نثار مجھے کامیاب مت کرنا

بڑا مزا ہے کنولؔ روح کو جگانے میں
تم اپنی ذات کو اب محوِ خواب مت کرنا

□□

کنولؔ ڈی۔ راج

دیس راج شرما المتخلص بہ ڈی راج کنولؔ ۵/مارچ ۱۹۲۳ء کو کپورتھلہ (پنجاب) کے قصبہ سلطانپور لودھی میں پیدا ہوئے۔ اوائلِ عمری میں شعر و ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ تعلیمی زمانے کے دوران اس دلچسپی نے شوق کی شکل اختیار کی اور ۱۹۴۲ء کے آس پاس یہ شوق شعرگوئی میں تبدیل ہو گیا۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ سرکاری ملازم تھے۔ حکومتِ ہند کے محکمہ ڈیفینس اکاؤنٹس میں سیکشن آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ڈی راج کنولؔ "حلقہ تشنگانِ ادب" جیسی متحرک اور مقتدر ادبی تنظیم کے مستقل صدر ہیں جو پچھلے پینتیس سال سے دہلی کی دور دراز کالونیوں اور اردو زبان و تہذیب اور اس کی روایتوں سے ناآشنا بستیوں میں باقاعدگی سے ماہانہ شعری و ادبی نشستیں اور گاہے بگاہے مشاعرے منعقد کر کے اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

جسم تو ٹوٹ چکا پھر بھی انا ہے مجھ میں
مجھ کو لگتا ہے کہ کچھ میرے سوا ہے مجھ میں
کوئی گزرا تھا مجھے چھو کے گلوں کی صورت
آج تک پیار سے جینے کی ادا ہے مجھ میں
میری سانسوں میں مچلتے ہیں کسی کے نغمے
صرف کہنے کے لیے میری صدا ہے مجھ میں
دل لگانے کا یہی ایک نتیجہ نکلا
ایک محشر سا شب و روز بپا ہے مجھ میں
خود پہ کیا ناز کروں میری حقیقت یہ ہے
تن ہے مٹی کا یہ تھوڑی سی ہوا ہے مجھ میں
بیج بھی، پیڑ بھی، پتا بھی، ثمر بھی، میں ہوں
وقت کے ساتھ بدلتا ہوا کیا ہے مجھ میں
جھوٹ کو میں نے کبھی سچ نہیں مانا اب تک
اک یہی عیب کنولؔ سب سے بڑا ہے مجھ میں

○

ہم نے اشکوں سے خوشی کے پاؤں تو دھوئے بہت
اپنی نادانی پہ لیکن عمر بھر روئے بہت
ہم سے رخصت ہوگئی جب زندگی کی ہر خوشی
تان کر چادر غموں کی چین سے سوئے بہت
رام جانے کیوں برائی کا رہا کھٹکا مجھے
زندگی میں نیکیوں کے بیج تو بوئے بہت

بوجھ اپنا ہی وبالِ جان ہوکر رہ گیا
حسرتوں کے بوجھ یوں تو عمر بھر ڈھوئے بہت

اپنی ہمّت تھی کہ اُن سے بچ بچا کر آ گئے
ورنہ راہوں میں جہاں نے خار تو بوئے بہت

کارواں لے کر چلے تھے زندگی کا ساتھ میں
راستوں میں ہم نے لیکن ہم سفر کھوئے بہت

کر گئی حد سے تجاوز جب پشیمانی کبھی
رکھ کے سر دہلیز پر اُن کی کنولؔ روئے بہت

○

ایک دن ہنس کر بول اٹھی یوں میرے پاؤں تلے کی مٹّی
میں بھی اک دن تم جیسی تھی چنچل چلتی پھرتی مٹّی

یہ مدماتے، ہنستے چہرے، یہ چنچل کجراری آنکھیں
آنکھ مچولی کھیل رہی ہے کیا جانے کس کس کی مٹّی

ہنستے گاتے گیت خوشی کے، یہ ساغر یہ مے کے پیالے
ان کے پیچھے جھانک رہی ہے دیکھو رنگ برنگی مٹّی

آئے گا کس کام تکبّر چھوڑو یہ بیکار کی باتیں
مٹّی تو پھر مٹّی ٹھہری کیا کالی کیا گوری مٹّی

ناحق سن کر جھوم رہے ہو پیار محبت کے افسانے
ان پر جم کر رہ جائے گی اک دن اچھی خاصی مٹّی

دل پر ٹھیس لگانے والو، ٹوٹ گیا تو پچھتاؤ گے
آنسو بن کر بہہ جائے گی ان آنکھوں کی گیلی مٹّی

جب پت جھڑ کا ظالم گلچیں، پھول کنولؔ کا لے جائے گا
برسوں اُس کو یاد کرے گی، اِس گلشن کی سوندھی مٹّی

○

وقت کی موجوں سے ہر دم کھیلتا رہتا ہوں میں
زندگی کیا چیز ہے یہ سوچتا رہتا ہوں میں

لوٹ آتے ہیں پرندے چھو کے نیلا آسماں
اور اُڑنے کے لیے پر تولتا رہتا ہوں میں

زندگی کا ذکر آتا ہے تو پانی پر کہیں
انگلیوں سے کچھ لکیریں کھینچتا رہتا ہوں میں

یہ نہ پوچھو کیا ہوں میں، ہے اور کیا میری بساط
آئینہ ہوں روز بنتا ٹوٹتا رہتا ہوں میں

اس طرح کرتا ہوں خوشیوں میں اضافہ اور بھی
اپنی خوشیاں دوسروں میں بانٹتا رہتا ہوں میں

سوچتا ہوں اس لیے شاید نہیں منزل ملی
ہر کسی سے راہِ منزل پوچھتا رہتا ہوں میں

جب بھی چلتی ہے کبھی دُکھ درد کی آندھی کنولؔ
گیلے کپڑوں کی طرح بس سوکھتا رہتا ہوں میں

○

تا حدِ نظر آج جو پھیلا ہے سمندر
اک سویا ہوا دیوتا لگتا ہے سمندر

جتنی بھی ہے دھرتی سے ہمالہ کی بلندی
اتنا ہی یہ سنتے ہیں کہ گہرا ہے سمندر

دھرتی کے سلگتے ہوئے سینے پہ ہمیشہ
بادل کی طرح ٹوٹ کے برسا ہے سمندر

بچے نے کہا دیکھ کے آکاش کی جانب
ہر چیز کے دو رُخ ہیں یہ اُلٹا ہے سمندر

پوچھا یہ سمندر نے کسی اشک سے اک دن
قطرے میں کبھی آپ نے دیکھا ہے سمندر
اب تک تو نہیں ہاتھ لگی چاند کی دُلہن
راتوں کو کئی بار یہ لپکا ہے سمندر
نفرت کے جزیرے بھی کئی ایک ہیں لیکن
ہر دل میں کنولؔ پیار کا بہتا ہے سمندر

○

اپنوں کی زباں اور ہے غیروں کی زباں اور
پھولوں کے نشاں اور ہیں کانٹوں کے نشاں اور
ہر سمت وہی برق وہی آگ کے شعلے
آباد کہاں جا کے کریں دل کا جہاں اور
اب اور نہ غم دو کہ نکل آئیں گے آنسو
بھڑکے گی اگر آگ تو اٹھے گا دھواں اور
نکلو تو سہی گھر سے کوئی لے کے ارادہ
کام آئے پھر آپ کے یہ عزمِ جواں اور
تم دور چلے جاؤ گے جب چھوڑ کے تنہا
رہ رہ کے ستائے گا مجھے دردِ نہاں اور
صدمات کے اس بوجھ سے میں ٹوٹ گیا ہوں
اٹھنے کا نہیں مجھ سے یہ اب بارِ گراں اور
کیا سچ ہے کنولؔ جھوٹ ہے کیا کون بتائے
زخموں کے بیاں اور ہیں قاتل کا بیاں اور

□□

کیلاش ماہر

کیلاش ماہر اردو کے اُن چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر رہتے ہوئے عہدے کو شاعری پر اور شاعری کو عہدے پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ شاعری اور افسری کے درمیان ہمیشہ ایک حدِ فاصل قائم رکھی، خوش اسلوبی سے فرائضِ منصبی انجام دیے اور داد وستائش سے بے نیاز ہوکر ایک شانِ استغنا کے ساتھ اپنا شعری سفر جاری رکھا۔

دفتری دنیا میں کیلاش چند ماتھر اور ادبی دنیا میں کیلاش ماہر ۸/اکتوبر ۱۹۲۸ء کو برتنوں کے شہر مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آنجہانی منشی رام چندر ماتھر ملازمت پیشہ انسان تھے۔ کائستھ خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے اردو تہذیب میں آنکھ کھولی۔ ننیہال میں ماموں جناب لچھمن سروپ ماتھر شاعر تھے لیکن اس زمانے کی عام شعری روایت کے برعکس ان کی شاعری ہندو مذہبی عقائد کے گرد گھومتی تھی۔ کیلاش ماہر نے شعری اثرات اُن سے بھی قبول کیے اور پندرہ سولہ سال کی عمر سے قافیہ پیمائی شروع کردی۔ گرچہ اُس زمانے میں استاد شاعروں کی کمی نہیں اور تلمیذ وتلمذ کی روایت پوری طرح باقی تھی لیکن کیلاش ماہر نے شاعری کے کوچے میں قدم رکھ کر اساتذۂ کرام کے دواوین کے مسلسل مطالعے اور خود آگہی کو اپنا مشعلِ راہ بنایا، مشقِ سخن جاری رکھی اور اردو کے خالصتاً ادبی رسائل وجرائد میں چھپ کر دلّی کے ادبی منظرنامے پر ابھرے۔

کیلاش ماہرؔ مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ مشاعروں کے حوالے سے شاعروں کو جاننے اور پہچاننے والے سخن فہم حضرات کیلاش ماہرؔ کی خوبصورت شاعری سے ناواقف ہیں لیکن شعر و ادب کے سنجیدہ قارئین اُن کو ''لمسِ ہوا'' اور ''لمحہ لمحہ پیاس'' جیسے خوبصورت شعری مجموعوں کے حوالوں سے جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔

کیلاش ماہرؔ بھارت سرکار کی منسٹری آف انڈسٹریز میں ڈائرکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہو کر وکالت کر رہے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

بے سبب راہ میں کیوں آہ و بکا کی ہوگی
زندگی ہم نے کہیں تجھ سے خطا کی ہوگی

وہی تپتی ہوئی دھرتی وہی اُڑتے بادل
شہر در شہر یہی شکل ہوا کی ہوگی

پھر جنم لیں گے، ملن جسم کا ہوگا لیکن
وہی چادر، وہی دیوار حیا کی ہوگی

سنگ و دیوار سے ہر شہر میں رشتہ ہوگا
دشمنی ہم سے مگر آب و ہوا کی ہوگی

خالی خالی سی میری طرح سے بکھری بکھری
ملتی جلتی یہی تصویر خلا کی ہوگی

میری آواز پہ آواز نہ آئی ماہرؔ
کوئی مجبوری اِدھر کو وہ ندا کی ہوگی

○

شعلہ ہے پھول، پھول چمن تک نہ آئیو
شادابیِ بہار سے دھوکا نہ کھائیو

مدت ہوئی وہ کوئے ملامت اُجڑ گیا
اب کی برس چراغِ وفا مت جلائیو

دامن سے ہم نے گردِ تعلق بھی جھاڑ دی
آسودگانِ ہجر کے اب منہ نہ آئیو

اِن مسکراہٹوں میں دبی ہے غموں کی آنچ
چہرے کے روپ رنگ سے دھوکا نہ کھائیو

اتنے بُرے تو جی کے نہیں زود رنج لوگ
آشفتگانِ شوق پہ تہمت نہ لائیو

پتھر نہ ڈال دے کوئی جھولی میں دن ڈھلے
ماہر فقیر بن کے صدا مت لگائیو

○

آج ہوگا نہ تماشا کوئی ہونے والا
جا چکا خون میں پوشاک بھگونے والا

جس سے تا حشر رگِ جاں میں اُجالا کرتے
داغ ہوتا کوئی بے داغ نہ ہونے والا

تک رہا ہوں بڑی مدت سے بڑی حسرت سے
گھر دہلیز پہ بیٹھا ہے کھلونے والا

اہلِ غم سارے سکندر کی طرف لوٹ گئے
اب سرِ دار چراغاں نہیں ہونے والا

تم بھی اس شہر میں بن جاؤ گے پتھر جیسے
ہنسنے والا ہے یہاں کوئی نہ رونے والا

خواب در خواب ہے وہ تیرہ شبی کا عالم
تو بھی آئے تو چراغاں نہیں ہونے والا

میرِ منزل سے تباہی کا سبب کیا پوچھیں
دور بیٹھا ہے سفینے کو ڈبونے والا

چادرِ گل کے پرستار کہاں ہو ماؔہر
ڈھونڈتا ہے تمھیں صحرا میں بچھونے والا

○

کِھلتا بدن، گلاب کی جس کو نظر لگے
خوشبو کی بھیڑ میں کوئی تجھ سا مگر لگے

جب سے دلوں کے بیچ میں دیوار و در لگے
گلشن کے سارے پیڑ ہمیں بے ثمر لگے

کوئے جنوں کی مٹ گئی پہچان سب مگر
خوشبو جہاں رُکے، وہیں اس کا ہی گھر لگے

کابل ہو، چین ہو کہ وہ بیروت کا دیار!
مقتل میں جو گرے مجھے اپنا ہی سر لگے

ہم اُس مکان سے بھی بہت تنگ آ چکے
گھر ایسا کوئی ہو جو سدا اپنا گھر لگے

اندر سے ریزہ ریزہ ہے، وہ شخص بھی میاں
باہر سے دیکھنے میں جو شوریدہ سر لگے

کتبہ وہاں لگائیو ماؔہر کے نام کا
دلّی میں جب نمائشِ اہلِ ہنر لگے

○

منہ دیکھے کی باتیں ساری وعدے رنگیں، خواب سنہرے
دلّی جا کر بھول نہ جانا، پھول بدن یہ چاند سے چہرے
تم کو تو اپنا سمجھا تھا، تم سب سے بیگانے ٹھہرے
تم نے دل میں جھانکا ہوتا، کتنے زخم ہیں کتنے گہرے

لاکھ پجاری دیپ جلائیں، خوں ٹپکائیں جی سے جائیں
بُت خانے میں رِیت سدا کی، سارے صنم ہی گونگے بہرے
بیتا ہوا ہر لمحہ مجھ سے اپنی قیمت مانگ رہا ہے
کیسی بھیانک تنہائی ہے، چاروں طرف ہیں ہنستے چہرے
اپنی ہی صورت دیکھ کے ماہر، پہروں پہروں روئے بھی ہم
کس کو اپنا میت بناتے لوگ تجارت پیشہ ٹھہرے

○

اپنا دُکھ کیسے جتلائیں
نقلی چہرہ کیسے دِکھائیں
لمسِ ہوا سے جی بہلائیں
اُن کا کیا ہے آئیں نہ آئیں
تجھ سے اپنی یاری چھوٹی
بیتے دِنوں کا جشن منائیں
اُجلے بدن کی بات ہی کچھ تھی
کاغذ پر کیا مہر لگائیں
دیر و حرم میں سناٹا ہے
اور کہاں آواز لگائیں
دن تو ' کافی ہوم' میں گزرا
رات ہوئی، کس کے گھر جائیں
اتنا وقت کہاں اب ماہر
کوئی نیا محبوب بنائیں

□□

گلزؔار دہلوی

تقسیمِ وطن کے سانحے کے بعد شکوک وشبہات، عدم اعتماد اور فرقہ پرستی کی پھیلی ہوئی مسموم فضاؤں میں اردو کے تحفظ و بقا کا جھنڈا بلند کرنے اور شعری و ادبی سرگرمیوں کو ایک مشن، ایک تحریک کا روپ دینے والے پنڈت آنند موہن زتشی گلزؔار دہلوی ۷ر جولائی ۱۹۲۶ء کو دہلی کے ایک ایسے ذی علم اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے جو "ایں خانہ ہمہ آفتاب" کی جیتی جاگتی مثال تھا۔ ان کے والد آنجہانی پنڈت تربھون ناتھ زتشی زؔار دہلوی فارسی کے جید عالم اور فصیح الملک استاد داؔغ دہلوی کے سب سے پہلے شاگرد تھے۔ علامہ زار دہلوی نہ صرف خود ایک قادرالکلام شاعر تھے بلکہ ان کی بیگم اور دوسرے بیٹے بھی شاعر تھے۔ شاعروں کے اس خاندان کے سب سے چھوٹے بیٹے آنند موہن زتشی نے اوائلِ عمری میں جب قافیہ پیمائی شروع کی تو قادرالکلام شاعر باپ نے کچھ عرصہ تک تربیت دی، شاعری کے رموز سکھائے اور گلزؔار کے تخلص سے نواز کر اپنے خواجہ تاش ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائؔل دہلوی کے سپرد کر دیا۔ حضرتِ سائؔل کے انتقال کے بعد گلزار کا سلسلۂ تلمذ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ہوتا ہوا آنجہانی پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی سے جا ملتا ہے۔ گلزؔار نے ان نامور اساتذہ و فصحاء کے علاوہ عربی شعر و سخن میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم جیسے عالمِ دین سے فیضانِ نور حاصل کیا۔

گلزؔار دہلوی ۱۹۴۷ء سے تا حال انجمن تعمیرِ اردو کے بانی سکریٹری ہیں جس کی کسی زمانے میں باقاعدگی کے ساتھ ماہانہ نشستیں اردو ناہال جامع مسجد میں منعقد ہوا کرتی تھیں اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کی ''اردو مجلس'' کی ادبی نشستوں کی یاد تازہ ہو جایا کرتی تھی۔ انجمن تعمیرِ اردو غالباً دہلی کی واحد انجمن تھی جس کی ادبی و شعری سرگرمیاں تقریباً تین دہوں تک مسلسل جاری رہیں اور جس کی نشستوں میں اردو دنیا کی قد آور شخصیتوں نے شرکت کی۔

گلزؔار دہلوی بیس پچیس سال تک حکومتِ ہند کے ماہانہ ''سائنس کی دنیا'' کے ایڈیٹر رہے اور اب سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر اردو کے تحفظ و بقا کے لیے ایک بار پھر سرگرمِ عمل ہیں۔

''گلزارِ غزل'' گلزؔار دہلوی کا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۰ء میں مکتبہ ''الیوم'' کی زیرِ نگرانی زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ اردو اکادمی، دہلی نے گلزؔار کی شعری و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو دو بار انعام سے سرفراز کیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

عمر جو بے خودی میں گزری ہے
بس وہی آگہی میں گزری ہے

کوئی موجِ نسیم سے پوچھے
کیسی آوارگی میں گزری ہے

ان کی بھی رہ سکی نہ دارائی
جن کی اسکندری میں گزری ہے

آسرا اُن کی رہبری ٹھہری
جن کی خود رہزنی میں گزری ہے

آس کے جگنوؤ سدا کس کی
زندگی روشنی میں گزری ہے

ہجر کے رنج و غم، معاذاللہ
ایک شب اک صدی میں گزری ہے
ہم نشینی پہ فخر کر ناداں
صحبتِ آدمی میں گزری ہے
یوں تو شاعر بہت سے گزرے ہیں
اپنی بھی شاعری میں گزری ہے
میرؔ کے بعد غالبؔ و اقبالؔ
اک صدا، اک صدی میں گزری ہے

○

اس ستم گر کی مہربانی سے
دل الجھتا ہے زندگانی سے
خاک سے کتنی صورتیں ابھریں
دُھل گئے نقش کتنے پانی سے
ہم سے پوچھو تو ظلم بہتر ہیں
اِن حسینوں کی مہربانی سے
اور بھی کیا قیامت آئے گی
پوچھنا ہے تری جوانی سے
دل سلگتا ہے اشک بہتے ہیں
آگ بجھتی نہیں ہے پانی سے
حسرتِ عمرِ جاوداں لے کر
جا رہے ہیں سرائے فانی سے
ہائے کیا دورِ زندگی گزرا
واقعے ہوگئے کہانی سے
کتنی خوش فہمیوں کے بت توڑے
تو نے گلزارؔ خوش بیانی سے

○

تہذیبِ حسن و رنگِ بہاراں لیے ہوئے
کانٹے بھی ہیں غرورِ گلستاں لیے ہوئے

جیسے کوئی نشے میں سُنے میرؔ کی غزل
آنکھیں ہیں وہ سرورِ غزالاں لیے ہوئے

گلگشت کو چمن میں وہ آیا ہے رشکِ گل
چہرے پہ عکسِ لعلِ بدخشاں لیے ہوئے

میں کب سے منتظر ہوں تمھارے ورود کا
پلکوں پہ اپنی ، جشنِ چراغاں لیے ہوئے

زلفِ سیاہ رُخ پہ ہے کاکل بھی خال پر
دامن میں کتنے ہندو ہیں قرآں لیے ہوئے

کیا وقت قافلہ پہ پڑا ہے کہ بہرِ قتل
خنجر ہیں آستیں میں ہُدی خواں لیے ہوئے

گلزارؔ دہلوی کی غزل کی زبان کو
پھرتے ہیں شہر شہر زباں داں لیے ہوئے

○

فلاحِ آدمیت میں صعوبت سہہ کے مرجانا
یہی ہے کام کرجانا یہی ہے نام کرجانا

جہاں انسانیت وحشت کے ہاتھوں ذبح ہوتی ہو
وہاں تذلیل ہے جینا وہاں بہتر ہے مرجانا

یوں ہی دیر وحرم کی ٹھوکریں کھاتے پھرے برسوں
تری ٹھوکر سے لکھا تھا مقدر کا سنور جانا

سکونِ روح ملتا ہے زمانہ کو ترے در سے
بہشت و خلد کے مانند ہم نے تیرا در جانا

ہماری سادہ لوحی تھی خدا بخشے کہ خوش فہمی
کہ ہر انسان کی صورت کو مافوق البشر جانا
یہ ہے رندوں پہ رحمت روزِ محشر خود مشیت نے
لکھا ہے آبِ کوثر سے نکھر جانا سنور جانا
چمن میں اس قدر سہمے ہوئے ہیں آشیاں والے
کہ جگنو کی چمک کو سازشِ برق و شرر جانا
ہمیں خارِ وطن گلزارؔ پیارے ہیں گُل تر سے
کہ ہر ذرّے کو خاکِ ہند کے شمس و قمر جانا

○

خدا نے حسن دیا ہے تمھیں شباب کے ساتھ
سبو و جام کھنکتے ہوئے رُباب کے ساتھ
لبوں سے چھو کے پلاؤ شراب واعظ کو
پرانے لوگ ہیں، پیتے ہیں یہ گُلاب کے ساتھ
یہ کس کی زلفِ پریشاں کا فیض ہے یارو؟
تمام عمر گزاری ہے پیچ و تاب کے ساتھ
کھلی ہوئی ہے جو سورج مکھی گلستاں میں
یہ کس نے آنکھ ملائی ہے آفتاب کے ساتھ؟
کہاں وہ گرمیٔ عزم و عمل، وہ قربانی
وہ جوش ختم ہوا دورِ انقلاب کے ساتھ
خودی کو فخر ہے ہمدم، انا کو ہم پر ناز
کہ ہم نے عمر گزاری ہے آب و تاب کے ساتھ
روایتوں کو کبھی چھوڑتے نہیں گلزارؔ
شگوفے رہتے ہیں ہر وقت کچھ جناب کے ساتھ

□□

گوپال متّل

گوپال متّل بنیادی طور پر شاعر اور ادیب تھے، خوبصورت شعر اور رواں دواں نثر لکھتے تھے۔ صحافت ان کا پیشہ اور ذریعۂ معاش تھا اور دہلی سے ''تحریک'' جیسا معیاری ادبی ماہنامہ نکالتے تھے۔ ترقی پسند تحریک مخالفانہ نظریات رکھتے تھے۔ صحافت ان کی شاعرانہ شہرت پر حاوی ہوگئی تھی اور ترقی پسند تحریک مخالفانہ نظریات اردو دنیا میں ان کی پہچان بن گئی تھی۔

گوپال متّل ۷رجون ۱۹۰۶ء کو ریاست مالیر کوٹلہ (پنجاب) میں لالہ ولایتی رام صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے۔ مالیر کوٹلہ میں ہی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ہوش سنبھال کر شاعری شروع کی تو اپنے وجدان اور شعرائے متقدمین کے دواوین کے مطالعہ کو مشعلِ راہ بنایا اور تخلص کی دیرینہ روایت سے پرہیز کیا۔ گریجویشن کے بعد شعر و ادب کی خدمت کے جذبوں کے ساتھ لدھیانے سے ایک ادبی رسالہ نکالا جو چند شماروں کے بعد محدود مالی وسائل کی بھینٹ چڑھ گیا۔

گوپال متّل نے اپنی عملی اور ادبی زندگی کا سفر صحیح معنوں میں لاہور سے شروع کیا۔ ابتداء میں لاہور کے مختلف روزناموں میں کام کیا اور پھر علامہ تاجور نجیب آبادی کے ادبی ماہنامہ ''شاہکار'' سے وابستہ ہوگئے۔ گوپال متّل گرچہ ''شاہکار'' میں نائب مدیر

تھے لیکن علامہ تاجور نے رسالے کی تمام ذمہ داریاں ان کو سونپ دی تھیں۔ شاہکار کی ملازمت کے دوران علامہ تاجور کی صحبت اور قربت میں گوپال متل کی شاعری میں مزید نکھار آیا۔

تقسیم وطن کے وقت گوپال متل نے ہجرت کر کے دہلی کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور دریا گنج سے خالص ادبی ماہنامہ ''تحریک'' جاری کیا جو تین چار دہوں تک نئے ذہنوں کی آبیاری کرتا رہا۔ گرچہ ''تحریک'' کا بنیادی مقصد ترقی پسند تحریک کی مخالفت تھا لیکن اس ماہنامے کی ادبی افادیت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ ۵/اپریل ۱۹۹۳ء کو گوپال متل کے انتقال کے ساتھ ماہنامہ ''تحریک'' بھی ماضی کا ایک یادگار ورق بن گیا۔

گوپال متل خوب صورت اور رواں دواں نثر لکھتے تھے۔ ''لاہور کا جو ذکر کیا...'' لاہور کی یادداشتوں پر منحصر ایک خوبصورت نثری کتاب ہے جس کو پڑھ کر اس زمانے کے لاہور کی علمی، ادبی، شعری اور صحافتی زندگی کی ایک چلتی پھرتی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ''ادب میں ترقی پسندی'' تنقیدی نوعیت کی کتاب ہے جسے گوپال متل نے اپنے مخصوص نظریات کی روشنی میں سپردِ قلم کیا ہے۔

گوپال متل اپنی عمدہ اور اچھی شاعری کے باوجود مشاعروں کے شاعر نہیں تھے اور بہت کم مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ مشاعروں، شعری نشستوں اور دوسری ادبی سرگرمیوں سے دور رہنے کے باوجود متل صاحب کا شعری سفر آخر وقت تک جاری رہا۔ ''دوراہا''، ''صحرا میں اذان''، ''شرارِ نغمہ'' اور ''سچے بول'' جیسے شعری مجموعے ان کی حیات ہی میں منصۂ شہود پر آگئے تھے۔ لیکن ''کلیاتِ گوپال متل'' اُن کے انتقال کے بعد متل صاحب کے ناشر بیٹوں نے شائع کی۔

نمونۂ کلام:

غزل

شاداں نہ ہو گر مجھ پہ کڑا وقت پڑا ہے
تو زد میں ہے جس وقت کی اس سے بھی کڑا ہے
ہے دھوپ مرے سر پہ مگر تو بھی مری جاں
گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں کھڑا ہے
کیا شان ہے واللہ حسین ابنِ علیؑ کی
سر کٹ گیا قد پھر بھی حریفوں سے بڑا ہے
ہم لاش سمجھ کر جسے پھینک آئے تھے وہ شخص
چٹان کی مانند علم بن کے کھڑا ہے
ہاں ٹوٹ گیا وہ بھی شجر تھا جو تناور
کچھ دیر مگر تند ہواؤں سے لڑا ہے

○

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سُونے مکان کا دِیا ہوں
منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں
محمل بھی نہیں کوئی نظر میں
صحرا کی بھی خاک چھانتا ہوں
منصور، نہ دعویِٔ انا الحق
سولی پہ مگر لٹک رہا ہوں

○

اے اہلِ کرم نہیں میں سائل
رستے پہ یونہی کھڑا ہوا ہوں
اب شکوۂ سنگ و خشت کیسا
جب تیری گلی میں آگیا ہوں
اس شہر میں وضعِ کج کلاہی
میں واقعی در خورِ سزا ہوں
مشکل نہیں ترکِ عشق لیکن
اس کا بھی مآل جانتا ہوں

○

تیری آنکھوں میں جو نشہ ہے پذیرائی کا
رنگ بھر دے نہ مری زیست میں رُسوائی کا
تجھ کو افسونِ محبت کی ضرورت کیا تھی
سحر کچھ کم تو نہیں تھا تری رعنائی کا
دل تو کیا چیز ہے جاں اس پہ تصدق کردوں
یہ اگر عربدہ بھی ہو کسی ہرجائی کا
سوچتا ہوں دلِ بیتاب پہ کیا گزرے گی
سامنا ہوگیا گر پھر شبِ تنہائی کا
کہیں ایسا نہ ہو اس لطف و مدارات کے بعد
امتحاں ہو مرے پندارِ شکیبائی کا

○

فقط اک شغلِ بیکاری ہے اب بادہ کشی اپنی
وہ محفل اُٹھ گئی قائم تھی جس سے سرخوشی اپنی

خدا، یا ناخدا اب جس کو چاہو بخش دو عزت
حقیقت میں تو کشتی اتفاقاً بچ گئی اپنی

بس اب گزریں گے راہِ زندگی سے بے نیازانہ
اگر تیرے کرم پر منحصر ہے زندگی اپنی

بہت جی چاہتا ہے یہ فقط نقصِ بصارت ہو
بڑی سُرعت سے دنیا کھو رہی ہے دلکشی اپنی

○

سوانگ اب ترکِ محبت کا رچایا جائے
اُس کے پندار کو آئینہ دکھایا جائے

وضعداریِ محبت کے منافی ہے تو ہو
آج کالر پہ نیا پھول سجایا جائے

شعر میں تذکرۂ دشت و بیاباں ہو مگر
اک بڑے شہر میں گھر اپنا بسایا جائے

بالکونی وہ کئی دن سے ہے ویران یارو
اُس گلی میں کوئی ہنگامہ اٹھایا جائے

سر یہ کہتا ہے گوارا نہیں اب بارشِ سنگ
دل یہ کہتا ہے اسی کوچے میں جایا جائے

ہم ہی پیچھے رہیں کیوں دعویٔ جانبازی میں
کیا ضروری ہے کہ مر کر بھی دکھایا جائے

شاعری میں نہ رہا جذبہ و احساس کو دخل
اب اسے قوم کی خدمت پہ لگایا جائے

○

اپنے انجام سے ڈرتا ہوں میں
دل دھڑکتا ہے کہ سچّا ہوں میں

میرا ساقی ہے بڑا دریا دل
پھر بھی پیاسا ہوں کہ صحرا ہوں میں

اور کس کو ہو مرے زہر کی تاب
اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

کیوں کروں پیروِی گوتم و قیس
جب بھرے گھر میں بھی تنہا ہوں میں

تھا وہ کچھ ہم سے زیادہ ہی مریض
جس کا دعوٰی تھا: مسیحا ہوں میں

کیا نہیں ہے کوئی مے ہوش گداز
جتنی پیتا ہوں سنبھلتا ہوں میں

□□

گوہر دہلوی

اردو تہذیب کے پروردہ دگمبر پرشاد جین گوہر دہلوی پیشے کے لحاظ سے جوہری تھے اور دریبہ میں سونے چاندی کے زیورات کی کافی بڑی دکان تھی۔ جناب آغا شاعر قزلباش کے شاگرد تھے اور استاد کے نام اور ان کی یادوں کو زندہ رکھنے کے لیے مشاعروں اور شعری نشستوں میں اپنے کلام سے پہلے ان کے دو تین شعر تبرکاً ضرور سنایا کرتے تھے اور اس وضع کو ہمیشہ نبھایا۔

اردو زبان سے عشق تھا اور شعر و ادب کی عملی خدمت کرنے کے لیے ''شعلہ و شبنم'' کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ بھی نکالتے تھے۔ لیکن تقسیم وطن کے کچھ عرصہ کے بعد حالات سے دل برداشتہ ہو کر نہ صرف رسالہ بند کر دیا تھا بلکہ شاعری بھی ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

گوہر دہلوی اچھا شعر کہتے تھے، ادبی ماہنامے کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے لیکن شعری مجموعے کی اشاعت پر کبھی دھیان نہیں دیا، ترکِ شاعری کے بعد مجموعے کی اشاعت کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، چنانچہ ۹ر اپریل ۱۹۸۸ء کو ان کے انتقال کے بعد ان کا تمام شعری اثاثہ طاقِ نسیاں ہو گیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

کسی صورت سے ہو، اب اُن سے شرحِ آرزو ہوگی
زباں خاموش ہوگی، تو نظر سے گفتگو ہوگی

کسی کو آج تک دیر و حرم میں ڈھونڈنے والے
کہاں تک اور توہینِ مذاقِ جستجو ہوگی؟

مآلِ آرزو کے حیرتی، کیا تو سمجھتا تھا
شکستِ آرزو شاید بقدرِ آرزو ہوگی؟

کوئی کہہ دے یہ تہذیبِ نوی کے خام رہبر سے
حقیقت چھپتی جائے گی جہاں تک جستجو ہوگی؟

پرکھ لیں، امتحاں کرلیں کہ یہ گوہر کی عزت ہے
زیادہ چشمِ شاہ و جوہری میں آبرو ہوگی

○

عشق نے جلا پائی حسن کے فسانے سے
زندگی چمک اُٹھی تیرے مسکرانے سے

زلف کی گھٹاؤں میں زندگی غزل خواں ہے
لوٹ لے بہارِ نو حسن کے خزانے سے

رات کی خموشی میں دھڑکنیں مرے دل کی
اور بھی فزوں تر تھیں تیرے یاد آنے سے

انقلابِ تعمیری اک حیاتِ تازہ ہے
زندگی نکھرتی ہے انقلاب آنے سے

گوہرِ سخن ور ہی، یادگارِ شاعر ہے
برق کو بھی نسبت ہے داغؔ کے گھرانے سے

ماجد دیوبندی

مشاعروں کے حوالے سے شہرت پانے اور مقبولیت کی سیڑھیاں طے کرنے والے ماجد ضلع سہارنپور کے ایک چھوٹے مگر چار دانگِ عالم میں مشہور قصبہ دیوبند کے رہنے والے ہیں۔ ۷ رجولائی ۱۹۶۴ء کو اس قصبے کے ایک ایسے خانوادے میں پیدا ہوئے جہاں دینی اور دنیاوی علم کی جڑیں بہت گہری ہیں اور شعر وادب سے دلچسپی خاندان کی ایک عام روایت ہے۔ ماجد نے ابتدائی تعلیم وتربیت یہیں حاصل کی۔ چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد خواجہ حسن نظامی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ آج کل جامعہ ملیہ اسلامیہ کے غیر تدریسی عملے سے وابستہ ہیں۔

ابتدائے شاعری میں ماجد صدیقی دیوبندی کے نام سے مشاعروں میں متعارف ہوئے لیکن اب صرف ماجد دیوبندی کے نام سے مشہور ہیں۔ خوبصورت اور شاعرانہ ترنم سے مشاعروں میں چھا جاتے ہیں۔ غزل اور نعت خوب کہتے ہیں۔ ڈاکٹر ماجد کے اب تک دو شعری مجموعے ''لہو، لہو آنکھیں (۲۰۰۰ء) اور ''ذکرِ رسولؐ'' (۲۰۰۴ء) چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

در کون کرے پیدا سنگین چٹانوں میں
وہ خون نہ وہ گرمی ملّت کے جوانوں میں

دیوانوں کی دنیا ہے پتھر کا زمانہ ہے
بے فکر نہ بیٹھو تم شیشے کے مکانوں میں

اے طائرِ بے پروہ بے داری و آگاہی
ہیں دام بھی پوشیدہ بکھرے ہوئے دانوں میں

اس دورِ بہاراں سے بہتر تھی خزاں یارو
کانٹے نظر آتے ہیں پھولوں کی زبانوں میں

کیا بات ہے اے ماجدؔ وہ کیف نہیں باقی
ناقوسِ برہمن میں ملّا کی اذانوں میں

○

سامانِ تجارت میرا ایمان نہیں ہے
ہر در پہ جھکے سر یہ میری شان نہیں ہے

ہر لفظ کو سینے میں بسالو تو بنے بات
طاقوں میں سجانے کو یہ قرآن نہیں ہے

اللہ میرے رزق کی برکت نہ چلی جائے
دو روز سے گھر میں کوئی مہمان نہیں ہے

ہم نے تو بنائے ہیں سمندر میں بھی رستے
یوں ہم کو مٹانا کوئی آسان نہیں ہے

وہ جس کو بزرگوں کی روایت نہ رہے یاد
اُس شخص کی لوگو کوئی پہچان نہیں ہے

دو چار امیدوں کے دیے اب بھی ہیں روشن
ماضی کی حویلی ابھی ویران نہیں ہے
پھولوں کی جگہ جلتے ہوئے لفظ سجے ہیں
اب میز پہ اخبار ہیں گلدان نہیں ہے
ماجد ہے میرا شعر میرے عہد کی تصویر
غالب کی غزل میر کا دیوان نہیں ہے

○

خون مجبوروں کا ہر گام بہانے والے
کیا کہیں گے تجھے آخر یہ زمانے والے
کانپتے ہاتھوں سے تلوار اٹھانے والے
تیرے اجداد تھے تاریخ بنانے والے
کشتیاں ہم نے جلادی ہیں بھروسے پہ ترے
اب یہاں سے نہیں ہم لوٹ کے جانے والے
زندہ رہنا ہے تو پھر خود کو مٹانا سیکھو
گھٹ کے مرتے ہیں سدا جان بچانے والے
روشنی ان کے گھروں میں بھی نہ ہو پائے گی
سوچ لیں یہ بھی میرے گھر کو جلانے والے
کوئی کہہ دے یہ ذرا وقت کے شیطانوں سے
خاک ہو جاتے ہیں سورج کو بجھانے والے
ہاتھ اپنے بھی گنوا بیٹھیں گے اک دن ماجدؔ
سجدہ گاہوں کے تقدس کے مٹانے والے

○

آس کو دشتِ آرزو دے دے
پاؤں کو کربِ جستجو دے دے
اب کے پھولوں کا رنگ پھیکا ہے
فصلِ گل کو میرا لہو دے دے
میں کہاں اور متاعِ درد کہاں
یہی تیری دین جس کو تو دے دے
بے زبانی میں عمر گزری ہے
آج تو اِذنِ گفتگو دے دے
عمر بھر دوستوں کا نام نہ لوں
گر قرینے کا ایک عدو دے دے
جس نے سرمست کردیا مجھ کو
واعظوں کو بھی وہ سبو دے دے
تیرا ماجد خموش ہے کب سے
کوئی موضوعِ گفتگو دے دے

□□

متین امروہوی

متین الدین صدیقی جو شعر و ادب کی دنیا میں متین امروہوی کے نام سے مشہور ہیں ۷ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو امروہہ جیسے مردم خیز خطّے میں پیدا ہوئے اور بستی حضرت نظام الدین میں شعور کی منزلوں کو پہنچے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی اور خواجہ حسن ثانی نظامی جیسے اکابرین کی صحبتوں میں ذہنی تربیت ہوئی۔ پیشے سے آٹو موبائل انجینئر ہیں اور مزارِ غالبؔ کے پاس پیشے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ مزارِ غالبؔ کی مسلسل ہمسائیگی نے متین الدین صدیقی کو متین امروہوی بنا دیا۔

متین امروہوی نے شعری کوچے میں قدم رکھ کر اپنی شعری و تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے غالبؔ کی زمینوں میں غزلیں کہنے کا وہ مشکل اور دشوار راستہ اختیار کیا جہاں زبان و بیان پر عبور اور دسترس کے بغیر ٹھوکریں کھانے کے ساتھ جگ ہنسائی کے امکانات زیادہ تھے۔ ہمارے قادر الکلام شعراء اور اساتذۂ کرام نے بھی غالبؔ کی مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرنے سے گریز کیا ہے، لیکن متین امروہوی نے غالبؔ کی ہر زمین میں غزل کہہ کر نہ صرف ایک نظیر قائم کی ہے بلکہ غالبیات کے باب میں ایک اضافہ کیا ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

کسی کو جاں پسند آئی کسی کو دل پسند آیا
مجھے ہر زاویے سے وہ مہِ کامل پسند آیا

اگرچہ مشکلیں آئیں بہت راہِ محبت میں
مگر پھر بھی مجھے یہ جادۂ منزل پسند آیا

ہوا تیرِ نظر سے خونِ ناحق جب سرِ مقتل
مجھے قاتل پسند آیا، اُسے بسمل پسند آیا

ہزاروں کاروانِ شوق گزرے دل کے صحرا سے
مگر مجنوں کو لیلیٰ کا فقط محمل پسند آیا

زمانہ چاند کے چہرے پر اس کو داغ کہتا ہے
ترے رخسار پر لیکن مجھے یہ تِل پسند آیا

متینؔ آیا سرِ بزمِ سخن تو یہ کہا سب نے
وہ دیکھو شاعرِ غالب نما مشکل پسند آیا

○

چمن میں یہ بہار آنے کے دن ہیں
گلوں سے دل کو بہلانے کے دن ہیں

کھلے ہیں پھول تو آئیں گے پھل بھی
شجر میں یہ ثمر آنے کے دن ہیں

جوانی گل رُخوں پر آرہی ہے
یہی تو عشق فرمانے کے دن ہیں

نہ دیکھو آئینے میں اپنا جلوہ
نظر اپنی یہ لگ جانے کے دن ہیں

دبے پاؤں وہ اس منزل سے گزرے
اسے یہ بات سمجھانے کے دن ہیں
حریمِ ناز کے پردے میں رہنا
کہیں آنے نہ یہ جانے کے دن ہیں
سمجھ کر یہ اُسے دل دے دیا ہے
متینؔ اس کو یہ اپنانے کے دن ہیں

○

راہ میں اُن کی نین بچھائے
آنے والے پھر بھی نہ آئے
آنکھ ملاتے کیا اُن سے ہم
کن انکھیوں سے دیکھ نہ پائے
یہ جو بہار آئی زخموں پر
پروائی نے پھول کھلائے
اُس کو خوشی کیا راس آئے گی
غم بھی جس کو راس نہ آئے
سوزِ دروں اُس کو کہتے ہیں
پانی میں جو آگ لگائے
کل کیسے پھر کل آئے گی
آج اگر دلدار نہ آئے

○

کہنے کو حسن و عشق کے رکھ لیے ہم نے نام دو
اصل میں دیکھیے تو یہ بادہ ہے ایک جام دو
مجھ سے جنونِ عشق میں کرتے ہو بات ہوش کی
اہلِ خرد زبان کو اپنی ذرا لگام دو

گردشِ جام کا مجھے صبح سے انتظار ہے
اب تو خدا کے واسطے آ گیا وقتِ شام دو
دیکھا جو اُس کو بام پر چاند بھی آ گیا نظر
اہلِ نظر نے لے لیے ایک نظر سے کام دو
ایک نگاہِ شوق ہے، ایک حنائی ہاتھ ہے
کرتا ہے بزمِ ناز میں کوئی مجھے سلام دو
حسن کے سر پہ تاج ہے، عشق پہ اُس کا راج ہے
اُس کا نصیب دیکھیے اُس کو ملے مقام دو
نثر میں نظم کا چلن، غالبؔ و میرؔ کا ہے فن
ایک سخن میں کیجیے پیش یہاں کلام دو
دیکھنا کوئے یار میں اُڑ کے متینؔ جاؤں گا
مرکبِ خوش خرام کی مجھ کو ذرا لگام دو

ؐ

آج کسی کی یاد آئی ہے وہ بھی اتنی رات گئے
کھوئی ہوئی اک شے پائی ہے وہ بھی اتنی رات گئے
اے غنچو! آہستہ کھِلنا ٹوٹ نہ جائے خواب اپنا
مشکل سے تو نیند آئی ہے وہ بھی اتنی رات گئے
وہ سوئے تو گجرہ مہکے، جاگے تو جگنو چمکے
رات کی رانی مسکائی ہے وہ بھی اتنی رات گئے
دردِ جگر نے جب تڑپایا ہوش و خرد نے سمجھایا
آہیں بھرنا رسوائی ہے وہ بھی اتنی رات گئے
در پہ متینؔ اُن کے جو پہنچے فرطِ خوشی سے وہ بولے
کیسے زحمت فرمائی ہے وہ بھی اتنی رات گئے

ؐؐ

محسن زیدی

محسن زیدی گرچہ ۱۹۳۵ء میں بہرائچ میں پیدا ہوئے لیکن ان کے بزرگ قصبہ جانسٹھ ضلع مظفرنگر کے رہنے والے تھے اور ایک ایسے ذی علم اور تاریخی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس کے ڈانڈے مغل دور کے بادشاہ گر سید برادران سے ملتے ہیں۔ محسن زیدی نے زمانۂ طالب علمی سے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا، لیکن شاعری کی پرچھائیاں تعلیم پر نہیں پڑنے دیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد دہلی میں سرکاری ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ سرکاری ملازمت کے دوران بہت اہم منصبوں پر فائز رہے اور ۱۹۹۳ء میں حکومتِ ہند کے جوائنٹ سکریٹری کے اعلیٰ عہدہ سے ریٹائر ہوئے لیکن سرکاری منصب اور شاعرانہ حیثیت میں ہمیشہ حدِ فاصل قائم رکھی اور مشاعروں اور ادبی سرگرمیوں سے ہمیشہ دور اور لاتعلق رہے۔

محسن زیدی بہت کم گو اور مرنجاں مرنج انسان تھے اور لیے دیے رہتے تھے لیکن کافی ہاؤس کی محفلوں کے شوقین تھے۔ اکثر شامیں کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں اردو اور پنجابی کے شاعروں کے ساتھ گزرتیں۔

محسن زیدی ایک معتبر شاعر تھے۔ ان کی غزلیں کلاسیکی رچاؤ سے آراستہ ہیں۔ انھوں نے روایت سے استفادہ کرتے ہوئے جدید رجحانات کی پیروی کی اور اپنے اسلوبِ سخن سے نئی نسل کی رہنمائی بھی کی۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''شہرِ دل'' (۱۹۶۱ء)، ''رشتۂ کلام''

(۱۹۷۸ء)، ''متاعِ آخرِ شب'' (۱۹۹۰ء) اور ''بابِ سخن'' (۲۰۰۰ء) شامل ہیں۔
محسن زیدی کا انتقال ۴؍ ستمبر ۲۰۰۳ء کو لکھنؤ میں ہوا، جہاں وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی اولاد کے ساتھ مقیم تھے۔

نمونۂ کلام:

غزل

وہ موت کا منظر تھا جو دن رات وہی ہے
منہ سے نہ کہو صورتِ حالات وہی ہے
لفظوں کے اُلٹ پھیر سے بدلے گا نہ مطلب
امداد جسے کہتے ہیں خیرات وہی ہے
شب خون کی نیت سے در آئی ہے دوبارا
غفلت میں نہ آجاؤ کہ یہ رات وہی ہے
گل کرنا چراغوں کا تو اک کھیل ہے اُس کا
واضح ہے پسِ پردۂ ظلمات وہی ہے
طے ہم نے بھی کر رکھا ہے مانگیں گے نہ اُس سے
یہ سچ ہے اگر قبلۂ حاجات وہی ہے

○

زنجیر میں موسم کی ہیں جکڑے ہوئے دن رات
سردی وہی گرمی وہی برسات وہی ہے
ہم نے تو اسی طرح گزارے ہیں شب و روز
اپنے لیے ہر دن وہی ہر رات وہی ہے
اک بار ملے تھے کسی تقریب میں اُس سے
تھوڑی سی بس اک اُس سے ملاقات وہی ہے

ہے کتنا مشابہ تری تصویر سے کوئی
صورت وہی جامہ وہی ہر بات وہی ہے
کچھ میرے ہی مانند ہے طرزِ سخن اُس کا
اندازِ اشارات و کنایات وہی ہے
دونوں ہی طرف آگ برابر کی ہے محسنؔ
دونوں ہی طرف گرمیِ جذبات وہی ہے

○

بس کہ دُشوار ہے اُس شخص کا چہرا لکھنا
ورنہ مشکل تو نہیں کوئی سراپا لکھنا
یہ بھی ممکن ہے کہ تحریر بدل دی جائے
دوستو اپنا بیاں خوں سے پختہ لکھنا
کچھ ہمیں سیر و تماشہ سے نہیں دلچسپی
شغل بس اپنا ہے تنہائی میں پڑھنا لکھنا
دل کا دروازہ تمھارے لیے وا رکھیں گے
لوٹ آنے کا کبھی ہو جو ارادا، لکھنا
بھیج تو سکتے ہو تم لکھ کے شکایت اُن کو
شرط بس یہ ہے کہ کوئی لفظ نہ چبھتا لکھنا

○

لوگ اسناد کے کشکول لیے پھرتے ہیں
کتنا بے سود ہے اِس دور میں پڑھنا لکھنا
کیسے دیوانے ہیں لکھتے ہوئے تھکتے ہی نہیں
ایک ہی لفظ کو سیدھا کبھی اُلٹا لکھنا
پاسِ تہذیب تو کچھ پاسِ قلم ہے ہم کو
ورنہ آتا ہے ہمیں جیسے کو تیسا لکھنا

لوگ جب لکھ کے سیہ کر گئے دیواریں تک
کون پڑھتا ہے بھلا ریت پہ میرا لکھنا
سر میں سودا تھا عجب لکھ گیا اس کو کیا کچھ
دل نے سمجھایا بہت تھا کہ نہ ایسا لکھنا
یاد کیا رکھتا کہ وہ زود فراموش بھی تھا
میں بھی کچھ بھول گیا اُس کو تقاضا لکھنا
لکھتے ہی جائیں گے ہم ان کو عریضے محسنؔ
وہ پڑھیں یا نہ پڑھیں کام ہے اپنا لکھنا

○

جادو میری زبان کا چلتا دکھائی دے
باتوں سے میری اب وہ پگھلتا دکھائی دے
دو چار گام ہی تک اندھیرا ہے راستہ
کچھ دور پر چراغ سا جلتا دکھائی دے
کرنیں بھی اب زمیں سے اُٹھانے لگیں بساط
سورج بھی اپنے اوج سے ڈھلتا دکھائی دے
پرچھائیوں کے شہر میں لوگوں کو اپنا قد
اک دوسرے کے قد سے نکلتا دکھائی دے
رنگوں کا وہ اسیر نہیں اُس کے جسم پر
خود ہی لباس رنگ بدلتا دکھائی دے
اب کشتیوں کو بھی تو روانی کا حکم ہو
پانی تو موج موج اچھلتا دکھائی دے
کرنے دو آج اُس کو قلم روشنی کا سر
دیکھو وہ کل جو ہاتھ نہ ملتا دکھائی دے

وہ جب سنبھل گیا تھا تو رُخ تھا ہوا کا اور
اب جو گرا تو پھر نہ سنبھلتا دکھائی دے
محسنؔ پہنچ کے اندھے سرے پر نہ ہو اُداس
اک راستہ یہیں سے نکلتا دکھائی دے

○

پہلے اپنے سحر سے ہم سب کو اندھا کردیا
پھر سیاہِ شب نے ہم پر کھل کے حملا کردیا
ڈالیوں پر پتّیاں بھی ایسے موسم میں نہیں
ہم نے بھی کس رُت میں پھولوں کا تقاضا کردیا
ذات کے محور سے کٹ کر وہ اکیلا رہ گیا
اُس کی بزم آرائیوں نے اُس کو تنہا کردیا
ڈر رہا ہوں راس اب شاید نہ آئے اُس کا ساتھ
جب سے اُس نے التفات اپنا زیادا کردیا
جھک کے ان نظروں نے خاکِ دل سے جانے کیا کہا
پستیوں کو جیسے ہمدوشِ ثریا کردیا
ایک طائر دشتِ جاں کے پاس ہی اڑتا رہا
سر پہ جب بھی دھوپ آئی اُس نے سایا کردیا
دور تک پھیلی ہوئی تھی چاہتوں کی چاندنی
نفرتوں کی گرد نے یہ فرش میلا کردیا
شوق نے محسنؔ بڑھادی دوریِ منزل کچھ اور
جستجو نے راستے کو اور لمبا کردیا

○

یہ سخن جو میری زباں پہ ہے یہ سخن ہے اُس کا کہا ہوا
یہ بیاں جو ہے مرے نام سے یہ بیاں ہے اُس کا لکھا ہوا

وہی میلی میلی سی چاندنی وہی دُھندلی سی روشنی
یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا
وہی ایک یاد کرن کرن مری زندگی میں ہے ضوفگن
وہی ایک چہرہ چمن چمن سرِ دشت جاں ہے کھلا ہوا
سرِ راہ کچھ نہ پتا چلا وہ کہاں گیا وہ کدھر گیا
کہیں نقشِ پا تھا بنا ہوا کہیں نقشِ پا تھا مٹا ہوا
کروں دوستوں کو میں نذر کیا مرے پاس دام و درم کہاں
وہ جو دشمنوں کا حساب تھا وہ تو نقدِ جاں سے ادا ہوا
نہ کسی کی یاد کا نقش ہے نہ کسی کے رُخ کا یہ عکس ہے
یہ نہ کوئی حرف نہ لفظ ہے سرِ خاک کیا ہے لکھا ہوا
مجھے محسنؔ اس کا گلہ نہیں مجھے مال و زر جو ملا نہیں
جو ہنر سخن کا مجھے ملا وہ کہاں سبھی کو عطا ہوا

○

مرے قلم نے نہ باطل کا تذکرا لکھا
مآل کچھ بھی ہوا حرفِ حق سدا لکھا
وہ اک فریب تھا سجدہ جسے کہا اُس نے
وہ ایک عرضِ غرض تھی جسے دُعا لکھا
عجب ہے اس کی سیاست لکھا جبیں پہ کبھی
کبھی مٹا کے وہی نام زیرِ پا لکھا
پڑھا تو ایک ہی انداز سے پڑھا لیکن
اُسے لکھا تو سبھی نے جُدا جُدا لکھا
دلوں کے باب میں لفظِ جفا لکھا ہوتا
وہ ایک حرفِ غلط تھا جسے وفا لکھا
وہ حرف حرف تو محسنؔ ہے میری ہی تحریر
مٹاؤں کیسے خود اپنے ہی ہاتھ کا لکھا

مخمورؔ نوری دہلوی

معین الدین مخمورؔ نوری دہلی کی قدیم زردوز برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی پیشے سے وابستہ ہیں۔ ۲؍مئی ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوئے، برادری کی قدیم روایت کے مطابق زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی، لیکن صاحبِ مطالعہ ہیں اور شعروادب پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔

مشرقی دہلی میں خاص کر اترپردیش کے ضلع غازی آباد سے متصل دہلی کی نو آبادیوں میں شعری، ادبی نشستیں اور مشاعرے منعقد کرا کر اردو کی خاموش خدمت کر رہے ہیں۔

''سکوت کے بعد'' مخمورؔ نوری کا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۹۷ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

چپ رہنے سے ایسا ہوگا
تم کو دب کے رہنا ہوگا
بیکاری کی دھوپ میں اکثر
ایک پرندہ اڑتا ہوگا
خالی بیٹھے کہتے رہیے
جو بھی ہوگا اچھا ہوگا
آنکھوں کے مشکیزے کھولو
دریا پر تو پہرا ہوگا
دُکھنے لگیں گی آنکھیں مخمور
اتنی دور ستارا ہوگا

○

توبا ہوں میں دیکھا خواب
سستی آنکھیں مہنگا خواب
دریا ذریا تیرا خواب
ریت پہ اترا ڈوبا خواب
تم کو اپنا دیکھا ہے
میری مرضی میرا خواب
کوٹھی کاریں نوکر سب
ہوسکتا ہے اُلٹا خواب
میلا میلا گزرا دن
جب بھی دیکھا اُجلا خواب

○

دھوپ جمی ہے رستوں پر
چلتے ہیں انگاروں پر
اب کے رکھا صحرا نے
ریت کا مرہم چھالوں پر
پھول کی قربت مل جائے
نیند آجائے کانٹوں پر
پھول سمجھ کر بیٹھ گئی
تتلی تیرے ہونٹوں پر
اب کوئی بھی موسم ہو
برف جمی ہے رشتوں پر

○

سر پہ دھوپ کا نیزا اترا
رات کا جیسے نشہ اترا
پتے ٹوٹے شاخوں سے
شاید ایک پرندہ اترا
سرخ لہو نے گردش پائی
سورج قطرہ قطرہ اترا
مہنگی پڑے گی یہ ضد اس کو
وہ لشکر میں تنہا اترا
بوجھ تھا کیسا دیواروں پر
بوسیدہ تھا چھجہ اترا

○

ہر کسی سے ہو دوستی صاحب
ایسی کیا بے تکلفی صاحب

شوق تھا دن میں خواب دیکھیں گے
اڑ گئی شب کی نیند بھی صاحب

دھندلے پڑ جائیں گے حسیں چہرے
نہ ہو اتنی بھی روشنی صاحب

شام سے ہی چراغ جلنے لگے
ہے طبیعت بجھی بجھی صاحب

کھا گئی زندگی پرندے کی
ایک بچّے کی کنکری صاحب

میں نے ہی رات کے اندھیرے میں
نیکی دریا میں ڈال دی صاحب

رسوا کرتی ہے جا بجا اب تو
نامراد اپنی سادگی صاحب

اک فرشتے کو دیکھ کر گھر میں
بچّی چھوٹی تھی ڈر گئی صاحب

کرب صدیوں کے چھوڑ جاتی ہے
ایک لمحے کی دوستی صاحب

روز ہم کو بھی ہے کہاں فرصت
ملتے رہیے کبھی کبھی صاحب

○

کترا کے گزرتا ہے تو دیکھا نہیں جاتا
بستی میں غریبوں کی اُجالا نہیں ہوتا

دولت سے کہاں جڑتے ہیں ٹوٹے ہوئے رشتے
شیشے کو کبھی گوند سے جوڑا نہیں جاتا

اس جھوٹ کے بازار میں سچ ڈھونڈنے والے
سوکھے ہوئے کپڑے کو نچوڑا نہیں جاتا

پریوں کی حسیں بانہوں میں وہ جھول رہا ہے
سوتے ہوئے بچے کو جھنجوڑا نہیں جاتا

یہ چاند ستارے بھی ہیں سورج بھی ہے روشن
پھیلا ہے جو دنیا میں اندھیرا نہیں جاتا

صحبت میں بروں کی وہ رہا کرتا ہے مخؔور
اس بات پہ بیٹے کو نکالا نہیں جاتا

□□

مختار عثمانی (مخدوم زادہ)

مخدوم زادہ مختار عثمانی پرانی دہلی کے ایک معروف سیاسی اور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد جناب ڈاکٹر احمد حسن عثمانی صاحب جمعیۃ العلماء ہند کے اکابرین کے جلیس اور کانگریسی رہنماؤں کے حلیف تھے اور ہر جگہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے بڑوں کا تعلق پانی پت (ہریانہ) سے تھا لیکن مختار عثمانی ۱۶ر جون ۱۹۵۰ء کو یہیں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مختار عثمانی کے والد گرچہ ڈاکٹر تھے، سیاست اوڑھنا بچھونا تھی لیکن گھر کا ماحول بڑی حد تک مذہبی اور علمی تھا۔

مختار عثمانی نے گھر کے اس ملے جلے ماحول میں آنکھ کھولی، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ہائر سیکنڈری کیا اور والد کی روایتوں کو اپنانے کی بجائے شاعری کے کوچے میں نکل آئے اور جناب قیصر حیدری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ قیصر حیدری ایک گوشہ نشین شاعر تھے اور ان کا ترنم بسمل شاہجہاں پوری، علامہ انور صابری اور رام کرشن مضطر کی طرح بلند بانگ ترنم تھا۔ مخدوم زادہ مختار عثمانی بھی اپنے استاد کی طرح بلند ترنم کے مالک ہیں اور مشاعروں میں اپنے تن و توش اور بلند ترنم کی وجہ سے سامعین پر چھا جاتے ہیں۔ قیصر حیدری کی طرح مختار عثمانی کو بھی ادبی رسائل و جرائد میں چھپنے چھپانے کا شوق نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ شعر و شاعری کے سنجیدہ قارئین ان کی شاعری سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

دماغ کے کسی گوشے سے یاد تازہ کر
فروغِ ظلمتِ شب ہے ذرا اُجالا کر

نکل کے قلزمِ ہستی سے دیکھ آئینہ
کبھی تو اپنی حجابیتوں میں جھانکا کر

ہر ایک خوفِ حیات و ممات میں گم ہے
اے شب نگاہ طلوعِ سحر کو اِفشا کر

شکستہ پائی قسمت کا رونا دھونا کیا
برائے نام ہی اے دوست تانا بانا کر

عجب نہیں کہ ترا خود سے سامنا ہو جائے
جو اِس صدی کا تقاضا ہے اُس کو پورا کر

ہر اک نظر ہے یہاں ظرف آزما مختارؔ
قدم اُٹھانے سے پہلے قدم کو تولا کر

○

حسنِ خط شعار پذیرائی لے گیا
مجھ سے میرے خلوص کی سچائی لے گیا

اک دوسرے کو زخم دکھاتا نہیں کوئی
وہ جب سے اعتبارِ مسیحائی لے گیا

پہلے پہل ملا تو اکیلا کیا مجھے
جب یاد بن کے آیا تو تنہائی لے گیا

جتنی خوشی تھی میں نے زمانے کو بانٹ دی
خود اپنے گھر میں غم کی شناسائی لے گیا

مجبوریوں کا اُس کی کرے کون تجزیہ
جو اپنے ساتھ وقت کی رُسوائی لے گیا
شب آشنا تھے لاتے کہاں تابِ روشنی
''سورج تمام شہر کی بینائی لے گیا''
مختار تابِ جنبشِ لب بھی کہاں ہے اب
وہ کیا گیا کہ قوتِ گویائی لے گیا

○

مرے خدا یہ مری ذات پر کرم کردے
دیارِ زیست میں اب بے نیازِ غم کردے
کسی بھی دل میں نہ ہوں بدگمانیاں پیدا
تعلقات کو اس درجہ محترم کردے
ملی حیات ہمیں ایسا حادثہ بن کر
وہ حادثہ جو پہاڑوں کی آنکھ نم کردے
حصارِ تیرہ شبی سے نکال دے منزل
چراغِ شوق فروزاں قدم قدم کردے
ستم پرست بہت ہے مزاجِ اہلِ نظر
حصولِ فن بھی کرے ہاتھ بھی قلم کردے
دعائے خیر ہی لب پر رہے سدا مختار
وہ جو بھی چاہے بیک جنبشِ قلم کردے

○

آنسوؤں کی ہاتھ پر تحریر لے کر آئی ہے
یعنی اب میری دعا تاثیر لے کر آئی ہے
خوب ہے جبرِ مشیت میری مرضی کے خلاف
پھر اُسی کے رو برو تقدیر لے کر آئی ہے

ہے ولی جیسا ہی وہ بھی شاعری کا شیفتہ
جس کو دلی میں تلاشِ میر لے کر آئی ہے

آرزو حسرت تمنا خواہشیں امید خواب
زندگی ترکش میں کیا کیا تیر لے کر آئی ہے

اب کہاں گمنام ہیں مختار اپنے شہر میں
ان کی نسبت ہر طرف تشہیر لے کر آئی ہے

○

یہ سمجھ لو ناشناسِ رہِ منزلِ وفا ہے
"جو قدم قدم پہ پوچھے ابھی کتنا فاصلہ ہے"

مری تشنگی کی شدت کی یہ انتہا ہے شاید
کہ سمندروں کا دامن مرے گھر سے آملا ہے

میرے گھر میں آگ رکھ دو مجھے بے وفا بنا دو
کسی سرد مصلحت نے مجھے برف کر دیا ہے

یہ کرم نہیں تو کیا ہے میرے دستِ نارسا میں
میرے پاس جو بھی کچھ ہے ترا فیض ہے عطا ہے

بڑا مطمئن تھا قاتل کہ نہیں تھا کوئی شاید
اسے یہ خبر نہیں تھی کہ لہو بھی بولتا ہے

○

وہ عالم ہے قضا کا سامنا ہے
کسے معلوم یہ وقتِ دعا ہے

نظر افروز ہے دلکش فضا ہے
غزل کا روپ بھی بدلا ہوا ہے

خدایا خیر عشقِ محترم کی
ندی کا زور ہے کچّا گھڑا ہے
ضرورت ہے ہمیں ہر لمحہ جس کی
اُسی سے رابطہ ٹوٹا ہوا ہے
دعائیں سبز سایہ بن چکی ہیں
درخت اب اتنا بوڑھا ہو چکا ہے
سحر کی آرزو میں سونے والا
مسافر رات بھر جاگا رہا ہے

نہیں مختار مجھ کو فکرِ دنیا
دعا ہے آپ کی فضلِ خدا ہے

□□

مخمور جالندھری

گوربخش سنگھ مخمور جالندھری گرچہ شاعری میں حضرتِ دل شاہجہاں پوری اور جناب سیماب اکبرآبادی جیسے روایت پرست غزل گو اساتذہ کے شاگرد تھے لیکن بہ اعتبارِ رنگِ سخن ان کی شاعری کو ان معتبر و مستند اساتذہ سے برائے نام بھی نسبت نہیں تھی۔ کلاسیکی رنگ و آہنگ کے ان نقیب اساتذہ سے انھوں نے شعری اصلاح یقیناً لی لیکن اپنے لیے نئی راہ پیدا کی اور غیر منقسم ہندوستان میں وہ ایک نظم گو شاعر کے روپ میں ابھرے اور خوب شہرت پائی۔ اس زمانے میں یعنی تقسیمِ ہند سے قبل اردو کا شاید ہی کوئی ایسا ادبی جریدہ ہو جس میں مخمور جالندھری کی نظمیں شائع نہ ہوتی ہوں۔ اس زمانے میں مخمور جالندھری کا شمار اردو زبان کے ان شاعروں میں ہوتا تھا جنھوں نے اردو نظم کو تجرباتی تخلیقی تازکاری کی ایک ایسی جہت اور خصوصیت سے روشناس کرایا جو اردو کی شعری روایت کے تعلق سے منفرد حیثیت رکھتی تھی۔

نظم گوئی میں انفرادیت کی وجہ سے مخمور کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی نظموں کے تین مجموعے ''جلوہ گاہ''، ''تلاطم'' اور ''مختصر نظمیں'' تواتر کے ساتھ منظرِ عام پر آئے اور اردو دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ مخمور ایک نظم گو شاعر کے طور پر مشہور تھے لیکن انھوں نے غزل، گیت اور سانیٹ میں بھی طبع آزمائی کی اور بچوں کے لیے بھی نظمیں سپردِ قلم کیں جو

"پھلجھڑیاں" کے نام سے شائع ہوئیں۔

عجب المیہ ہے کہ نظم گوئی میں مسلمہ حیثیت کا مالک یہ شاعر تقسیمِ وطن کے بعد یکسر نظر انداز اور فراموش کر دیا گیا اور ان کی شاعری قصۂ پارینہ بن گئی۔ یکسر نظر انداز اور فراموش کیے جانے کے نتیجے میں مخمّور جالندھری کا شعری و ادبی وجود قلمی ناموں سے جاسوسی ناول نگاری کرنے اور روزنامہ "ملاپ" کی صحافتی ذمہ داریوں کو نباہنے کی نذر ہو گیا۔ اردو اکادمی، دہلی نے مخمّور جالندھری کی بازیافت کرنے کے لیے ان کا ایک مختصر سا شعری انتخاب کیا جسے جناب بلراج کومل نے ۱۹۹۵ء میں مرتب کیا۔

مخمّور کا انتقال یکم جنوری ۱۹۷۹ء کو تقریباً چونسٹھ سال کی عمر میں دہلی میں ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

سجدے جبینِ شوق کے اب رائیگاں نہیں
تو بے حجاب انجمن آرا کہاں نہیں

میں میرِ کارواں ہوں پسِ کارواں نہیں
ہاتھوں میں میرے دامنِ منزل کہاں نہیں

موجودگیِ جنت و دوزخ سے ہے عیاں
رحمت ہے ایک بحر مگر بیکراں نہیں

چاہے حجاب میں رہو تو چاہے بے حجاب
ہم تم ہی تو ہیں اور کوئی درمیاں نہیں

برقِ جمالِ دوست نہ ہو اس پہ شعلہ زن
تیرا بھی گھر ہے صرف میرا آشیاں نہیں

دلچسپیاں بہت سی ہیں اس اختصار میں
کچھ غم نہیں شباب اگر جاوداں نہیں

ساکت فلک کو مفت میں ظالم بنادیا
گردش میں ہے زمین فقط آسماں نہیں

ناکام تر ہیں میری شکستہ نصیبیاں
مخمورؔ صرف زیست ہی ناکامراں نہیں

○

پابندِ احتیاطِ وفا بھی نہ ہو سکے
ہم قیدِ ضبطِ غم سے رہا بھی نہ ہو سکے

دار و مدارِ عشق وفا پر ہے ہم نشیں
وہ کیا کرے کہ جس سے وفا بھی نہ ہو سکے

گو عمر بھر نہ مل سکے آپس میں ایک بار
ہم ایک دوسرے سے جُدا بھی نہ ہو سکے

جب جزو کی صفات میں کُل کی صفات ہیں
پھر وہ بشر ہی کیا جو خُدا بھی نہ ہو سکے

یہ فیضِ عشق تھا کہ ہوئی ہر خطا معاف
وہ خوش نہ ہو سکے تو خفا بھی نہ ہو سکے

وہ آستانِ دوست پر کیا سر جھکائے گا
جس سے بلند دستِ دعا بھی نہ ہو سکے

یہ احترام تھا نگہِ شوق کا جو تم
بے پردہ ہو کہ جلوہ نما بھی نہ ہو سکے

مخمورؔ کچھ نہ پوچھیے مجبوریٔ حیات
اچھی طرح خرابِ فنا بھی نہ ہو سکے

خبریں

آج دلچسپ ہیں اخبار کی تازہ خبریں
''گوجرانوالے'' کے اک شیر علی گوجر نے
کاٹ دی ناک گنڈاسے سے جواں بیوی کی
''ایبٹ آباد'' کی ندی میں کل اتوار کے روز
ایک عورت کی گلی اور سڑی لاش ملی
دن دہاڑے ہی ''جڑانوالے'' میں اک ڈاکہ پڑا
پرسوں شنگھائی میں دو مرتبہ بمباری ہوئی
یہ بتاؤ مجھے، کیوں ناک سکوڑی تم نے؟
کیا سمجھتی ہو کہ جھوٹی ہیں یہ تازہ خبریں
اور ایک آنہ یونہی ضائع کیا کرتا ہوں
ہنسے جاتی ہو یونہی اتنی سمجھ بھی ہے تمھیں
واقعات ایسے کہیں روز ہوا کرتے ہیں؟
زندگی کے یہ مہیب اور جنوں کار افعال
آئے دن تو نہیں اس دہر میں سرزد ہوتے
کیا سمجھتی نہیں تم قابلِ داد ان کا جنوں؟
جو حوادث کی بلاؤں کے تھپیڑے کھا کر
قتل و غارت کے ان اقدام پہ تُل جاتے ہیں
انھی لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں یہ خبریں

پھر اسی طوفان میں

ساز کے سہمے ہوئے، ٹھٹھرے ہوئے تاروں پر
انگلیوں کے یہ چھلکتے ہوئے مضراب پڑیں
ٹھہری ٹھہری ہوئی خاموش فضا میں پھر سے
رقص کرتے ہوئے اجسام کے گرداب پڑیں
بھر کے رکھ دو مرے ساغر میں لپکتا پانی
پاؤں تخیلِ سبک رو کے ذرا شل ہو جائیں
کیف سے بھیگ کے پلکیں ذرا بوجھل ہو جائیں
روحِ مسموم میں نغمے بھی ذرا حل ہو جائیں
ساز کے پردوں میں ڈُبکی ہوئی تانیں نکلیں
ڈگمگاتے ہوئے کولھوں کو مچلنے دو ذرا
ان تھرکتے ہوئے جسموں کے سمن زاروں میں
روکی تھامی ہوئی نظروں کو ٹہلنے دو ذرا
میری مغموم جوانی کو بہلنے دو ذرا

عرصۂ زیست کا جانباز سپاہی ہوں میں
میں نے ہر ہر قدم اک دادِ شجاعت دی ہے
وقت کے افسرِ جابر نے مجھے خوش ہوکر
چند لمحوں کے لیے مہلتِ عشرت دی ہے
میری یہ فرصتِ کم عمر نہ غارت ہو جائے
مجھ پہ ظاہر نہ ہو یہ بات کہ میری ہی طرح
دل گرفتہ ہو سیہ بخت ہو، برباد ہو تم
ساز کی گونج سے اور رقص کے عالم نے مجھے

شک نہ ہونے دو کہ نغمہ نہیں فریاد ہو تم
جانے پھر کب مجھے فرصت ہو فراغت ہو مجھے
تازہ دم ہو کے مجھے جانا ہے ان راہوں میں
جن میں الجھا ہوا مشکل سے کوئی لوٹتا ہے
جیسے تدبیر مشیّت کی کڑی بانہوں میں

جو کبھی پھر ملی فرصت تو ضرور آؤں گا
اس طرب گاہ سے دو چار ہی قدموں پہ تو ہے
عرصۂ زیست مری رزمگہِ کرب و بلا
سنگِ در سے میں گزرتے ہی پہنچ جاؤں گا
رقص کرتے رہو گاتے رہو یونہی میں چلا

قناعت

مسلّط تجھ پہ ہے اک غلبۂ واماندگی جیسے
فضا بے ہوش ہو جاتی ہے آندھی کے گزرنے پر
بگڑتی جا رہی ہے پیکرِ مرمر کی زیبائش
کنارے کا ہو جیسے گاؤں دریا کے اترنے پر
نگاہوں کے لیے تخریب منزل ہو نہیں سکتی
کبھی دیکھا ہے مرجھائے ہوئے پھولوں پہ بھونروں کو
بیاباں میں بھی کوئی مرمریں ایواں بناتا ہے؟
کسی اندھے کنوئیں پر بھی کبھی دیکھا ہے پیاسوں کو
کوئی لاشوں کے خدّ و خال کے بھی گیت گاتا ہے؟

بہاریں گلستاں ہی دعوتِ گلگشت دیتے ہیں
مصائب کی ، حوادث کی تمنّا کون کرتا ہے

سکوں، حسن اور عظمت ہی دلوں کی آرزوئیں ہیں
کوئی اپنی خوشی سے بھی ستم سہتا ہے مرتا ہے
میں اکثر سوچتا ہوں لاش سے چمٹا رہوں کب تک
ترے اس دامنِ صد چاک میں سمٹا رہوں کب تک
میں اکثر سوچنے لگتا ہوں ان تاریک راتوں میں
تجھے تیرے مقدر کے حوالے کیوں نہ کر جاؤں
اور اپنے آپ کو میں سونپ دوں قسمت کے ہاتھوں میں
یہ رخصت ڈھال تو لے گی مقدر کے نئے راستے
بنے گا کیا جو یہ بھی راستے دشوار تر نکلے
مقدر کا بھروسہ کیا یہ راس آئے نہ راس آئے
سفر پر جب کبھی نکلے ہمیشہ سوچ کر نکلے

کبھی پوری ہوئی ہیں رات کی سوچی ہوئی باتیں
دلائل بھی کبھی آمادۂ اقدام ہوتے ہیں
کہاں جاؤں گا، میرا دم تری بانہوں میں نکلے گا
انھیں بانہوں میں جو سرچشمۂ آرام ہوتی ہیں
جو فرحت بخش، جو غارت گرِ آلام ہوتی ہیں

کم نگاہی

مڑ کے دیکھتا ہوں میں
زندگی کی رزم گاہ سرد اور بجھی ہوئی
جیسے ایک بیسوا رات کی تھکی ہوئی

ہو پلنگ پر اداس، نیم جاں پڑی ہوئی
کوئی کش مکش نہیں، کوئی جستجو نہیں
اب تو دور دور تک حشرِ ہاؤ ہو نہیں
'چار سو نگاہ میں' سوکھے سوکھے جسم ہیں
موت کی جبیں پہ ہیں یا کریہہ تیوریاں
چار سو نگاہ میں ہڈیوں کے ڈھیر ہیں
آج بھی جھلکتے ہیں جن سے بھوک کے نشاں
زندگی گراں رہی، موت رائیگاں گئی
سیر ہو کے جا رہے ہیں گدھوں کے کارواں
میرے ہم سفر تمام سادگی شعار تھے
رنج کے شکار تھے، غم سے دل فگار تھے
پھر بھی مطمئن رہے، کتنے وضع دار تھے
وہ پڑی ہے ناظمہ، وہ مری رفیق کار
وہ مری شریکِ غم زیست کی شگفتگی
سچ کہ غم زدہ رہی فاقہ کش رہی مگر
بھیڑیوں کے واسطے، تر نوالہ ہی رہی
اُس کا جسم ڈھانپ دوں کہ ہر برہنگی یہاں
اس فریب زار میں ناپسند کی گئی
حالتِ ستم نصیب دیکھتا نہیں کوئی
کیوں ہوا کوئی غریب دیکھتا نہیں کوئی
اور حقائق مہیب دیکھتا نہیں کوئی
باغ دیکھتے ہیں سب، راغ دیکھتے نہیں
چاند دیکھتے ہیں سب، داغ دیکھتے نہیں

سوکھے ہوئے پتّے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا نگہِ آوارہ
دور و نزدیک کا کرتی ہوئی سرعت سے طواف
آج کیوں بوڑھے سے اک پیڑ پہ ستاتی ہے
کھوکھلا، بوڑھا سا، بیڈول سا، مریل سا درخت
بڑی مشکل سے جو کاٹے گا بس ایک اور خزاں
کتنے ہمدرد، وفادار ہیں سوکھے پتّے
پیڑ کے بازوؤں سے چمٹے ہوئے ہیں جو ہنوز
جن کا انجام ہے بس ایک ہوا کا جھونکا
تازگی چاہے کسی چیز میں ہو نعمت ہے
اِنھیں پتّوں کو تھپکتے تھے ہوا کے ریلے

جانے کیوں یاد دلاتے ہیں یہ سوکھے پتّے
مجھے ماضی کے صحیفے کے مصور اوراق
نقش ہیں ذہن و تصور پہ مرے جن کے حروف
جن کی دم توڑتی کجلائی ہوئی تابانی
اب بھی تنہائی کی راتوں میں بھڑک اٹھتی ہے
کبھی تنہائی کی راتیں بھی تھیں شاداب و جمیل
جن میں اب رنگ و ضیا کا نہیں پرتو کوئی
آج ماضی کی ہر اک تابش و رنگینی پر
وقت کے ہاتھ میں اک عرصے سے مصروفِ ستم
چند سال اور بس اب کاٹے گا مشکل سے شباب
اب مری شاخِ تمنا میں ہیں سوکھے پتّے

جن کے جھرمٹ میں نہیں خرمنِ ہستی محفوظ
جانے کیوں پھر بھی ہے لپٹا ہوا ماضی مجھ سے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا فلکِ سیر نگاہ
آج کیوں بوڑھے سے اک پیڑ پہ ستاتی ہے

□□

مخمور دہلوی

کہا جاتا ہے پچھلے زمانے میں شعرفہم اور سخن سنج حضرات میر تقی میر کی غزلیں اور اشعار اپنے دوستوں کو تحفے میں بھیجا کرتے تھے اور یوں میر کے اشعار سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے اور شہر شہر، قریہ قریہ مسافتیں طے کرتے تھے، یہ ماضی بعید کی بات ہے لیکن گزشتہ صدی کے پانچویں دہے کے ابتدائی سالوں میں یعنی تقسیمِ وطن کے آس پاس میر و غالب کے اس شہر میں سخن فہمی کی تاریخ نے اپنے آپ کو دوہرایا اور وحیدالعصر سید وحیدالدین بیخود دہلوی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، علامہ تربھون ناتھ زار دہلوی، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی اور تلوک چند محروم جیسے مستند و معتبر اور قادرالکلام شعراء کی موجودگی میں یہاں کے شعری منظر نامے پر ایک ایسا شاعر ابھرا جو دیکھتے ہی دیکھتے سخن فہموں کے دل کی دھڑکن اور مشاعروں کے لیے لازم و ملزوم بن گیا۔ جس کے مائک پر آتے ہی مشاعرہ گاہ میں تالیاں بجنے لگتیں، سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے اور مشاعرے میں جان سی پڑ جاتی، داد و ستائش کا ریلا مشاعرہ کو بہالے جاتا، سننے والے داد دیتے ہوئے نہ تھکتے اور اگلے دن ان اشعار کی بازگشت سارے شہر میں سنائی دیتی۔ شاعری کے رسیا بڑے اہتمام سے ان غزلوں اور شعروں کی نقلیں تیار کرتے اور اپنے دور دراز کے دوستوں کو تحفے میں بھیجتے۔ بلند قامت شعراء کی موجودگی میں یہ عوامی مقبولیت "تانہ بخشد خدائے بخشندہ" کی مظہر تھی جو دلّی میں مخمور دہلوی کے علاوہ آج تک کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔

فضل الٰہی مخمورؔ ۷ ؍نومبر ۱۹۰۱ء میں حاجی انوار احمد کے گھر دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا محبوب الٰہی صاحب ہیروں کے سوداگر تھے اور اچھے جی کے لقب سے مشہور تھے۔ باڑہ ہندوراؤ کا محلّہ باغیچی اچھے جی اُن ہی کے نام سے موسوم ہے۔ آسودہ حال خاندان کا فرد ہونے کے باوجود گھریلو تنازعات اور مناقشوں کی وجہ سے مخمورؔ صاحب نے تنگدستی میں آنکھ کھولی، ہوش سنبھالا اور زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ نامساعد حالات کی وجہ سے گرچہ وہ صرف نویں دسویں جماعت تک ہی تعلیم حاصل کرپائے لیکن مطالعے، مشاہدے اور تجربے نے تعلیم کی اس کمی کی تلافی کردی تھی۔ مذہب سے شغف اور دِلی لگاؤ، تصوف سے گہری دلچسپی، دیگر مذاہب کے تصورات ونظریات کے مطالعہ اور واقفیت نے ان میں وہ سب کچھ پیدا کردیا تھا جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیت کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے اور اسے عام انسانوں سے ممیّز کرتا ہے۔

مبدائے فیاض نے مخمورؔ دہلوی کو شعر گوئی کی صلاحیتیں ودیعت کرتے ہوئے کافی فیاضی سے کام لیا تھا اور حضرت بیخودؔ دہلوی جیسے قادرالکلام شاعر اور مسلم الثبوت استاد کی شعری تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا لیکن مخمورؔ دہلوی کی شاعری کا سورج تقسیمِ وطن کے ہنگاموں کے بعد ہی چمکا جب انھوں نے ۱۹۵۱ء میں پٹودی سے دلّی مراجعت کی، اس وقت ان کی عمر اکیاون باون سال تھی اس وقت تک شعروادب کی دنیا میں ان کے نام سے کوئی آشنا نہیں تھا۔ پٹودی ایک چھوٹی سی سوتی جاگتی ریاست تھی جہاں علمی، ادبی، شعری اور ثقافتی سرگرمیوں کا فقدان تھا۔ مخمورؔ دہلوی نواب پٹودی کے ملازم تھے اور ان کی شاعری نواب کی مصاحبت میں گہنائی ہوئی تھی ورنہ ان کی شاعری اور ترنم کی خوشبو یوں چھپی نہ رہتی اور مخمورؔ صاحب کو بہت پہلے ہندوستان گیر شہرت کا شاعر ہونا چاہیے تھا۔ عوامی محسوسات و جذبات کی آئینہ دار اس شاعری کو جب دلّی کی شعری و ادبی دنیا کا کھلا ہوا آسمان نصیب ہوا تو مخمورؔ دہلوی کی شہرت پر لگا کر پورے ملک میں پھیل گئی۔ مخمورؔ صاحب گرچہ خالص دلّی والے تھے لیکن ان کی زندگی کا بڑا حصہ دلّی سے باہر گزرا۔ ۱۹۵۱ء میں اپنے مولد میں واپس آنے کے بعد مخمورؔ صاحب جتنی تیزی کے ساتھ یہاں کے ادبی منظرنامے پر ابھرے، مشاعروں کے لیے ناگزیر بنے، شہرت ومقبولیت پائی، موت نے

اسی تیزی کے ساتھ ۲۶ رفروری ۱۹۵۶ء کو ان کو ماضی کا ایک ورق بنا دیا۔ مخمورؔ صاحب اردو دنیا کے واحد شاعر ہیں جن کو صرف چار سال کے قلیل عرصہ میں وہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی جو دوسرے شعراء کو برسوں کی ریاضت اور سینکڑوں مشاعرے پڑھنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی۔

مخمورؔ دہلوی کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے آسان، سہل، سادہ، صاف و شفاف اور کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی اور روزمرہ و محاورے سے بجی ہوئی زبان میں اپنے افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے یہاں بوجھل ترکیبیں، مشکل مفاہیم، پیچیدہ مضامین، عطف و اضافت کی بھرمار نہیں ہے۔ ان کی شاعری ان کے دل کی آواز ہے جو عوام و خواص پر آج بھی یکساں اثر کرتی ہے۔ سامع اور قاری کو مخمورؔ کی شاعری میں اپنی ہی زندگی کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں بالفاظِ دیگر انھوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا تھا اور یہی ان کی مقبولیت کی اساس تھی۔

مخمورؔ دہلوی کا پہلا مجموعہ ''بادۂ مخمور'' ان کی حیات ہی میں شائع ہو کر مقبولیت کی حدیں پار کر گیا تھا۔ دوسرا مجموعۂ کلام ''عرفانِ مخمور'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ ''کلیاتِ مخمور'' میں مذکورہ بالا دونوں مجموعوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

مخمورؔ صاحب کے سینکڑوں اشعار آج بھی لوگوں کو ازبر ہیں لیکن درجِ ذیل شعر مختلف ناموں سے منسوب ہوتا ہوا ہندوستان و پاکستان کے شعرفہم حلقوں میں آج بھی سفر کر رہا ہے:

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے

نمونۂ کلام:

غزل

محبت میں شبِ تاریک ہجراں کون دیکھے گا
ہمیں دیکھیں گے یہ خوابِ پریشاں کون دیکھے گا

اِن آنکھوں سے تجلی کو درخشاں کون دیکھے گا
اٹھا بھی دو نقابِ روئے تاباں کون دیکھے گا

یہی اک رات ہے بس کائناتِ زندگی اپنی
سحر ہوتی ہوئی اے شامِ ہجراں کون دیکھے گا

چمن میں گر رہی ہیں بجلیاں شاخِ نشیمن پر
یہاں تک اپنی بربادی کا ساماں کون دیکھے گا

بسانا ہی پڑے گا اِک نہ اِک دن خانۂ دل کو
بنے پھرتے ہو یوسف شامِ زنداں کون دیکھے گا

حقیقت میں تقاضا بھی یہی ہے پردہ داری کا
رہو تم آنکھ کے پردوں میں پنہاں کون دیکھے گا

کچھ ایسا ہو دمِ آخر نہ آئیں وہ عیادت کو
انھیں اپنے کیے پر یوں پشیماں کون دیکھے گا

مجھی پر آئے گا الزام میری پائمالی کا
تری رفتار کو اے فتنہ ساماں کون دیکھے گا

جو غنچے کل کھلے تھے آج وہ مرجھائے جاتے ہیں
مری نظروں سے رنگِ بزمِ امکاں کون دیکھے گا

یہی اب بھی صدائیں وادیٔ ایمن سے آتی ہیں
کہاں ہیں طالبِ دیدار جاناں کون دیکھے گا

نفس کے ساتھ ہی قیدِ تعلق ٹوٹ جاتی ہے
پلٹ کر پھر سوئے گورِ غریباں کون دیکھے گا
عذابِ حشر سے تو کیوں ڈراتا ہے مجھے واعظ
تجھے معلوم بھی ہے فردِ عصیاں کون دیکھے گا
یہ دنیا ہے ہنسا کرتی ہے اوروں کی مصیبت پر
ترا رونا یہاں اے چشمِ گریاں کون دیکھے گا
چلو مخمور تنہائی میں شغلِ میکشی ہوگا
چھپا کر لے چلو پینے کا ساماں کون دیکھے گا

○

کسی سے میری منزل کا پتا پایا نہیں جاتا
جہاں میں ہوں فرشتوں سے وہاں جایا نہیں جاتا
کسی صورت جہانِ ہوش میں آیا نہیں جاتا
مرے سر سے جنونِ عشق کا سایا نہیں جاتا
دوئی کا تذکرہ توحید میں پایا نہیں جاتا
جہاں میری رسائی ہے مرا سایا نہیں جاتا
مری گم گشتگی دیکھو اب اپنی جستجو میں ہوں
اُنھیں کھویا ہے جب سے آپ کو پایا نہیں جاتا
مرے ٹوٹے ہوئے پائے طلب کا مجھ پر احساں ہے
تمھارے در سے اُٹھ کر اب کہیں جایا نہیں جاتا
محبت ہو تو جاتی ہے محبت کی نہیں جاتی
یہ شعلہ خود بھڑک اٹھتا ہے بھڑکایا نہیں جاتا
دمِ آخر مرا تارِ نفس بھی درسِ عبرت ہے
کچھ اس صورت سے الجھا ہے کہ سلجھایا نہیں جاتا

فقیری میں بھی مجھ کو مانگنے سے شرم آتی ہے
سوالی ہو کے مجھ سے ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا
چمن تم سے عبارت ہے بہاریں تم سے زندہ ہیں
تمھارے سامنے پھولوں سے مرجھایا نہیں جاتا
وہ دل تفویض کیجیے جو دو عالم سے ہو مستغنی
وہ دامن چاہیے مجھ کو جو پھیلایا نہیں جاتا
ہر اک داغِ تمنا کو کلیجے سے لگاتا ہوں
کہ گھر آئی ہوئی دولت کو ٹھکرایا نہیں جاتا

○

شمع سے یہ کہہ رہی ہے خاکِ پروانہ ابھی
رات آخر ہوگئی باقی ہے، افسانہ ابھی
ختم ہوجائے گی اس کے بعد تفسیرِ حیات
زندگی کہنے کو ہے اک اور افسانہ ابھی
بال تو آہی گیا اب ٹوٹنے کی دیر ہے
اور اک صدمے کا ہے محتاج پیمانہ ابھی
قید پینے کی نہیں۔ پی کر بہکنا جرم ہے
ہم نے سمجھا ہی نہیں دستورِ میخانہ ابھی
آج تو شاید تھکے ہاروں کی منزل آگئی
اور تھوڑی دور چل اے عزمِ مردانہ ابھی
اس کے ہاتھوں سے کہیں دامن چھڑایا جائے گا
تم نے دیکھا ہی نہیں ہے کوئی دیوانہ ابھی
دیکھ اے رہرو پہنچنا ہے حریمِ ناز تک
کعبہ روکے گا تجھے روکے گا بُت خانہ ابھی

ذہن میں اب بھی ابھر آتے ہیں دیرینہ نقوش
ہنستے ہنستے رو لیا کرتا ہے دیوانہ ابھی
تو غمِ دنیا سے اے مخمورؔ گھبراتا ہے کیوں
تیری جانب ہے نگاہِ پیرِ میخانہ ابھی

○

چنا تھا اُن کی محبت نے آزما کے مجھے
سپردِ خاک کیا آدمی بنا کے مجھے
میں اپنے دل میں خود اپنی وفا پہ نادم ہوں
انھیں خوشی نہ ہوئی خاک میں ملا کے مجھے
لگی ہیں اور لگاتی ہے خاکِ پروانہ
مآلِ سوزِ محبت دکھا دکھا کے مجھے
یہ میرے دردِ تمنا کی آزمائش ہے
قفس میں چھوڑ دیا گلستاں سے لا کے مجھے
وہ بزم اور مرے بعد جگمگا اُٹھی
بہت چراغ جلائے گئے بجھا کے مجھے
نیاز مند ہوں طوفِ حرم بھی کر لوں گا
جو وقت مل گیا سجدوں سے نقشِ پا کے مجھے
بڑا کرم ہو جو ایسے میں یاد آجاؤ
ستا رہے ہیں بہت نقش ماسوا کے مجھے
یہ ایک دن کا نہیں عمر بھر کا رونا ہے
خدا کے واسطے دیکھو نہ مسکرا کے مجھے
فروغ دیں گے کبھی شمعِ انجمن کی طرح
ابھی تو دیکھ رہے ہیں جلا جلا کے مجھے
مُدام رہتا ہے مخمورؔ کیف کا عالم
کرم کیا مرے ساقی نے مے پلا کے مجھے

○

محبت اہتمامِ دار بھی ہے
محبت مصر کا بازار بھی ہے
محبت مستقل آزار بھی ہے
یہ گلشن وادیٔ پُرخار بھی ہے
وہ طوفاں جو ڈبو دیتا ہے اکثر
اسی طوفاں سے بیڑا پار بھی ہے
خودی کی حد میں ہے مجبور انساں
خودی مٹ جائے تو مختار بھی ہے
حریمِ دل میں بھی ہے جلوہ فرما
مرا یوسف سرِ بازار بھی ہے
نہ کیوں مر جایئے مرنے سے پہلے
یہی ہونا مآلِ کار بھی ہے
مرا چاکِ گریباں سینے والے
یہ دل میں زخم دامن دار بھی ہے
زمانے کو شکایت ہے وفا کی
زمانہ خود وفا بیزار بھی ہے
مری ناکامیاں شاہد ہیں اس کی
میں اب سمجھا کہ تو مختار بھی ہے
مرے دل کی تمنائیں نہ پوچھو
یہ ناداں عافیت بیزار بھی ہے
کوئی حد بھی وفا کے امتحاں کی
ستانے کا کوئی معیار بھی ہے

یہ کہتی ہے صدائے لن ترانی
کسی میں طاقتِ دیدار بھی ہے
نہیں بہکا کبھی مخمور پی کر
یہ دیوانہ بھی ہے ہُشیار بھی ہے

○

رُخ ہر اک تیرِ نظر کا ہے مرے دل کی طرف
آنے والے آ رہے ہیں اپنی منزل کی طرف

ڈوبنے والے کی مایوسی پہ دل تھرّا گیا
کس نگاہِ یاس سے دیکھا تھا ساحل کی طرف

جمع خرمن کو کیا تھا بجلیوں کے واسطے
خاک کا اک ڈھیر تھا دیکھا جو حاصل کی طرف

سچ ہے اک اجڑی ہوئی دنیا کے کیا لیل و نہار
تم سے بھی اب تو نہ دیکھا جائے گا دل کی طرف

اک [illegible] اپنی منزل پر پہنچ لیں گے ضرور
جو قد [illegible] آسانی سے مشکل کی طرف

کس [illegible] حاطری سے رات بھر جلتی رہی
دیر تک دیکھا کیے ہم شمعِ محفل کی طرف

میری ہمت نے سہارا لے لیا طوفان کا
ناخدا کشتی کو اب لے جائے ساحل کی طرف

تم کو کیا معلوم کیا بنتی ہے دل پر عشق میں
آئینہ لے کر ذرا دیکھو مقابل کی طرف

ناخدا پر ہنسنے والو یہ خدا کا کام ہے
ڈوبنے والے بھی آ جاتے ہیں ساحل کی طرف

سچ تو یہ ہے بے طلب دیتے ہیں اربابِ کرم
جو سخی ہیں خود چلے آتے ہیں سائل کی طرف

ہوگیا مخمورؔ رازِ زندگی کا انکشاف
موج آتی ہے فنا ہونے کو ساحل کی طرف

□□

مخمور سعیدی

انیس سو چون پچپن کے آس پاس دہلی کی شعری و ادبی نشستوں اور مشاعروں میں شعر سنانے والے دراز قد شاعر مخمور سعیدی کے بارے میں یہ کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ دُبلا پتلا شاعر دہلی کے ادبی منظرنامے پر شاعری کی مسند سنبھالے گا اور اردو دنیا میں ایک بلند قامت اور معتبر شاعر بن کر ابھرے گا۔

مخمور سعیدی جن کا خاندانی نام سلطان محمد خاں ہے ۳۱/دسمبر ۱۹۳۸ء کو سابق نوابی ریاست ٹونک کے ایک علم پرور [illegible] انے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آخون زادہ احمد خاں صاحب نازش خود ایک ا[illegible] رہتے اور عربی، فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت ٹونک ہی میں ہوئی، گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور کچھ کر گزرنے کی خواہش چودہ پندرہ برس کے محمد سلطان خاں کو دہلی لے آئی۔ اس زمانے میں جناب بسمل سعیدی ٹونک سے دہلی ہجرت کر چکے تھے اور یہیں مستقل رہائش پذیر تھے۔ چنانچہ سلطان محمد خاں نے جواب مخمور سعیدی بن چکے تھے ۱۹۵۴ء میں بسمل صاحب کی سرپرستی میں شہرِ میر و غالب میں زیرو پوائنٹ سے اپنی عملی زندگی اور ادبی سفر کا آغاز کیا اور ایک بے مثال مستقل مزاجی، عزم و لگن اور آہستہ روی سے آسودہ حالی، ادبی شہرت و مقبولیت اور ان سماجی و سرکاری مراتب کو پالیا جس کا ایک شاعر

تصور بھی نہیں کرسکتا۔

مخمور سعیدی نے ادبی صحافت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور آج بھی ادبی صحافت سے وابستہ ہیں۔ تقریباً ۲۵ برس ''تحریک'' جیسے ادبی ماہنامے سے وابستہ رہے۔ آنجہانی گوپال متل صاحب کی ادارت اور مخمور سعیدی کی معاونت میں ''تحریک'' نے ترقی پسندی کے رد اور جدیدیت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور ادبی تاریخ مرتب کی۔ گوپال متل صاحب کے سورگ باش ہونے اور 'تحریک' کے بند ہونے کے بعد مخمور نے ایک نوزائیدہ ماہنامے ''گلفشاں'' کی ادارت سنبھالی۔ یہ ماہنامہ زیادہ عرصے جاری نہیں رہ سکا۔ ''گلفشاں'' کے قصۂ پارینہ ہوجانے کے بعد مخمور سعیدی دہلی سے شائع ہونے والے بہت سے ادبی، نیم ادبی، فلمی اور سماجی ماہناموں اور ہفت روزہ اخبارات سے وابستہ رہے جن میں ''بیسویں صدی''، ''فلمی ستارے''، ''نگار''، ''ایشیا'' اور ہفت روزہ ''ہماری زبان'' شامل ہیں۔ اردو اکادمی، دہلی کے قیام کے بعد اکادمی کے ماہانہ رسائل ''ایوانِ اردو'' اور ''امنگ'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

مخمور سعیدی دو سال تک اردو اکادمی کے کارگزار سکریٹری بھی رہے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آج کل حکومتِ ہند کی وزارت برائے فروغِ انسانی وسائل کی اردو کونسل میں ایڈوائزر کے عہدے پر کام کررہے ہیں۔ ادبی صحافت سے طویل وابستگی اور ہندوپاک کے اہم موقر جرائد میں باقاعدہ چھپتے رہنے کے باوجود مخمور سعیدی اپنے شعری مجموعوں کی اشاعت سے غافل نہیں رہے۔ اب تک مخمور کے نو دس شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں جن میں ''گفتنی''، ''سیہ بر سفید''، ''آواز کا جسم''، ''سب رنگ''، ''واحد متکلم''، ''آتے جاتے لمحوں کی صدا''، ''بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا''، ''دیوار و در کے درمیاں''، ''عمرِ گزشتہ کا حساب'' اور ''راستا اور میں'' شامل ہیں۔

مخمور سعیدی کی شاعری کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے بیکانیر (راجستھان) کے واگ دیوی پرکاشن نے ہندی داں طبقے کے لیے مخمور کے دو شعری مجموعے ''پیڑ گرتا ہوا'' اور ''گھر کہیں گم ہوگیا'' دیوناگری لپی میں شائع کیے۔ مخمور ایک اچھے مترجم بھی ہیں اور انھوں نے ہندی، انگریزی اور فارسی سے تقریباً ایک درجن کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، ان

میں ۱۸۵۷ء کے حالات پر فارسی میں لکھی ہوئی غالبؔ کی مشہور و مختصر کتاب ''دستنبو'' بھی شامل ہے۔

مخمور سعیدی کی شاعری نے صرف مشاعروں کے سامعین ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ ہندوستان و پاکستان کے ممتاز نقادوں کی توجہ بھی اپنی طرف کھینچی ہے، جنھوں نے مخمورؔ کی شعری و ادبی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ بعض رسائل نے مخمورؔ کی شاعری اور شخصیت پر خصوصی گوشے شائع کیے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر کمال فاروقی اور شین کاف نظام نے ''مخمور سعیدی: ایک مطالعہ'' اور ''بھیڑ میں اکیلا'' کے عنوان سے مخمورؔ کی شخصیت اور شاعری پر دو اہم کتابیں تصنیف کی ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

آئینہ میرا مجھ کو ڈراتا ہے روز و شب
منظر، مجھے یہی نظر آتا ہے روز و شب

رکھتی ہے بے سکوں کوئی موہوم سی خلش
مبہم سا اِک خیال ستاتا ہے روز و شب

سنتا نہیں یہ شہرِ ہوس میری کوئی بات
اپنے مطالبات سُناتا ہے روز و شب

آتا ہے لوٹ لوٹ کے اک لمحۂ زیاں
کچھ، جیسے میرے ہاتھ سے جاتا ہے روز و شب

میں لمحہ لمحہ خود سے ہوا جا رہا ہوں دُور
کوئی مجھے قریب بلاتا ہے روز و شب

کب سے عذابِ دیدہ و دل سہہ رہا ہوں میں
یہ کون ہے کہ مجھ کو جگاتا ہے روز و شب

کتنی مسرّتیں تھیں کہ پل پل بچھڑ گئیں
اِک غم، کہ میرا ساتھ نبھاتا ہے روز و شب
اک اجنبی وجود، مرے ساتھ ساتھ ہے
مجھ سے جو راہ و رسم بڑھاتا ہے روز و شب
کیوں وقت دے گیا مرے خوابوں کو تلخیاں!
مخمورؔ، اب خیال یہ آتا ہے روز و شب

○

لے کر قرارِ خاطرِ بے تاب آئے گا
کب رو برو مرے، وہ مرا خواب آئے گا
پیاسی زمین اب کے تو دریا بھی پی گئی
مژدہ کہ اب نہ شہر میں سیلاب آئے گا
کالے سمندروں کو ابھی انتظار ہے
اِک دن یہ آفتاب تہِ آب آئے گا
کشتی کو احتیاط سے کھیتے ہوئے چلو
گرداب اور اک، پسِ گرداب آئے گا
کانٹوں پہ آج نیند تجھے آگئی تو کل
تیرے لیے بھی بسترِ سنجاب آئے گا
جو کچھ ہے جس کے پاس یہیں چھوڑتا چلے
مانع، سفر کی راہ میں اسباب آئے گا
اِس دھوپ کے سفر میں بھی یارو! کہیں کہیں
سنتے ہیں کوئی منظرِ شاداب آئے گا
محفل کی اِس فضا کو بدل دے گا سر بسر
جس وقت کوئی واقفِ آداب آئے گا
مخمورؔ! چاندنی میں نہاؤں گا رات بھر
نیندوں کی وادیوں میں وہ مہتاب آئے گا

○

اپنی موجودگی کی طلب، اور میں
مجھ سے خالی مرے روز و شب، اور میں
زندگی ، ایک بے کار مصروفیت
ہر نفس، زحمتِ بے سبب، اور میں
وضعِ دنیا نبھانا، کچھ آساں نہیں
مختلف میرے جینے کا ڈھب، اور میں
اس کے ہمراہ ، ملنا ہوا تھا کبھی
بعد اُس کے ملا خود سے کب اور میں
پھٹ پڑیں گے تو باہر بچے گا نہ کچھ
میرے اندر کا قہر و غضب، اور میں
چل پڑوں، راہ اپنی نکالوں کوئی
وقت کی راہ دیکھوں نہ اب اور میں
قہقہوں سے، کچھ آنسو چھلکتے ہوئے
حزن آ گئیں فضائے طرب، اور میں
اُس کی محفل میں بھی آن گھیرا مجھے
غم سے بچ کر کہاں جاؤں اب، اور میں
قربتوں کا تصوّر ہی کچھ ساتھ دے
دوریوں کے یہ رنج و تعب، اور میں
بزمِ جاناں کے آداب، اپنی جگہ
میری اک خواہشِ بے ادب، اور میں
کیا بتاؤں اِسے، کیا بجھاؤں اِسے
دل سا مصروفِ لہو و لعب، اور میں

سر پہ سورج مرے، قہر ڈھاتا ہوا
دھوپ میں سائباں کی طلب، اور میں

دیر تک، رات اپنے پہ ہنستے رہے
ایک مردِ قلندر لقب، اور میں

دیر سے دن کی آمد کے ہیں منتظر
رات کا منظرِ جاں بہ لب، اور میں

آج مخمور! اس بے نسب دور میں
منفعل، میرا نام ونسب، اور میں

○

کچھ پہلوؤں کو میری نظر دیکھتی نہ تھی
دُنیا بُری تو تھی مگر اتنی بُری نہ تھی

اُٹھ کر تری گلی سے عجب تجربہ ہوا
انجان ہم سے شہر کی کوئی گلی نہ تھی

اُن راستوں پہ راہ نما تھیں کچھ آہٹیں
وہ راستے، کہ جن میں کہیں روشنی نہ تھی

دن، آج اُس کے ساتھ گزارا، غضب کیا
اتنی تو میری رات، اکیلی کبھی نہ تھی

ترک وطلب کے موڑ پہ ٹھہرے ہوئے تھے ہم
ہونٹوں پہ دل کی بات ابھی تھی، ابھی نہ تھی

اپنے لبوں پہ جس کو سجائے ہوئے تھا میں
تم تو گواہ ہو کہ وہ میری ہنسی نہ تھی

کیوں ہوگئی اُداس طبیعت، ہجوم میں
دل میں ترا خیال، تری یاد بھی نہ تھی

تنہائیوں کا ساتھ نبھاتے ، کس آس پر
تجھ سے کبھی ملیں گے، یہ امید ہی نہ تھی
مخمور! اُس نے توڑ دی کس تمکنت کے ساتھ
رِشتے کی ایک ڈور ، کہ جو ٹوٹتی نہ تھی

شہرِ گمشدہ

ایک شہرِ گمشدہ دل میں مرے آباد ہے!

دیکھتا رہتا ہوں میں شام و سحر
اُس کے ایوانوں کے روشن بام و در
منہدم ہوتے ہوئے، گرتے ہوئے
ظلمتوں کی کھائی میں
بام و در کے خوش نما نقش و نگار
اب فقط گرد و غبار

اُس کے باغوں کی بہاروں میں خزائیں خیمہ زن
پنگھٹوں کی رونقیں، ویرانیوں سے ہمکنار
اُس کے تالابوں کا پانی خشک ہوتا دم بدم
ریگزاروں میں بدلتی اُس کی ندیوں کی فضا
کوہساروں سے گزرتی سر پھری پاگل ہوا
سرنگوں ہوتی ہوئی اونچی چٹانوں کے لیے ــــ ماتم کناں
مسجدوں کے سبز گنبد، مندروں کی چھتریاں
شہر کی مٹتی ہوئی پہچان پر سب نوحہ خواں

اُس کی سڑکوں، اس کی گلیوں سے گزرتے راہگیر
شہر کی پامالیوں سے بے خبر
خود پرست و خودنگر

میں سفر میں ہوں بہت دن سے مگر
میرا شہرِ گمشدہ دل میں مرے آباد ہے
چل رہا ہے ساتھ میرے، رہگزر در رہگزر
دیکھتا رہتا ہوں میں شام و سحر
شہر کے مٹتے ہوئے آثار کو
منہدم ہوتے در و دیوار کو

ہم وجودیت

صبح کے پانچ بجے ہوں گے

بالکنی میں کھڑا ہوں میں
تنہا، کھویا کھویا سا
منظر ہے، تاحدِ نظر
کچھ جاگا، کچھ سویا سا

سورج کی پہلی کرنیں
اپنے بھیگے آنچل میں
باندھ رکھی ہیں بادل نے
پھر بھی اک تابانی سی

منظر پہ چھلکادی ہو
جیسے اُفق کی چھاگل نے

بوندوں کی رِم جھم سن کر
پیڑوں کے جھرمٹ میں کہیں
چڑیوں نے سرگم چھیڑی
پیڑ مگر چُپ چاپ کھڑے
نہا رہے ہیں بارش میں

بالکنی میں کھڑا ہوں میں
پھر بھی بھیگا بھیگا ہوں
ایسا لگتا ہے، میں بھی
اس منظر کا حصّہ ہوں

□□

مرزا سلطانؔ دہلوی

استاد رساؔ دہلوی کی طرح مرزا سلطان بیگ سلطانؔ بھی پشتینی دہلی والے اور فٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ پرانی دہلی کے مشہور فٹ بال کلب مغلز میں کھیلتے تھے اور میدان میں اپنے خوبصورت کھیل سے فٹ بال کے شوقینوں کا دل جیت لیا کرتے تھے، فٹ بال ترک کر کے شاعری شروع کی تو تادمِ مرگ غزلوں میں بیان کی لطافت، زبان کے چٹخارے اور ترنم کی بدولت پرانی دہلی کے مشاعروں کے سامعین کی آنکھ کا تارا بنے رہے۔

مرزا سلطان دہلوی ۱۴ر مئی ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق تعلیم پائی اور سادہ کاری کا خاندانی پیشہ اختیار کیا۔ شاعری شروع کی تو داغؔ کی شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا اور داغؔ کے شاگرد داغؔ کے رنگِ شاعری کو حرزِ جاں بنائے ہوئے تھے۔ سلطانؔ دہلوی کو داغؔ کے ایسے ہی شاگردوں کی صحبتیں نصیب ہوئیں اور خالص عشقیہ غزل گوئی کا ماحول ملا۔ رہی سہی کسر آغا شاعر قزلباش کی تربیت نے پوری کر دی۔ سلطان دہلوی زبان و بیان کے اچھے شاعر تھے اور ان کی شاعری دبستانِ دہلی کی ایک اہم کڑی تھی لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ان کے انتقال کے بعد اُن کا سارا کلام محفوظ نہ رہ سکا اور ورثاء کی عدم دلچسپی اور لاپرواہی کی وجہ سے ضائع ہو گیا۔

سلطانؔ دہلوی نے ۱۶ر ستمبر ۱۹۵۸ء کو دہلی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

نمونۂ کلام:

غزل

لکھی توصیف چن چن کر پری رویوں کے تِل تِل کی
نظر آتی ہے نقطے نقطے سے وحشت مرے دل کی
کھنچی ، کھنچ کر اٹھی، اٹھ کر چلی شمشیر قاتل کی
بڑی مشکل سے مشکل حل ہوئی ہے میری مشکل کی
کسی کو کانوں کانوں بھی خبر کچھ ہو نہیں سکتی
ذرا سی بات ہے تم مان بھی لو مرے دل کی
مرے اک قتل سے ہیں حسرتیں کس کس کی وابستہ
چھری کی، تیر کی ، شمشیر کی، خنجر کی، قاتل کی

○

لے کے دل پھر نہ ہم سے وہ بولے
اپنے مطلب کے ہیں بڑے بھولے
کیا یہی ہے ادائے کم سخن
بند آنکھیں ہوں جب وہ لب کھولے
صبح رُخصت سوال بوسہ پر
بولے جا منہ تو پیشتر دھولے
کتنی نا فہم ہے تری تصویر
سر سے کھیلے نہ منہ سے کچھ بولے
وقت سے پہلے اُڑ نہیں سکتا
طائر روح لاکھ پر تولے

چشمۂ فیض چشمِ گریاں سے
ذرّہ ذرّہ نے ہیں گہر رولے
خوب کر الفت مژہ سلطاںؔ
خوب کانٹے تو راہ میں بولے

○

جلتے جلتے مرا دل خاک ہوا ہے تو سہی
یہ محبت کا صلہ مجھ کو ملا ہے تو سہی
قصہ موسیٰ و فرعون کو رد کون کرے
کفر کی گود میں اسلام پلا ہے تو سہی
کاش انسان بھی بننے کے یہ قابل ہوتا
آدمی اشرفِ مخلوق بنا ہے تو سہی
حسن والوں میں اگر نام ہے اُن کا تو کیا
چاہنے والوں میں اپنی بھی ہوا ہے تو سہی

○

وصل کا اُس سے کرو اظہار کیا
جو کہے اک بات پر سو بار کیا
قتل پر یہ دم بہ دم انکار کیا
ہوگئی ہے کند کچھ تلوار کیا
جن کی فطرت میں تلوّن ہے بتو
ایسوں کا انکار کیا، اقرار کیا
بزمِ دشمن میں ہوئے تم جلوہ ریز
ہم نہیں تھے، طالبِ دیدار کیا

میرے نالے سن کے وہ کہنے لگے
کوئی مرتا ہے پسِ دیوار کیا
میری شوریدہ سری کے سامنے
ہیں یہ زنداں کے درو دیوار کیا

○

بگڑے دل دونوں تھے ایسے کہ بنائے نہ بنے
غیر اپنے نہ ہوئے ، اپنے پرائے نہ بنے
جذبِ دل راہ نکال ایسی کہ اُس بدخو کو
غیر روکے بھی تو گھر میرے بن آئے نہ بنے
تم وہ ضدّی کہ جو روٹھو تو منائے نہ منو
دل وہ کم بخت جو بگڑے تو بنائے نہ بنے
اس نقاہت کا برا ہو کہ وہ جب سامنے آئیں
آنکھ اُٹھائے نہ اُٹھے، ہونٹ ہلائے نہ بنے
دل کو سلطاںؔ کے محبت نے وہ بخشا ہے اثر
کہ جہنم بھی جو چاہے، تو جلائے نہ بنے

○

عدو کے ظلم تمھارے عتاب دیکھیں گے
دکھائے گا جو فلک انقلاب دیکھیں گے
بنا بنا کے سنائیں گے قصّہ گیسو
سنا سنا کے ترے پیچ و تاب دیکھیں گے
جڑے ہیں کون سے خورشید، چرخ میں تارے
تمھارے رُخ سے ہٹا کر نقاب دیکھیں گے
شکستہ پائی ہمت سے ہے یقیں ہمیں
بلندیوں میں بھی پستی کے خواب دیکھیں گے

لڑائی آنکھ رقیبوں سے نشۂ مے میں
مگر وہ اُس کا نتیجہ خراب دیکھیں گے
کہاں بہشت ، بھلا واعظ کہاں ہم تم
عذاب دیکھ رہے ہیں عذاب دیکھیں گے
سنے گا کیا کوئی سلطانؔ کا حال محشر میں
جدھر وہ ہوں گے اُدھر شیخ وشاب دیکھیں گے

□□

مرغوب حیدر عابدی

کم گو، شریف النفس، حلیم الطبع اور بُردبار مرغوب حیدر عابدی قصبہ نوگانواں سادات سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک علمی اور مذہبی بستی ہے۔ ان کے جدِ امجد جناب مولانا سید فخر الدین حضرت خواجہ سید محمد امام دہلوی کے صاحبزادے تھے جو اپنے دور کے مشہور صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ انھوں نے کوئی سات آٹھ سو برس پہلے تبلیغِ دین اور رشد و ہدایت کے لیے دہلی سے ہجرت کی تھی اور امروہہ کے اطراف میں اس قصبے نوگانواں سادات کو آباد کیا تھا۔ مرغوب حیدر [illegible] ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے مولد میں پائی اور اعلیٰ تعلیم امروہہ کے انٹر کالج اور ڈگری [illegible] ر دہلی کی دانش گاہوں میں حاصل کی۔

مذہبی اور علمی گھرانہ ہونے کی وجہ سے بچپن سے رثائی ادب کی محفلوں، مجلسوں اور مشاعروں کے جلو میں گزرا۔ شعور سنبھالا اور قافیہ پیمائی شروع کی تو اسی کوچے سے اپنا شعری و ادبی سفر شروع کیا۔ غزل گوئی ۱۹۷۰ء کی دہائی سے شروع کی۔

انھوں نے دہلی سرکار کی ملازمت میں آنے کے بعد اردو، ہندی میں ایم۔ اے کیا اور پھر اردو میں ایم۔ فل۔ تقریباً دس سال اسٹیٹ پریس آفیسر کے فرائض انجام دینے کے بعد آج کل دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

مری طرف سے جو نظریں گھمائے بیٹھے ہیں
خدا ہی جانے وہ کیا کیا چھپائے بیٹھے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں سے سینہ دبائے بیٹھے ہیں
بڑے سکون سے وہ دل چرائے بیٹھے ہیں
کبھی تو آئے گا شیدا کوئی محبت کا
ہم انتظار میں پلکیں بچھائے بیٹھے ہیں
کبھی کبھی تو خیالوں میں ایسا لگتا ہے
وہ آرہے ہیں، وہ آئے، وہ آئے بیٹھے ہیں
کہیں تو کیسے، وہ محفل سجائے بیٹھے ہیں
ہم کہ عشق کو دل میں بسائے بیٹھے ہیں
کسی کو روٹی کے ٹکڑوں میں بکنا پڑتا ہے
ہیں ایسے کتنے جو دولت دبائے بیٹھے ہیں
بہت سے ہیں جو سُبک زندگی نبھا نہ سکے
ہم ایسے ہیں جو بہت زخم کھائے بیٹھے ہیں
یہ تم جو کرتے ہو غیروں کی بات اے مرغوب
یہاں تو اپنوں کو ہم آزمائے بیٹھے ہیں

○

نہ سیم و زر نہ عبث آن بان مانگتا ہے
علاج غم مرا دل بے تکان مانگتا ہے
مرا اصول کہ دولت کے آگے جھک نہ سکوں
مجھی سے آج وہ ناداں زبان مانگتا ہے

جو بس چلے تو وہ تنہا جہان کو پھونکے
اماں کے بدلے وہ کمبخت جان مانگتا ہے
کسی بھی آنکھ سے آنسو نہ بہنے پائے کبھی
جہاں سے آج یہی آسمان مانگتا ہے
سبق میں صبر کا اے کاش اُس کو دے پاؤں
عجب سی چیز مرا راز دان مانگتا ہے
جہاں میں بستے ہیں اور بے مکان ہیں ہم لوگ
وہ کیسا شخص ہے ہم سے مکان مانگتا ہے
کہیں کہیں پہ میسّر سکون ہے مرغوبؔ
یہ میرا دل ہے ہر اک جا امان مانگتا ہے

○

جب یاد تمھاری آتی ہے سینے میں مچل جاتا ہے یہ دل
راتوں کے اندھیروں میں اکثر نادان بدل جاتا ہے یہ دل
اے محرمِ رازِ دل یہ بتا تجھ کو مرے رازِ دل کی قسم
اک تیرا تصور آتے ہی کیوں خود ہی سنبھل جاتا ہے یہ دل
جس طرح سے حب چاہے، انسان کو خوش کر دے لیکن
برباد یہ جب چا ، وہ چال بھی چل جاتا ہے یہ دل
اے جان، دل لے تو لیا، اب اس کو حفاظت سے رکھنا
ایسا بھی کبھی ہو جاتا ہے، ہاتھوں سے نکل جاتا ہے یہ دل
اے نکہتِ گُل مت چھیڑ مجھے خاروں سے بہلنے دے کچھ دن
مرغوبؔ انھیں کو رکھتا ہوں، بس ان سے بہل جاتا ہے یہ دل

○

آج اس دل پہ کرے اتنی عنایت کوئی
کاش دے دے مجھے جینے کی اجازت کوئی

زندگی اپنی، خیال اپنا، نہ دل ہے اپنا
فرقتِ یار میں دیکھے مری حالت کوئی
آپ تو یونہی پریشان رہا کرتے ہیں
کیا بدل پایا ہے دیوانوں کی قسمت کوئی
کوچۂ یار میں جاتا ہوں لیے ساتھ رقیب
آج اے کاش بڑھا دے مری ہمت کوئی
معانیِ لفظ محبت تو بہت ہیں دشوار
کیا سمجھ پائے گا اس شے کی حقیقت کوئی
دل کو احساسِ اسیری نہ ہو کیوں کر ناصح
کرتا ہے برسوں سے اس دل پہ حکومت کوئی
روز آتے ہیں وہ مرغوب، مگر خوابوں میں
روح کا رشتہ ہے، پھر کیا کرے جرأت کوئی

○

دل کی گہرائیوں میں آپ کا مہماں ہونا
یعنی روزانہ ملاقات کا ساماں ہونا
کیسے بھائے انھیں ایماں کا رگِ جاں ہونا
جب کہ راس آیا ہے خود دشمنِ ایماں ہونا
آپ کر سکتے نہیں بدلے میں احسان اگر
ترک کر دیجیے لِلّٰہ بد احساں ہونا
خوب پہچانتے ہیں آپ کا شیوہ ہے یہی
دیکھ کر خوش ہمیں خود آپ پریشاں ہونا
شب کی تاریکی میں یہ تبصرہ کتوں نے کیا
غیر ممکن ہے ہر انساں کا بھی انساں ہونا

میں ترے نام کی تسبیح پڑھوں بعدِ نماز
جانتا ہی نہیں مشکل کا نہ آساں ہونا

بعد مرنے کے مرے او بتِ کافر تیرا
شرمسار آنا اور انگشت بدنداں ہونا

بادشاہت کی تمنا نہ ہوس شہرت کی
کیا مجھے چاہیے ، بس شکر بداماں ہونا

مشکلیں لاکھ رکاوٹ ہوں مری راہوں میں
مجھ کو کافی مرے آقا کا نگہباں ہونا

تجھ کو بھی کام میں آنا ہے، مری خاکِ مزار
یاں سے اُٹھ جانا تو خاکِ درِ جاناں ہونا

یاب تو مرغوبؔ یہی خواب نظر آنے لگا
مسندِ زیست پہ بچوں کا نگہباں ہونا

○

زہے قسمت کہ بلوایا گیا ہوں
"میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں"

میرے مولا تری ذرّہ نوازی
کہیں پستی سے اٹھوایا گیا ہوں

صداقت نے سند قدرت سے پائی
جہاں پر بھی میں جھٹلایا گیا ہوں

میں اڈا ہوں دلوں میں چاہ بن کر
جہاں نفرت سے ٹھکرایا گیا ہوں

نہیں ہرگز عناں گیری مناسب
کہیں میں یاد فرمایا گیا ہوں

یہ قطرے نے کہا پلکوں سے گر کر
بڑے نازوں سے ڈھلکایا گیا ہوں
خدا کی شان، یوں گویا ہے خورشید
میں رستے سے جو پلٹایا گیا ہوں
یہ مجھ سے گل ہوا گویا کہ مرغوبؔ
میں اکثر سر پہ بٹھلایا گیا ہوں

○

اُن کی بستی میں پھر سے جانا ہو
پھر ملاقات کا بہانا ہو
ایک لمحہ ٹھہر یہاں اے دل
پھر نہ جانے کہاں ٹھکانہ ہو
ایسے گلشن کی خیر اے بلبل
جس جگہ تیرا آشیانہ ہو
اُس کو اوپر اٹھایئے بڑھ کر
جس کا کمزور سا گھرانہ ہو
ناتوانوں کی آزمائش کیا !
زور بازو جو آزمانا ہو !
کیوں نہ بادہ کشوں کو دعوت دیں
جب کہ ماحول عاشقانہ ہو
رہیے مرغوبؔ بن کے کچھ محتاط
جب ہوا بھی معاندانہ ہو

□□

مشتاق صدفؔ

مشتاق صدفؔ جن کا خاندانی نام مشتاق احمد ہے اردو کے نوجوان شاعر اور صحافی ہیں۔ ۱۱رنومبر ۱۹۶۹ء کو گوپال گنج میں احسان احمد کے گھر میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے سیاسیات اور اردو میں ایم۔ اے کیا اور ''اردو میں صحافتی زبان کا آغاز اور ارتقاء'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر جے۔ این۔ یو سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد کسی کالج یا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہونے کی بجائے صحافت کو ذریعۂ معاش بنایا اور آج کل روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' سے وابستہ ہیں۔ خودنمائی کا شوق نہیں، خاموش اور مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک ہیں۔ مشاعروں کی دنیا سے دور رہتے ہیں اور ادبی جرائد میں چھپنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ''جذبی شناسی'' مشتاق صدف کی حالیہ نثری تصنیف کا نام ہے جو معین احسن جذبی کی شخصیت اور شاعری پر ایک اہم کتاب ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

راز تک ذہن کو رسائی دے
اور آنکھوں کو تو دکھائی دے

راہ پہ دل رہے جوانی میں
مجھ کو اس عمر میں سجھائی دے

اصل چہرہ دکھائی دے تب نا؟
اب کسے کون منہ دکھائی دے

میں کہیں دیوتا نہ بن جاؤں
میری سیرت میں کچھ برائی دے

میرے حصّہ میں عزت و شہرت
اتنی دے غیر کو دکھائی دے

شور میں تو بھی کیوں صدفؔ گم ہے
اپنی آواز میں سنائی دے

○

آ گیا جینے کا ڈھب اغیار سے
گرتے گرتے بچ گئے معیار سے

ان پہ سارے بند دروازے ہوں اب
چھت پہ چڑھ آئے ہیں جو دیوار سے

لے لیا ایمان کا جب امتحاں
گردنیں کٹتی نہیں تلوار سے

عشق، ممتا، درد، نفرت سوچیے
ہو گیا تقسیم کیوں دل چار سے

زرد ہو جائے گا یہ چہرہ صدفؔ
زندگی مانگو گے جب بیمار سے

○

میرے خیال و خواب میں صورت اُسی کی تھی
میری بجھی نظر کو ضرورت اسی کی تھی

سورج تو اپنے ساتھ لیے دھوپ ڈھل گیا
لیکن وہ در سے لپٹی تمازت اسی کی تھی

دنیا کی الجھنوں سے اگر تھا میں بے خبر
شامل مرے گناہ میں وحشت اسی کی تھی

اشکوں کو قید کر کے بھلا کیا غضب کیا
آنکھیں اسی کی اور ضرورت اسی کی تھی

یہ اور بات ہے کہ تھی خاموش زندگی
لیکن ہماری موت سے نسبت اسی کی تھی

ہر چند اے صدفؔ وہ رہا ہم سے دور دور
لیکن ہمارے دل پہ حکومت اسی کی تھی

○

نظر سب کی ہوس کا اک مکاں ہے
یہاں کورا بدن ملتا کہاں ہے

زمانے کا اثر ہے یہ بھی شاید
مری آواز مجھ سے بدگماں ہے

جہاں بچپن کو ہنستا چھوڑ آئے
وہاں یادوں کا اب برگد جواں ہے

انا کی جنگ جیتوں اب کہ ہاروں
کہ ہر حالت میں میرا ہی زیاں ہے

مجھی میں ڈھونڈھ لو مل جائے شاید
صدفؔ کو پوچھتے ہو تم کہاں ہے

○

یہ ظرف کہ تو خوش ہے کہیں رشتہ جوڑ کے
نادم ضمیر میرا ، ترا ساتھ چھوڑ کے
یوں تو ابھی مری آنکھیں ہوئی تھیں بند
لیکن اذانِ دل نے جگایا جھنجھوڑ کے
اس ایک چہرے میں کئی چہرے سمٹ گئے
اک آئینہ بنایا ہے کرچوں کو جوڑ کے
دی بھائیوں نے مجھ کو حصہ میں بوڑھی ماں
دوزخ میں جا کے بیٹھے ہیں جنت کو چھوڑ کے
آئے گا زندگی میں یہ دن بھی کبھی صدفؔ
لاؤں گا آسماں سے ستاروں کو توڑ کے

○

جب سے ہم چپ چاپ گھر رہنے لگے
کیا کہیں دیوار و در کیسے لگے
اونچے قد والوں سے کی جب دوستی
اپنے قد کے لوگ ہی اچھے لگے
مہربانی وقت کی ہے اور کیا
ہم جو کچھ لوگوں سے اب ملنے لگے
کیا کہیں یہ ہوگیا ہے کیا ہمیں
خود پہ رونا تھا مگر ہنسنے لگے
بولتے جاتے تھے جانے کس سے کیا
خود کو اب چپ چپ سے ہم کیسے لگے
قیمتی کپڑوں کے تاجر ہو صدفؔ
کیا مگر خود کو کبھی ننگے لگے؟

○

آئینہ ایسا کبھی دیکھا نہ تھا
اُس کا چہرہ تھا مرا چہرہ نہ تھا

نیند لپٹی رہ گئی اس خواب سے
درحقیقت خواب جو اپنا نہ تھا

اک پڑوسی دوسرے سے نا بلد
بے مروّت شہر تو اتنا نہ تھا

روشنی کا یہ بھی ہے اک تجربہ
میں جہاں بھٹکا تھا، اندھیارا نہ تھا

ہاتھ جو کھولا تو بچّہ رو پڑا
بند مٹھی میں کوئی سکّہ نہ تھا

سر سے پانی جب ہوا اونچا صدفؔ
کیسے چپ رہتا کوئی مردہ نہ تھا

□□

مشیر جھنجھانوی

جھنجھانہ گرچہ مظفرنگر (یوپی) کا ایک دور افتادہ، پسماندہ اور سوتا جاگتا قصبہ ہے لیکن بہت سے بزرگانِ دین سے نسبت اور اردو میں بارہ ماسے کی طرح ڈالنے والے شاعر کے مولد و مسکن ہونے کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے۔ دیوبند کی خاموش فضاؤں میں قرآن و حدیث کی تعلیم دینے کے لیے مدرسے کی اساس رکھنے والے علمائے دین کے روحانی جدِ امجد اور قطبِ وقت حضرت میاں جی نور محمدؒ اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ اردو میں بارہ ماسہ کی طرح ڈالنے والے افضل جھنجھانوی (متوفی ۱۰۲۰ھ) نے اپنے عشق کی داستان کو اسی قصبے کی سوتی جاگتی فضاؤں میں بکٹ کہانی کے نام سے نظم کیا اور اردو میں اس صنف کے امام ٹھہرے۔

سید مشیر الحسن مشیر ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو اسی قصبے میں ڈاکٹر سید ناضر حسین علوی کے گھر پیدا ہوئے۔ سید ناضر حسین صاحب علوی گرچہ ڈاکٹر نہ تھے لیکن شعر و ادب سے مَس رکھتے تھے اور شعر کہتے تھے جس کی وجہ سے گھر میں شعر و شاعری کا چرچہ رہتا تھا۔ مشیر جھنجھانوی نے اس علمی، ادبی اور شعری ماحول میں آنکھ کھولی اور شاعر باپ سے متاثر ہو کر اوائلِ عمر ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا۔

مشیر جھنجھانوی نے بریلی، شاہجہاں پور میں تعلیم پائی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے

بی۔ٹی اور دلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کر کے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا اور جولائی ۱۹۵۰ء سے دسمبر ۱۹۸۸ء تک فتح پوری مسلم اسکول میں معلّمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔شاہجہاں پور کے قیام کے دوران غزلوں پر حضرت دلؔ شاہجہاں پوری سے اصلاح لینی شروع کی۔حضرت دلؔ شاہجہاں پوری امیرؔ مینائی لکھنوی کے جانشین اور غزل گو شاعر تھے۔مشیر جھنجھانوی نے دلؔ شاہجہاں پوری کے تتبع میں غزل کو اپنایا اور غزل کے ہی ہو رہے لیکن روایتی غزل گوئی سے دامن بچا کر ایک نئی روش اختیار کی اور غزل کو ایک انفرادی لب ولہجہ دیا۔اس نئے آہنگ اور انفرادی لب و لہجے نے غزل کو مشیر جھنجھانوی کی پہچان بنایا ہے۔لکھنؤ اسکول کا ظاہری حسن اور دلی اسکول کا داخلی تاثر مشیر جھنجھانوی کی شاعری کا خاص وصف ہے۔جس کا اعتراف ایک شعر میں یوں کرتے ہیں:

مشیر اہلِ بینش میری غزل میں

دماغ اور دل کو بہم دیکھتے ہیں

مشیر جھنجھانوی ایک زمانے میں مشاعروں اور شعری نشستوں میں تمام شعراء کے برعکس بے شمار متفرق اشعار سنا کر سننے والوں کو متاثر کرتے تھے اور عام طور پر شاعرِ متفرقات کہلاتے تھے۔منفرد اور چونکا دینے والے اشعار کے خالق اس شاعر نے پوری زندگی درس وتدریس میں صرف کی۔دہلی سرکار نے درس وتدریس میں اعلیٰ اور نمایاں کارکردگی پر ایوارڈ سے نوازا اور اردو اکادمی،دہلی نے بھی ان کی شاعرانہ خدمات کا اعتراف کیا۔مشیر جھنجھانوی کا انتقال ۲۱/مارچ ۱۹۹۰ء کو دہلی میں ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

جب وہ مرے قریب سے ہنس کر گزر گئے
کچھ خاص دوستوں کے بھی چہرے اتر گئے

وہ ہنس دیے تو رات سنورتی چلی گئی
زلفیں بکھیر دیں تو اُجالے نکھر گئے

افسوس ڈوبنے کی تمنّا ہی رہ گئی
طوفان زندگی میں جو آئے گزر گئے

کشتی کوئی ڈبو کے سبکدوش ہوگیا
الزام جس قدر تھے وہ طوفاں کے سر گئے

کوئی ہمیں بتائے کہ ہم کیا جواب دیں
منزل یہ پوچھتی ہے کہ ساتھی کدھر گئے

حالاں کہ ان کو دیکھ کے پلٹی ہی تھی نظر
محسوس یہ ہوا کہ زمانے گزر گئے

دیر و حرم میں ہیں نہ کسی انجمن میں ہیں
دیوانے اے مشیر نہ جانے کدھر گئے

○

موسمِ بہاراں کی ہر ادا ستاتی ہے
پھول زخم دیتے ہیں چاندنی جلاتی ہے

کارواں سے منزل تک کچھ نظر نہیں آتا
جب کسی مسافر کی آس ٹوٹ جاتی ہے

میکدے میں رہ کر بھی اب سکوں نہیں ملتا
میکدے کے باہر بھی زندگی رُلاتی ہے

برق سے گلہ کیسا آندھیوں سے کیا شکوہ؟
آشیاں بناتا ہوں شاخ ٹوٹ جاتی ہے
انجمن میں تنہا ہوں خلوتوں میں دیوانہ
مختلف طریقوں سے زندگی رُلاتی ہے
کوئی راہزن ملتا کوئی ہمسفر ہوتا
راستے کی تنہائی فاصلے بڑھاتی ہے
اے مشیر ہم بھی آبروئے میخانہ
آدمی کو مجبوری پارسا بناتی ہے

○

دفن کردیجیے آخر یہ تماشہ کب تک
ایک ہی لاش سے کھیلے گا زمانہ کب تک
بندشیں وسعتِ دریا پہ لگانے والو!
رُخ نہ بدلے گا یہ سمٹا ہوا دریا کب تک
جو بھی ملتا ہے ترا دوست ہی ملتا ہے مجھے
میں ترے شہر میں پھرتا رہوں تنہا کب تک
قتل کرنے کے طریقے وہی قاتل بھی وہی
اس تسلسل سے نہ گھبرائے گی دنیا کب تک
معجزہ کوئی بھی ہو درد کے ماروں کے لیے
آپ کہلائیں گے اس طرح مسیحا کب تک
نقش پتھر پہ بناؤ تو کوئی بات بنے
برف کی سِل پہ تراشا ہوا چہرہ کب تک
کوئی تسکینِ نظر کی بھی تو صورت نکلے
صرف آواز سے بہلے گی یہ دنیا کب تک

اب تو احباب یہ کہہ کہہ کے گزر جاتے ہیں
ایک گرتی ہوئی دیوار کا سایہ کب تک
وقت کی پردہ دری کا یہ تقاضا ہے مشیرؔ
زیست کے رُخ پہ روایات کا پردا کب تک

○

دامن بچا کے شوق سے غصّہ اتاریے
کیچڑ میں سانپ کو بھی نہ پتھّر سے ماریے
پھر کیجیے گا شکوۂ ملبوسِ زندگی
پہلے خود اپنے جسم کی حالت سنواریے
بہتر یہی ہے آپ جہاں ہیں وہیں رہیں
ٹیلے پر چڑھ کے قد کو اپنے ابھاریے
میں گر گیا تو آپ پہ الزام آئے گا
اتنی بلندیوں سے مجھے مت پکاریے
یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی اجنبی ہوں میں
اتنے تپاک سے تو نہ مجھ کو پکاریے
ایسی ہی احتیاج اگر ہے تو اے مشیرؔ
دامن کسی شریف کے آگے پساریے

○

زہر اس ماحول کا مجھ میں کچھ اتنا بھر گیا
سانپ نے کاٹا مجھے اور کاٹتے ہی مر گیا
میں زمانے کی شرافت سے کچھ ایسا ڈر گیا
میرے اندر کا فرشتہ خوف کھا کر مر گیا
وہ گھنیرا پیڑ جس کے سایے میں رہتے تھے ہم
آندھیوں میں جب گرا تو گھر کو آنگن کر گیا

آئینہ ٹوٹا ہوا تھا یا خراشیں تھیں بہت
اپنا چہرہ دیکھتے ہی میں اچانک ڈر گیا

بات سچّی ہو تو باطل خوف کھاتا ہے ضرور
ایک موسیٰ کے لیے فرعون کا لشکر گیا

سانس لینا زندگی کی اک علامت ہے مگر
یہ بھی دیکھا ہے کہ انساں سانس لے کر مر گیا

قلب کی تاریکیاں چہرے پہ روشن ہو گئیں
تتلیوں کا روپ ایسا تھا کہ بھونرا ڈر گیا

جسم بچ کر آ گیا یہ بھی غنیمت جانیے
ورنہ مقتل میں پہنچ کر کون واپس گھر گیا

قتل کا الزام بھی جس پر لگا سکتے نہیں
مرنے والا ایک ایسا نام لے کر مر گیا

ایک میں کوتاہ قد تھا اس کی محفل میں مشیرؔ
اس لیے میرے علاوہ ہر کسی کا سر گیا

○

مانا کہ وہ موجوں کی طرح سینہ سپر تھا
لیکن اسے طوفاں کا نہیں موت کا ڈر تھا

شیشے کا بدن اور پہاڑوں کا سفر تھا
میں آ گیا واپس یہ دعاؤں کا اثر تھا

کُہرا مری پرواز میں حائل تو ہوا ہے
لیکن مجھے سورج کی طرح ذوقِ سفر تھا

آشفتہ مزاجی سے یہ امید کہاں ہے
پتھر کے تعاقب میں کوئی دستِ ہنر تھا

ارباب نظر بھی مجھے پہچانتے کیوں کر
میں آتشِ خاموش تھا پتھر میں گہر تھا
جو ہاتھ اٹھا تھا کبھی مظلوم کے حق میں
دیکھا تو اسی ہاتھ میں مظلوم کا سر تھا
حیرت ہے کماں اس کی مگر تیر پرائے
حالاں کہ وہ ارجن کی طرح اہلِ ہنر تھا
ٹوٹے ہوئے تارے کی نہیں کوئی بھی منزل
میں تجھ سے جدا ہو کے اِدھر تھا نہ اُدھر تھا
کہسار سے ٹکرا کے پریشاں تھیں ہوائیں
بستی کے اندھیرے میں چراغوں کا بھنور تھا
ہم بھی تھے مشیرؔ ایک پجارن کے پجاری
مندر بھی کسی وقت ہمارے لیے گھر تھا

مظفر حنفی

مظفر حنفی مدھیہ پردیش کے محکمۂ جنگلات سے عملی زندگی کا آغاز کرکے جس طرح مختلف سرکاری دفتروں سے گزر کر جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پھر کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال چیئر کی پروفیسر شپ تک پہنچے اسی طرح شاعری کے ساتھ اور دوسری قابلِ ذکر اصناف میں طبع آزمائی کرکے مظفر حنفی نے اردو دنیا میں اپنے شعری و ادبی وجود کا احساس کرایا ہے۔ وہ شاعر ہیں، مقتدر نقاد ہیں، باریک بیں محقق ہیں، افسانہ نگار ہیں، مترجم ہیں اور ادبِ اطفال میں بھی خاصا درک ر۔ اب تک ہمہ اصناف قلمکار کی حیثیت سے ساٹھ سے زائد کتابیں سپردِ قلم کر چکے ہے۔

مظفر حنفی کا خاندانی نام محمد ابوالمظفر ہے۔ یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو مدھیہ پردیش کے شہر کھنڈوہ میں پیدا ہوئے لیکن ان کا آبائی وطن ہسوہ ہے جو اتر پردیش کے ضلع فتح پور کا چھوٹا سا قصبہ ہے۔ کھنڈوہ سے ہائی اسکول کرنے کے بعد محکمۂ جنگلات میں ملازمت کر لی اور اسی ملازمت کے دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لے کر اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور بھوپال یونیورسٹی سے ایم۔ اے، ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کی تحقیق کا موضوع ''شاد عارفی کی شخصیت اور فن'' تھا۔ ۱۹۷۴ء میں حکومتِ ہند کے محکمہ این سی ای آر ٹی میں اسسٹنٹ پروڈکشن آفیسر ہو کر دہلی آ گئے۔

لیکن دو سال کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تقریباً تیرہ سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دے کر مظفر حنفی ۱۹۸۹ء میں اقبال چیئر کے پروفیسر ہو کر کلکتہ یونیورسٹی چلے گئے جہاں سے ۲۰۰۱ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو گئے اور اب دہلی میں مستقل رہائش ہے۔

مظفر حنفی کے شعری و ادبی ذوق کی آبیاری بسوہ کے اسکول میں ہوئی جہاں طلباء میں ادبی ذوق ابھارنے کے لیے مصرعِ طرح دیا جاتا اور باقاعدہ طبع آزمائی کرائی جاتی تھی اور اکثر اشعار کی تقطیع بھی طلباء سے کرائی جاتی تھی۔ اسکولی سطح کی یہ تربیت موزوں طبع کو اچھا شاعر بنانے کے لیے کافی تھی، رہی سہی کسر کھنڈوہ میں قیام کے دوران عمِ زاد کے مشاعرے منعقد کرانے کے شوق اور ''نیرنگِ خیال''، ''ایشیا''، ''ماہِ نو'' اور ''آج کل'' جیسے ادبی پرچوں کے مسلسل مطالعے نے پوری کر دی اور شعر و ادب مظفر حنفی کے رگ و پے میں سما گیا۔

مظفر حنفی نے باقاعدہ غزل گوئی ۱۹۵۱ء کے آس پاس شروع کی لیکن ان کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۴۹ء میں دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''کھلونا'' میں بچوں کی نظموں سے ہو چکا تھا۔ ابتداء میں بچوں کے رسائل کے لیے نظمیں سپردِ قلم کرتے رہے۔ سنجیدہ شاعری کا رُخ کیا تو غزل کو اپنایا اور جنابِ شاؔد عارفی کا تلمذ اختیار کیا۔ جناب شاؔد عارفی ایک قادر الکلام استاد شاعر تھے اور ہر صنفِ شعر پر دسترس رکھتے تھے۔

ادب کے مختلف شعبوں میں قابلِ قدر کاوشیں کرنے کے باوجود مظفر حنفی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل کے سحر کا انھیں پورا پورا احساس ہے جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

بُری نہیں ہے مظفؔر کوئی بھی صنفِ ادب
قلم غزل کے اثر میں رہے تو اچھا ہے

غزل کے اسی سحر نے مظفؔر حنفی کو ہند و پاک کا ایک معتبر غزل گو شاعر بنا دیا ہے جس کے متعدد شعری مجموعے ہیں جن میں ''پانی کی زبان'' ۱۹۶۷ء، ''تیکھی غزلیں'' ۱۹۶۸ء، ''صریر خامہ'' ۱۹۷۳ء، ''دیپک راگ'' ۱۹۷۴ء، ''یم بہ یم'' ۱۹۷۹ء، ''طلسمِ حرف'' ۱۹۸۰ء، ''کھل جا سِم سِم'' ۱۹۸۱ء، ''پردہ سخن کا'' ۱۹۸۶ء، ''یا اخی'' ۱۹۹۷ء، ''پرچم گرد باد'' ۲۰۰۱ء اور ''ہاتھ اوپر کیے'' وغیرہ شامل ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

چھت نے آئینہ چمکانا چھوڑ دیا ہے
کھڑکی نے بھی ہاتھ ہلانا چھوڑ دیا ہے
چاند ستارے اوپر سے جھانکا کرتے ہیں
پاگل نے اور اک ویرانہ چھوڑ دیا ہے
اس کی محفل میں آنے پر پابندی تھی
ہم نے ہر محفل میں جانا چھوڑ دیا ہے
پھول پجاری چن لیتے ہیں چوری چوری
ساری شاخوں نے بل کھانا چھوڑ دیا ہے
گھر میں پی لیتے ہیں بدنامی سے بچ کر
اکثر لوگوں نے مے خانہ چھوڑ دیا ہے
ایک مسافر چیخ رہا ہے بستی والو!
کیوں راہوں میں پیڑ لگانا چھوڑ دیا ہے
لگتا ہے بیکار مظفرؔ غزلیں کہنا
جب سے ان کو شعر سنانا چھوڑ دیا ہے

○

دریا کو اور کوئی بہانہ تو ہے نہیں
کہتا ہے چل کہ تیرا ٹھکانہ تو ہے نہیں
اب کہہ دیا تو بات نبھائیں گے عمر بھر
حالاں کہ دوستی کا زمانہ تو ہے نہیں
لاوا سا کھولتا ہے سدا اندرونِ ذات
آتش فشانِ غم کا دہانہ تو ہے نہیں

دیوانہ ہے جو اُس سے توقع رکھے کوئی
آخر وہ رہنما ہے ، دِوانہ تو ہے نہیں
تھوڑی سی روشنی ہے اسے جو بھی لوٹ لے
جگنو میاں کے پاس خزانہ تو ہے نہیں
سب جائے حادثہ سے بہت دور ہو گئے
زخمی کی چیخ کوئی ترانہ تو ہے نہیں
چُبھ جائیں جانے کس کو مظفؔر ہمارے شعر
اپنا بھی کوئی خاص نشانہ تو ہے نہیں

○

سچ ہے کچھ یادوں کے بدلے ہم نے دل کو بیچ دیا ہے
تم نے تو ماضی کے ہاتھوں مستقبل کو بیچ دیا ہے
طوفاں سے کیا باتیں کی ہیں، پیارے مانجھی سچ بتلانا
دریا کو گروی رکھا ہے یا ساحل کو بیچ دیا ہے
پھولوں کی اونچی مسند نے خوب چمن بندی فرمائی
پھونک دیے آباد نشیمن، آب و گل کو بیچ دیا ہے
سیلابوں کی زد میں آکر جلنے سے محفوظ ہوا گھر
میں بھی خطرے سے باہر ہوں سر قاتل کو بیچ دیا ہے
پیروں میں چھالے باقی ہیں، راہوں میں کانٹے کافی ہیں
اونچی قیمت پا کر ہم نے پھر منزل کو بیچ دیا ہے

○

سانس لیتی ہے زمیں سُن تو سہی
بیج پھوٹا ہے کہیں، سُن تو سہی
اِک ذرا بیٹھ مرے پاس میاں
درد ہے دل کے تئیں ، سُن تو سہی

خود ہی جنت سے نکل آیا ہوں
کیا ہوا قبلِ ازیں، سُن تو سہی
سب نے چنگاریاں بو رکھی تھیں
تتلیاں کیسے اُگیں، سُن تو سہی
گھر نہیں ہے تو نہ جی پائیں گے
لامکانوں کے مکیں، سُن تو سہی
ہم ستاروں پہ نظر رکھتے ہیں
رُک تو اے زہرہ جبیں، سُن تو سہی
ہاں مظفؔر کی غزل ہے تو جدید
اے روایت کے امیں، سُن تو سہی

○

سب دشمن بستی کے نکلے
سارے تیر اخی کے نکلے
وہ شمشیر برہنہ آیا
ہم تھوڑی سی پی کے نکلے
آندھی! لے ہم گل ہوتے ہیں
اب تو ارماں جی کے نکلے
میرے پیروں کے چھالوں سے
کانٹے ہمدردی کے نکلے
اس موسم میں کٹ جائے گی
پتّے جس ٹہنی کے نکلے
اُن کو چھوکر دیکھ چکا ہوں
سرتاپا بجلی کے نکلے
سچّے لوگوں کا جلسہ تھا
ہونٹوں کو ہم سی کے نکلے

○

غزل میں کوئی نام آنے نہ پائے
شہیدوں پہ الزام آنے نہ پائے
چراغوں کے پہرے بٹھانے پڑے
کہ پھر دن چڑھے شام آنے نہ پائے
مرے دل پہ یا شیخ اتنا کرم
دعا کر کہ آرام آنے نہ پائے
مبارک تمھیں سر بچالائے تم
صد افسوس ہم کام آنے نہ پائے
ورق آئینے، روشنائی ہے نور
یہاں گردِ ایّام آنے نہ پائے
اُجالا بڑھا دو کہ جگنو کے نام
ستارے کا پیغام آنے نہ پائے
مظفؔر تغزل چشیدہ ہے وہ
اِدھر وہ خوش انجام آنے نہ پائے

□□

معین شاداب

دہلی کی شعری، ادبی اور صحافتی زندگی میں معین شاداب کے قلمی نام سے شہرت اور مقبولیت کی سیڑھیاں چڑھنے والے محمد معین اختر کا تعلق اتر پردیش سے ہے۔ ۱۰/۱ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو اپنے بڑوں کے آبائی وطن قصبہ رداز ضلع بجنور میں پیدا ہوئے، لیکن دہلی میں ہوش سنبھالا اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔

اردو میں ایم۔اے، ایم فل اور بی ایڈ ہیں۔ صحافت ذریعۂ معاش ہے۔ دوردرشن پر اردو کے نیوز ریڈر ہیں۔ شعری و ادبی نشستوں کی خوبصورت اور کامیاب نظامت کرتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

نئے جزیروں کی ہم کو بھی چاہتیں تھیں بہت
ہماری راہ میں لیکن روایتیں تھیں بہت
کہیں بھی آگ لگے اس کا نام آتا ہے
اسے چراغ جلانے کی عادتیں تھیں بہت

اندھیرے، زخم، مسائل، دھواں، لہو، آنسو
گنواتے ہم بھی کہاں تک وراثتیں تھیں بہت
کسی کا لہجہ یقیناً فریب لگتا تھا
مگر فریب کے پیچھے صداقتیں تھیں بہت
وہ جس کی گفتگو پھولوں کا استعارہ تھی
خموشیوں میں بھی اس کی فصاحتیں تھیں بہت
اتارا جاتا تھا صدقہ ہماری جان کا بھی
ہمارے دم سے بھی منسوب چاہتیں تھیں بہت
بہت سمجھتے ہیں تھوڑے لکھے کو ہم شاداب
ہمارے واسطے اک دو شکایتیں تھیں بہت

○

بے موسم ہی آنکھوں میں بھر جاتے ہیں
آنسو بھی تو چالاکی کر جاتے ہیں
دل کا سودا ان کے بس کی بات نہیں
اونے پونے دام لگا کر جاتے ہیں
ہر دن زندہ رہنے میں ہے خرچ بہت
آؤ چلو اک دو دن کو مر جاتے ہیں
قتل اُجالے بھی کر دیتے ہیں لیکن
سب الزام اندھیروں کے سر جاتے ہیں
کیسے جی لیتے ہیں لوگ اندھیروں میں
ہم تو صرف تصور سے ڈر جاتے ہیں
ریزہ، ریزہ ہونا ان کی قسمت ہے
سوئے فلک جو بے بال و پر جاتے ہیں

○

یہ طے نہیں کہ سدا آنسوؤں سے لکھیں گے
کبھی تو ہم بھی غزل خوشبوؤں سے لکھیں گے

ہماری پیاس کا احوال ، ریگ زاروں پر
سلگتے چیختے موسم لوؤں سے لکھیں گے

صحافیوں کو کہاں حالِ دل سنا بیٹھے
ذرا سی بات کئی پہلوؤں سے لکھیں گے

نہ خوش ہو جان کے بے دست، ہم ترا انجام
انھیں تراشے گئے بازوؤں سے لکھیں گے

بھلے ہی ٹوٹ چکی ہیں مگر ہمیں سوچیو
کہ ہم کنارہ انھیں چپّوؤں سے لکھیں گے

○

سچّائی سے بالکل عاری ہوتا ہے
تیرا وعدہ بھی سرکاری ہوتا ہے

جو ماوس کی رات میں چمکے وہ جگنو
پورنما کے چاند پہ بھاری ہوتا ہے

اس پر ہی پھولوں کی بارش کرتے ہو
جس کا ہر جملہ چنگاری ہوتا ہے

محرومی کا جشن منائیں گی آنکھیں
پھر اعلانِ شب بیداری ہوتا ہے

○

دل صحرا آباد بھی کرنا پڑتا ہے
اس ظالم کو یاد بھی کرنا پڑتا ہے

بے مقصد کے شغل بھی راس آجاتے ہیں
وقت کبھی برباد بھی کرنا پڑتا ہے

عرض ہی کرتے رہنے میں گھاٹا ہے بہت
کبھی کبھی ارشاد بھی کرنا پڑتا ہے
جلووں کے خوش رنگ پرندوں کی خاطر
آنکھوں کو صیاد بھی کرنا پڑتا ہے
آمد کے قائل تو ہم بھی ہیں لیکن
فن پارہ ایجاد بھی کرنا پڑتا ہے

○

جب بھی کوئی کتاب لکھوں گا
تیرے نام انتساب لکھوں گا
ہاتھ تو چھوڑ گردشِ دوراں
اس کے خط کا جواب لکھوں گا
آئینے پر تو میرا ،زور نہیں
میں تجھے لاجواب لکھوں گا
اس کو حق ہے وہ کچھ کہے مجھ کو
میں تو اس کو گلاب لکھوں گا
آئے گی جب بسنت پورنما
تیرا عہدِ شباب لکھوں گا

□□

مغیث الدین فریدیؔ

شعر کہہ کر مشاعروں میں سامعین سے داد و تحسین کا جذبہ وصول کرنے کے لیے بیتاب رہنے والے شاعروں کے جمِ غفیر میں کچھ ایسے بندۂ خدا بھی نظر آجاتے ہیں جو اپنی پُرگوئی اور متاثر کن شاعری کے باوجود داد و ستائش اور پذیرائی سے بے نیاز صرف اپنی دنیا میں گم رہتے ہیں اور ان کی شاعری کی خوشبو گھر آنگن تک ہی محدود رہتی ہے۔

مغیث الدین فریدیؔ بھی ایک ایسے ہی پُرگو اور بے نیاز قسم کے شاعر تھے جنھوں نے صرف تفننِ طبع کے لیے شاعری کی، بہت کہا، بہت لکھا لیکن اپنے مزاج کی وجہ سے مشاعروں سے ہی نہیں ادبی رسائل و جرائد سے بھی ہمیشہ دور رہے۔

مغیث الدین فریدی شیخ سلیم چشتیؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں فتح پور سیکری میں پیدا ہوئے۔ نہایت ہی علمی، ادبی اور مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی چند سال فتح پور سیکری میں گزارنے کے بعد ان کی زندگی کے وہ ماہ و سال جن میں شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے اور شعور پختگی کی منزلیں طے کرنے لگتا ہے آگرے میں گزرے۔ انٹرنس اور انٹر میڈیٹ کے امتحانات یہیں سے پاس کر کے انھوں نے آگرے کے سینٹ جونس کالج میں داخلہ لیا۔ سینٹ جونس کالج اپنے زمانے کا ایک اہم اور تاریخ ساز کالج تھا۔ اسی کالج میں ان کو اردو کے نامور اور ادبی مورخ اور نقاد جناب

حامد حسن قادری سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، جنھوں نے جواں سال طالب علم کی دیکھی اور ان دیکھی صلاحیتوں کو بیدار کیا، ان صلاحیتوں میں سب سے نمایاں صلاحیت شعر گوئی کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مغیث الدین فریدؔی کی شاعری اور تاریخ گوئی نے حامد حسن قادری مرحوم کی تربیت کا گہرا اثر قبول کیا۔ سینٹ جونس کالج سے بی اے کرنے کے بعد انھوں نے ایم۔ اے کے دو سال علی گڑھ میں گزارے۔ اس وقت کا علی گڑھ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، مسعود حسین خاں، خورشید الاسلام اور معین احسن جذبی جیسے اساتذہ اور اردو ادب کے مہارتھیوں کا علی گڑھ تھا۔ علی گڑھ سے اردو میں ایم۔ اے کرنے کے بعد مغیث الدین فریدؔی نے اپنی مادر علمی سینٹ جونس کالج کے شعبۂ اردو سے اپنے تدریسی سفر کا آغاز کیا۔ سینٹ جونس کالج میں سترہ سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد وہ ۱۹۶۲ء میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے۔ دہلی یونیورسٹی میں ایک طویل عرصہ تک درس و تدریس کے فرائض انجام دے کر وہ ۱۹۹۱ء میں صدرِ شعبۂ اردو کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور ۱۹۹۳ء میں کانپور میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

تقسیمِ وطن کے بعد دہلی میں تاریخ گوئی نسیم دہلوی مرحوم کے دم سے زندہ تھی۔ نسیم دہلوی صرف تاریخ گو شاعر تھے اور انھوں نے زندگی بھر اسی صنف میں طبع آزمائی کی۔ نسیم دہلوی کے انتقال کے بعد اس شہر میں تاریخ گوئی کی روایت کو مغیث الدین فریدی نے پروان چڑھایا۔ لیکن وہ جس طرح اپنی شاعری سے بے نیاز تھے اسی طرح تاریخ گوئی بھی ان کی بے نیازی کا شکار رہی یہی وجہ ہے کہ ان کی کہی ہوئی تاریخیں یکجا نہیں ملتیں۔

''کفرِ تمنا'' اس پُر گو شاعر کا مختصر سا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۷ء میں اردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے منظرِ عام پر آیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

عزمِ ترکِ طلب دل میں پیدا ہوا ان سے ملنے کی اک آرزو کی طرح
اب جنوں میں بھی رنگِ شعور آگیا چاک کرتے ہیں دامن رفو کی طرح

تجھ کو کھویا نہیں تجھ کو پایا نہیں، ہاتھ خالی سہی دل تو شاداب ہے
اک بے نام بے رنگ سی کیفیت روح پر چھا گئی رنگ و بو کی طرح

ہم ہی مارے گئے ہم ہی رسوا ہوئے تیرے دامن پہ کوئی بھی دھبہ نہیں
جم گئی ہے مگر دامنِ وقت پر یہ وفا دشمنی بھی لہو کی طرح

وقت کے ساتھ قدریں بدلتی رہیں مصلحت ہر قدم پر ڈبوتی رہی
غیرتِ دل اگر یونہی سوتی رہی جان بھی جائے گی آبرو کی طرح

کس سے محنت کا اپنی صلہ مانگتے ذرّہ ذرّہ ہمارا ہی محتاج تھا
دشتِ امکاں کو ہم نے مہک بخش دی جھوم کر ہو آئے مشکبو کی طرح

حکم یہ ہے کہ رنگِ شکستہ بھی اب ترجمانِ غم و دردِ ہستی نہ ہو
بے زبانی پہ پابندیاں لگ گئیں آپ کی بزم میں گفتگو کی طرح

ہے فریدی تقاضائے رنگِ غزل ذہن کی روشنی روح کی تازگی
شعلہ احساس کا پیکرِ حرف میں ڈھل کے نکھرے کسی شعلہ رو کی طرح

○

یہ اور بات ہے کہ بدظن ہے راہبر ہم سے
سنور گئی ہے مگر تیری رہگزر ہم سے

جہاں ملاتا نہیں کوئی بھی نظر ہم سے
کلام کرتے ہیں اس گھر کے بام و در ہم سے

جدا ہوئے ہیں وہ جب بھی تو یہ ہوا محسوس
کہ جیسے اب نہ ملیں گے وہ عمر بھر ہم سے

ہماری بے بصری پر وہ طنز کرتے ہیں
جو کم نگاہ بنے صاحبِ نظر ہم سے
سفر کی آخری منزل ہے اور ہم تنہا
بچھڑ کے رہ گیا ایک ایک ہم سفر ہم سے
جئیں تو کیسے جئیں، جان دیں تو کس پر دیں
کہ ذرّہ ذرّہ یہاں مانگتا ہے سر ہم سے
دعائیں دیجیے قاتل کے دست بازو کو
علاج پوچھنے آیا ہے چارہ گر ہم سے
ملا کے ہم سے نظر آئینہ ذرا دیکھو
کہاں ملیں گے تمھیں صاحبِ نظر ہم سے
بسے ہوئے ہیں جو لمحے تمھاری خوشبو میں
تمھارا ذکر ہی کرتے ہیں رات بھر ہم سے

○

ہستی کے ہر اک موڑ پہ آئینہ بنا ہوں
مٹ مٹ کے اُبھرتا ہوا نقشِ کفِ پا ہوں
وہ دستِ طلب ہوں جو دعا کو نہیں اٹھتا
جو لب پہ کسی کے نہیں آتی وہ دعا ہوں
رہ رہ کے کھٹکتا ہوں دلِ اہلِ ہوس میں
کانٹے کی طرح چبھتے ہی میں ٹوٹ گیا ہوں
اس دور میں انسان کا چہرہ نہیں ملتا
کب سے میں نقابوں کی تہیں کھول رہا ہوں
جاتی ہی نہیں دل سے تری یاد کی خوشبو
میں دورِ خزاں میں بھی مہکتا ہی رہا ہوں

رقصِ شررِ جاں دل گیتی کی ہے دھڑکن
میں اپنی بھی آواز ہوں سب کی بھی صدا ہوں

کیا عرضِ ہنر لفظ پرستوں میں فریدیؔ
آئینے کے ہاتھوں پہ حنا باندھ رہا ہوں

○

ہم نے تنہا نشینی خریدی تو ہے رونق و شورشِ انجمن بیچ کر
شمع محرابِ دل میں جلائی تو ہے آرزوؤں کا اپنی کفن بیچ کر
مطمئن ہیں بہت آج اربابِ فن اپنا سرمایۂ فکر و فن بیچ کر
جیسے آئینہ رکھ دے کوئی ماہوش حلقۂ زلف کا بانکپن بیچ کر
کھوگیا درد ہنگامۂ شہر میں، لٹ رہی ہے دکانِ متاعِ نظر
اب بھی توفیق اگر ہے تو اہلِ جنوں بڑھ کے لے لو اسے جان و تن بیچ کر
رُت بدلتی رہی، رنگ اڑتے رہے کم نظر باغباں کم نظر ہی رہے
اک خیاباں کو سیراب کرتے رہے آبروئے بہارِ چمن بیچ کر
ہے فریدیؔ عجب رنگِ بزمِ جہاں مٹ رہا ہے یہاں فرقِ سود و زیاں
نو [illegible] تاروں سے لینے لگا آفتاب اپنی اک اک کرن بیچ کر

○

ہر کرن وقت پہ آئینہ دکھایا ہے مجھے
زندگی تو نے بڑے پیار سے برتا ہے مجھے
بڑھ کے چومے ہیں غمِ عشق نے بھی میرے قدم
غمِ دوراں نے بھی آنکھوں پہ بٹھایا ہے مجھے
راہ پُر پیچ پہ ہے زلفِ رسا کا دھوکا
دشت آغوشِ تمنا نظر آیا ہے مجھے
اپنے غم خوار کے اشکوں کو تکا کرتا ہوں
گردشِ وقت نے پلکوں پہ سجایا ہے مجھے

اب کسی درد کا شکوہ نہ کسی غم کا گلہ
میری ہستی نے بڑی دیر میں پایا ہے مجھے
میں غمِ دہر کی چادر میں چھپا بیٹھا تھ
رات بھر آ کے تری یاد نے ڈھونڈا ہے مجھے

○

اندازِ سخن مصلحت آمیز بہت ہے
پھر بھی یہ ادا تیری دلآویز بہت ہے
آشفتہ مزاجی پہ مری طنز نہ کیجیے
اندازِ جہاں بھی تو جنوں خیز بہت ہے
ہم سے وہ ملا ہے تو کھلے دل سے ملا ہے
دنیا کو شکایت ہے کم آمیز بہت ہے
ہم اس سے جدا ہو کے بھی یوں جھوم رہے ہیں
جیسے کہ یہ لمحہ بھی طرب خیز بہت ہے
اک بار بھی تھرّائی نہ لو شمعِ وفا کی
سنتے تھے زمانے کی ہوا تیز بہت ہے
تم ابرِ کرم بن کے ذرا آ کے تو دیکھو
خاکِ دلِ برباد بھی زرخیز بہت ہے
کچھ اور شکایت تو نہیں تیری نظر سے
یہ بات الگ ہے کہ ذرا تیز بہت ہے
اب دیکھیے کس رنگ میں یہ شام ڈھلے گی
کچھ گردشِ حالات کی لے تیز بہت ہے

□□

من موہن تلخ

مشاعروں میں روایتی غزل کا مذاق رکھنے والے سامعین اور رسمی مضامین کے شیدائیوں سے داد وتحسین لوٹنے والے شاعروں کے ہجوم کی طرح اردو دنیا میں ایسے شاعروں کی بھی کمی نہیں جن کی شاعری مشاعروں میں سننے اور سر دھننے والی شاعری نہیں ہے بلکہ پُرسکون تنہائیوں میں ادبی رسائل و جرائد کے حوالوں سے پڑھنے اور لطف اندوز ہونے سے تعلق رکھتی ہے۔ من موہن تلخ بھی شاعروں کے اسی زمرے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے نامانوس لہجے، اسلوب کے کھردرے پن، آہنگ کی ناہمواری اور تجربوں کی بہ ظاہر قدرے غیر شاعرانہ کیفیت کی وجہ سے مشاعروں میں سننے اور سر دھننے کے شاعر نہیں تھے۔ ان کے لہجے کے کھردرے پن اور غزل کے یکسر مختلف انداز نے ان کو اپنے ہم عصروں کے لیے بھی اجنبی بنا دیا تھا۔

تلخ ۹/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ناگپور میں پیدا ہوئے۔ صحافت کے پیشے سے تعلق رکھتے تھے اور دہلی کے روزنامہ ''پرتاپ'' جیسے مشہور اخبار سے وابستہ تھے۔ شاعری میں مرزا یگانہ چنگیزی جیسے بلند قامت اور منفرد شاعر کے شاگرد تھے۔ یگانہ کو اپنے معاصرین میں جس چیز نے منفرد ٹھہرایا وہ ان کے مزاج اور شعری رویے کی ٹیڑھ تھی۔ اسی ٹیڑھ کی وجہ سے مرزا اپنے معاصرین کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے مزاج اور شعری رویے کی یہی ٹیڑھ تلخ

تک ورثے میں پہنچی یہی وجہ ہے کہ تلخ کی شاعری کا رنگ بھی اپنے تمام ہم عصر غزل گویوں سے مختلف ہے۔ وہ نہ تو عام روش پر چلنے کو کبھی تیار ہوئے اور نہ زمانے سے کسی طرح کی مصالحت کی۔

تلخ نے ۱۴رفروری ۲۰۰۱ء کو دہلی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔'' لا پتہ'' ان کا آخری شعری مجموعہ ہے جس کو جولائی ۲۰۰۱ء میں ان کی بیگم نے مرتب کر کے شائع کیا۔ اس سے پہلے ان کے پانچ شعری مجموعے'' چراغِ فکر'' (۱۹۵۸ء)،'' جذبہ و آواز'' (۱۹۶۹ء)، '' خرابہ'' (۱۹۷۲ء) ''تکمیل'' (۱۹۹۷ء) اور '' وسیلہ'' (۱۹۹۹ء) منظرِ عام پر آ کر اہلِ نظر سے داد وصول کر چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

بھلے ہی دُکھ مجھے دے سب کو تو بتا کر دے
بس ایک دن مجھے اے دل تو لا پتہ کر دے

کیا تو کچھ نہیں، بدنام کر دیا ہے یہ اور
یہ کب کہا ہے کہ آسان راستہ کر دے

وہ سب کہانیاں سچ ہیں تو پھر یہ انساں سے
مجھے بھی جن کوئی چھوٹی سی فاختہ کر دے

ہمیں ہے موت بھی منظور اگر وہ ہنس کر دے
اور اس کا یہ ہے چلن جو بھی دے ستا کر دے

ذرا سی میری مدد کر کہ گھر میں آکر بھی
میں خود کو پوچھ رہا ہوں ذرا پتہ کر دے

سخی تو تلخ کوئی ہے، ہمیں قبول نہیں
یہ کوئی بات ہے ایک ایک کو جتا کر دے

○

چاپ ہوں اپنے پاؤں کی میں اپنے ہی من کی گلی میں
میرے آنے جانے کی پہچان ہے میرے جی میں
میں اپنے ہی دروازے پر دھیمی سی اک دستک
جان سکے تو جان لے کوئی میرا بھید اسی میں
بانٹنے تھے جو درد مجھے میری آواز میں ہیں اب
میری خوشیاں بول رہی ہیں میری خاموشی میں
یونہی بھٹکنے چل دوں، خود کو ڈھونڈھنے خود سے باہر
کوئی ٹھکانہ ہے کیا آجائے کب میرے جی میں
اس غم کا کیا ہوگا خود کو جان نہ میں جو پایا
باقی غم تو بھول بھی جاؤں گا میں ایک ہنسی میں
بس وہ ایک 'نہیں' تھی بھاری جیون بھر کی 'ہاں' پر
جب یہ حکم ہوا تھا جھکنا ہوگا اس نگری میں
ہر دو ملنے والوں کا دل تلخ بجھا سا کیوں ہے
میں حیراں اس بات پہ ہوں کیا ڈھونڈھے کوئی کسی میں

○

ایک دن سب مل لیے پل بھر کو خود سے بھی کہیں
بس پھر اس کے بعد تھا کوئی کہیں کوئی کہیں
پوچھنا ہے خود سے پوچھو کیا جواب آیا کوئی
پوچھتے ہو مجھ سے کیا آواز پہنچی بھی کہیں
میرے ہر احساس کا گھر میں گلا گھونٹا گیا
مجھ کو حیرت ہے خبر یہ کس طرح پہنچی کہیں
پوچھتا ہوں اب تو اپنے گھر کی دیواروں سے میں
اس قدر بیگانگی تم نے کبھی دیکھی کہیں

پار کر آیا ہوں کب کا میں حدِ دیوانگی
پوچھتے ہو تم حد ادراک کی؟ ہوگی کہیں

لگ گیا تھا جی کہیں اپنا بھی یہ سب جھوٹ ہے
ہم تو خود میں ہی نہیں تھے کیا بہلتا جی کہیں

تلخ یہ اب تک جو چرچے سے کسی گم صم کے ہیں
چلتے چلتے رک گئے ہوں گے تو پھر ہم ہی کہیں

○

کسی کے ساتھ نہ ہونے کے دُکھ بھی جھیلے ہیں
کسی کے ساتھ مگر اور بھی اکیلے ہیں

اب اس کے بعد نہ جانے نصیب میں کیا ہے
نہ ساتھ آؤ ، ہمارے بہت جھمیلے ہیں

کہاں ہے یادِ ملا کوئی کٹ تو کب بچھڑا
ہم اپنے دھیان سے اترے ہوئے سے میلے ہیں

کہو نہ مجھ سے کہ چلتے ہیں اب ملیں گے پھر
یہ کھیل وہ ہیں کہ صدیوں سے لوگ کھیلے ہیں

جو گھر میں جاؤں تو آواز تک نہیں کوئی
گلی میں آؤں تو ہر سو صدا کے ریلے ہیں

جو لوگ بھول بھلیاں ہیں تلخ اب اپنی
نہیں وہ صرف اکیلے بہت اکیلے ہیں

○

یہ آج کیا مجھے بے وجہ اک خیال آیا
کہ خود کو سب سے الگ راستے پہ ڈال آیا

مرے لیے ہی رُکا تھا ذرا سا آج یہ وقت
اور آج ہی میں کہیں خود کو بھول بھال آیا

یہ جھوٹی دوستیاں ختم ہوں تو اچھا ہے
مگر گیا جو یہ کہنے تو بات ٹال آیا

بنے ہوئے ہیں جواب میری جان کا جنجال
کئی وبال تو میں راہ چلتے پال آیا

کھنڈر نہ کہہ تو انھیں یہ ہیں مدفنِ تہذیب
انھیں سے پوچھ کیسے کس طرح زوال آیا

میں خود کو جمع کہیں کر کے مل کے خود سے آج
بہت تھکا ہوا آیا بہت نڈھال آیا

گلہ بجا ترا اے زندگی کہ تیرے قریب
میں جتنی بار بھی آیا تو بے خیال آیا

میں اپنی بات جواب خود سے کر سا لیتا ہوں
تو بس یہ جان کہ اب آ کے یہ کمال آیا

نہیں تھا مجھ سا کوئی بزم بے خیالاں میں
کہ چونک اٹھے سبھی یہ کون بے خیال آیا

کیا ہے یوں نظر انداز عمر بھر خود کو
مرے ہی سامنے میرا ہی اب سوال آیا

میں خود سے اس قدر آیا دُکھی کہ خود کو کہیں
بس آج لے گیا اور خوب بول بال آیا

سنا تھا رنج ہے تجھ کو بہت سی باتوں کا
سو آج تلخ میں وہ سب ذہن سے نکال آیا

○

سامنے اپنے جو رہ رہ کے میں آتا ہوں بہت
اجنبی خود کو اب لیے پاتا ہوں بہت

مت ہو نالاں، کہے جاتا ہوں میں جاتے جاتے
جس جگہ سے بھی گیا یاد میں آتا ہوں بہت
دل ہی دل میں کبھی ہنس لوں تو میں ہنس لوں خود پر
ورنہ سچ یہ ہے کہ چُپ چُپ نظر آتا ہوں بہت
خود سے بھی دور، بہت دور نکل جاتا ہوں
خود سے ملنے کے لیے یوں تو میں جاتا ہوں بہت
کس سے کہتا ہوں یہ کرتے ہوئے باتیں خود سے
پاس رہ میرے کہ دھوکے بھی میں کھاتا ہوں بہت
خود پہ ہوتا ہوں عیاں یوں تو میں ہر لحظہ مگر
کوئی بیٹھا ہو تو میں خود کو چھپاتا ہوں بہت
میں ہوں اک گم شدہ کیفیتِ دل، سنتا ہوں
گم سی حالت میں کبھی خود کو بلاتا ہوں بہت
جب چھپانی ہو کوئی بات کسی سے اپنی
تب مجھے دیکھیے باتیں میں بناتا ہوں بہت
کر رہا ہوں میں تری بات کوئی، سو خود کو
یاد آنے دے مجھے، بھولتا جاتا ہوں بہت
تلخ میں دور کھڑے دیکھتا ہوں جب خود کو
مل ہی جاتی ہے نظر، آنکھ بچاتا ہوں بہت

□□

منظور دہلوی

منظور دہلوی تقسیمِ وطن سے قبل دہلی کے مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ خراد کے ماہر کاریگر تھے، تعلیم واجبی سی تھی لیکن شعر اچھا کہتے تھے اور اچھا پڑھتے تھے۔ شاعری میں حضرتِ غافل امروہوی کے شاگرد تھے۔ تقسیمِ وطن سے قبل اور اس کے آس پاس دہلی کے صفِ اول کے شعراء کو چھوڑ کر دوسرے شعراء ادبی رسائل و جرائد میں چھپنے چھپانے سے دور رہتے تھے اور ان کی شاعری صرف مقامی مشاعروں تک ہی محدود رہتی تھی۔ منظور دہلوی بھی اس دور کے ان شاعروں میں سے تھے جن کا کلام ادبی رسائل و جرائد میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔

منظور دہلوی ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں کراچی ہجرت کر گئے تھے جہاں ۱۹۵۹ء میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وارثین کی شعر و ادب سے عدم دلچسپی کی وجہ سے ان کا تمام شعری اثاثہ ضائع ہو گیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

تعریف ہماری پیشِ عدو، ایک بار ستمگر اور سہی
یہ ہم پہ عنایت اور سہی، یہ قندِ مکرر اور سہی

قاتل جو بنو تو خوب بنو، ارمان کوئی باقی نہ رہے
شمشیر جو کی ہے زیبِ کمر تو ہاتھ میں خنجر اور سہی

دیوانہ ترا دیوانہ ہے، دیوانے کا رتبہ بالا کر
اور مہندی بھرے ہاتھوں والے دو چار پتھر اور سہی

منظور ہاشمی دہلوی

منظور احمد ہاشمی المتخلص بہ منظور دہلوی ۱۲؍جنوری ۱۹۴۲ء کو پرانی دہلی کے کوچہ پنڈت میں پیدا ہوئے جہاں ان کا خاندان کئی نسلوں سے آباد ہے۔ گھر کے نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیم آٹھویں جماعت سے آگے نہ بڑھی لیکن ان کے والد کی شعروادب سے غیر معمولی دلچسپی نے ان کو شاعر بنا دیا۔ ان کے والد شاعر تو نہیں تھے لیکن سخن فہم تھے اور اچھا شعری ذوق رکھتے تھے۔ دہلی کے بیشتر شعراء سے دوستی تھی، مشاعروں اور شعری نشستوں میں جاتے تو ان کو ہمراہ لے جاتے تھے اس طرح منظور نے شعری ماحول میں ہوش سنبھالا۔ استاد بشیرالدین عنبر دہلوی، جن کی وفات کے بعد وارثین کی ادب سے عدم دلچسپی کی وجہ سے تمام شعری اثاثہ ضائع ہو گیا، ہم محلّہ تھے، ان کی قربت میں شعرگوئی کا ذوق پروان چڑھا۔ ابتدائے شاعری میں جناب عنبر دہلوی سے اصلاح لی، لیکن بعد میں نظمی سکندرآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔

منظور دہلوی خوبصورت شاعرانہ ترنم کے مالک ہیں لیکن اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے دہلی کی شعری و ادبی سرگرمیوں سے دور رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے شعراء کی بھیڑ میں دور سے پہچانے جاتے ہیں۔

''شہرِ سخن'' منظور دہلوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۱ء میں اردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے منظرِ عام پر آیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

ہم اگر خود کو گرفتارِ محبت جانیں
"زخم کو پھول کہیں درد کو راحت جانیں"

ہو نظر اپنی محبت کے تقاضوں پہ اگر
ہم ستم کو بھی تیرے تیری عنایت جانیں

دل یہ کہتا ہے تجھے خلد کا تحفہ سمجھیں
تو جہاں آئے نظر ہم اُسے جنت جانیں

راہ میں پیار کی سرگرمِ سفر ہیں جو لوگ
سچ تو یہ ہے کہ وہی پیار کی قیمت جانیں

زندگی باغ کے پژمردہ گلوں کو مل جائے
دیش پہ مرنا اگر اہلِ سیاست جانیں

سچ تو یہ ہے نہ ہو مرنے کا تاسف کوئی
زندگانی کو اگر اُس کی امانت جانیں

آدمیت کا تقاضہ بھی یہی ہے منظور
اپنی عزت کی طرح غیر کی عزت جانیں

○

بہت باتیں ہیں کہنے کے لیے جب
نہیں کھلتے کسی کے سامنے لب

لُٹا دیتے ہیں جب سب کچھ خوشی میں
ہمیں بھی ہوش آتا ہے مگر کب

چُنا تھا ایک گل سارے چمن میں
تجھے وہ بھی نہیں منظور یارب

نہیں سنتے بڑوں کی بات کوئی
نظر آتے نہیں بچے مہذب
خوشی اتنی ہوئی مل کر کسی سے
بھلا بیٹھے ہوں جیسے رنج و غم سب
نہ ٹالو وعدۂ فردا پہ ہم کو
مزا جب ہے بڑھے دستِ کرم اب
محبت ہے مرا منظورؔ مسلک
نہیں کوئی مجھے دنیا سے مطلب

○

وہ میرے سامنے آئے تو جھکالیں آنکھیں
ہوگئے آنکھ سے اوجھل تو بہالیں آنکھیں
دل کے آئینے پہ کیوں ٹھیس لگادی اُٹھ کر
طالبِ دید تھے ہم، تم نے چرالیں آنکھیں
کوئی غیروں کی نگاہوں سے تعلق نہ رہا
ہم نے جس دن سے تیری دل میں بسالیں آنکھیں
آ گیا اُس کی بھی آنکھوں کو شرارت کرنا
جس نے آنکھوں سے تیری اپنی ملالیں آنکھیں
خوفِ رسوائی بہر گام رہا پیشِ نظر
ہم نے ہر دیکھنے والے سے چھپالیں آنکھیں
عقل حیران ہوئی دل بھی پریشان ہوا
کیا ہوا کس لیے، کیوں اُس سے چرالیں آنکھیں
میرے احباب اُسی دن سے خفا ہیں منظورؔ
میں نے جس روز سے آئینہ بنالیں آنکھیں

○

زندگی اک سراب ہے صاحب
خوبصورت سا خواب ہے صاحب
وقتِ پیری سحر کا نور نہیں
ڈوبتا آفتاب ہے صاحب
جانے کیسی چلی ہے بادِ صبا
ہر کلی بے حجاب ہے صاحب
ہے رقم زندگی کا ہر مضمون
چہرہ ایسی کتاب ہے صاحب
زندگی ہے سوال پیچیدہ
موت اُس کا جواب ہے صاحب
روزِ محشر حساب کیسے ہو
ہر گنہ بے حساب ہے صاحب
گنہگاری کا دور ہے منظورؔ
پارسائی عذاب ہے صاحب

○

میرے حق میں مرے اپنوں کی دُعا ہے تو سہی
مہرباں مجھ پہ ابھی میرا خدا ہے تو سہی
میں ستم سہہ کے بھی اُن کے کبھی برہم نہ ہوا
میرا انداز زمانے سے جدا ہے تو سہی
وہ بھی جیتے ہیں جہاں میں نہیں جن کی توقیر
میرے سر پر میری عزت کی رِدا ہے تو سہی
آگ نفرت کی ہر اک دل میں لگی ہے گویا
اب بھی انسان سے انسان جدا ہے تو سہی

آپ آجائیں شبِ ہجر تو محسوس کریں
"کوئی بیمارِ محبت کی دوا ہے تو سہی"

بزم میں آنکھ نہیں اُٹھتی حیا سے اکثر
حسن پر اپنے کوئی آپ فدا ہے تو سہی

یاد کر لیتے ہیں بھولے سے ہمیں بھی منظورؔ
کم سہی پھر بھی حسینوں میں وفا ہے تو سہی

○

تم جدھر سے گزر گئے ہوتے
راہ چلتے ٹھہر گئے ہوتے

قتل نظروں سے کر گئے ہوتے
جُرم اوروں کے سر گئے ہوتے

دیکھ کر ساتھ ہم کو محفل میں
کتنے چہرے اُتر گئے ہوتے

دیکھ لیتے جو طائرانِ چمن
نوچ کر بال و پر گئے ہوتے

ہم تو جیتے ہیں دیکھ کر تم کو
ورنہ ہم کب کے مر گئے ہوتے

شام ہوتے ہی کیوں لگے جانے
شب کو پچھلے پہر گئے ہوتے

ہم بچھڑتے جو راہ میں منظورؔ
وہ اُدھر ہم اِدھر گئے ہوتے

□□

منور حسن کمالؔ

منور حسن کمالؔ کا خاندانی نام سید منور حسن کاظمی ہے۔ یہ ۹/ اگست ۱۹۵۹ء کو مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں جناب افسر آغا لکھنوی کے شاگرد ہیں۔
صحافت کے پیشے سے وابستہ ہیں اور اردو شعر و ادب کی خاموش خدمت کر رہے ہیں۔ شاعری کے ساتھ تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

ظلمتوں کا جواب دے بابا
ہم سفر، ماہ تاب دے بابا

اس کے جلووں کو دیکھ پاؤں میں
چشمِ خیرہ کو تاب دے بابا

دشمنوں کی نظر میں چبھتا ہوں
سرمۂ سدِّ باب دے بابا

ہر بشر احتساب خوردہ ہے
کون کس کو حساب دے بابا
نفرتوں کے نگر میں ٹھیرا ہوں
پیار کا آفتاب دے بابا
خامشی سدِّ باب ، ناممکن
کچھ تو مجھ کو جواب دے بابا
ایک مدت سے ہے کمالؔ اُداس
کوئی تازہ گلاب دے بابا

○

راہ کب تک دکھائے گا پتھر
ایک دن ٹوٹ جائے گا پتھر
کتنے ہاتھوں میں جائے گا پتھر
تب کہیں جگمگائے گا پتھر
میری جانب اچھالنے والے
تیرے سر پر بھی آئے گا پتھر
اک محبت کا واقعہ لے کر
کتنے فتنے اٹھائے گا پتھر
مجھ سے رسماً ہی گفتگو کر لے
اور کتنا ستائے گا پتھر
سیدھا رستہ بھی بھول جائے گا
ایسا صحرا دکھائے گا پتھر
کیوں منوّر اُداس ہے آخر
پھول دل کے کھلائے گا پتھر

○

فصیلِ غم کی بلندیوں کو بحال رکھنا، بس اتنا کرنا
وفا کے پنچھی اڑا نہ دینا نڈھال رکھنا، بس اتنا کرنا

ہر ایک دامن پہ اس نگر میں سیاہ دھبّے اٹے پڑے ہیں
تم اپنی پاکیزہ دامنی کو سنبھال رکھنا، بس اتنا کرنا

ہمارے گھر کے شناسا چہرے بھی ناشناسا سے لگ رہے ہیں
کہاں گئے روشناس چہرے سوال رکھنا، بس اتنا کرنا

یہ دشتِ غربت کا راستہ ہے، اسی میں ہم سب کی عافیت ہے
ہر ایک خواہش، ہر اک ضرورت کو ٹال رکھنا، بس اتنا کرنا

کمالؔ کہنا مرا یہی ہے، کمال انساں کا بس یہی ہے
ضمیر و دل کی بلندیوں کو بحال رکھنا، بس اتنا کرنا

○

ہم تری بزم میں کب لطف اٹھانے آئے
دیپ، احساس کی پلکوں پہ جلانے آئے

بارہا رات میں خوشبو کے خزانے آئے
صبح تک بھی نہ ہمیں ناز اٹھانے آئے

چاہتے آپ نہیں مجھ کو یہ مجھ کو تسلیم
یہ دبے پاؤں جو پھر آپ سرہانے آئے

رات کے پچھلے پہر چھت پہ وہ مجھ سے ملنے
کبھی گرمی، کبھی پانی کے بہانے آئے

جب کبھی گھیر لیا فکر جہاں داری نے
اس کے خط عہدِ وفا یاد دلانے آئے

راس آیا نہیں وہ شوخ سہارا مجھ کو
اپنے حصے میں تو بس خواب سہانے آئے
میں نئی نسل کو کرتا ہوں کمالؔ آج سلام
کام جب آئے تو احباب پرانے آئے

○

قلب تیرا ہو چکا ہے قاش قاش
تو فقط اب بیٹھ کر سپنے تراش
بے دِلی ، اُکتاہٹیں اور خامشی
اب نہ کوئی اضطراب و ارتعاش
انگلیاں اٹھنے لگیں کردار پر
بھول کیا تجھ سے ہوئی ہے کوئی فاش
دامنِ شب کے ستارو! الوداع
میری بے چینی چھپاتے تم ہی کاش!
یوں برہنہ ہے سیاست آج کی
ہیں مسلط مسندوں پر بدقماش
ضبط، خودداری، مروّت اب کہاں
بس ہے دامن گیر اک فکرِ معاش
منزلوں کی سمت اٹھے جب کبھی
راہ کے پتھر ہوئے ہیں پاش پاش
پھول چہرہ خوشبوؤں کا مستقر
زلف عنبر ،جسم سونا خیر باش
منہ ترا اُترا ہوا ہے کیوں کمالؔ
داستاں سن لی کوئی کیا دل خراش

○

بے ثباتی وقت کی قائم نہیں رہ پائے گی
زندگی ہر حال کو اک آئینہ دکھلائے گی

پھر نسیمِ صبح بھی اٹھکھیلیوں پر آئے گی
پھر تری زلفِ معطر گلستاں مہکائے گی

کون جانے کون سا پل زندگی پہ بار ہو
کون جانے کس گھڑی اپنی بھی باری آئے گی

زندگی کی بھیڑ میں ہم زندگی کو ڈھونڈ لیں
زندگی شاید نیا اک ہم سفر دے جائے گی

نقشِ پا درکار ہیں مجھ کو نہ رہبر کی تلاش
لمس کی خوشبو مجھے گھر تک ترے لے جائے گی

ناز برداری کرو تم لاکھ لیکن اے کمالؔ
کج ادائی حسن کی اک حادثہ بن جائے گی

□□

منور لکھنوی

منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی غالباً اردو دنیا کے واحد شاعر ہیں جن کے خاندان میں ایک دو بزرگوں نے نہیں بلکہ ہر بزرگ نے شاعری کی اور شاعری کا یہ سلسلہ پانچ پشتوں تک چلا اور ہر پشت میں نامور شاعر پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کے اس ذی علم کائستھ خاندان میں پشتینی شاعری کا یہ سلسلہ آنجہانی اودے راج مطلع سے شروع ہو کر اسیشری پرشاد شعاع، پورن چند ذرہ اور ان کے تینوں بیٹوں منشی رام سہائے تمنا، منشی ماتا پرشاد نسیاں اور منشی دوارکا پرشاد اُفق سے ہوتا ہوا پانچویں پشت میں منشی بشیشور پرشاد منور تک پہنچتا ہے۔

بشیشور پرشاد منور ۸ر جولائی ۱۸۹۷ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ منشی دوارکا پرشاد افق جو چوتھی پشت میں اپنے جدِ امجد آنجہانی منشی اودے راج مطلع کی شعری و ادبی روایتوں کو نباہ رہے تھے، منور کے والد ماجد تھے۔ آنجہانی اُفق خود بہت اچھے شاعر تھے اور نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ آنجہانی اُفق نے تجربے کے طور پر ایک منظوم اخبار بھی نکالنا شروع کیا تھا۔ رامائن یک قافیہ اور گورو گوبند سنگھ کی منظوم سوانح عمری اُفق کے اہم ادبی کاموں میں سے ہیں، جن کا ایک زمانے میں کافی چرچا رہا۔

منور نے تقریباً تیرہ چودہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا لیکن اپنے باپ سے اصلاح لینے کی بجائے منشی نوبت رائے نظر کا تلمذ اختیار کیا۔ منشی نوبت رائے نظر کا شمار اپنے

وقت کے مشہور اور ممتاز غزل گو شعراء میں ہوتا تھا۔ منشی بشیشور پرشاد منوؔر ۱۹۲۹ء میں بسلسلۂ ملازمت دہلی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ منوؔر اپنے بزرگوں کی طرح ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ انھوں نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے۔ ''نذرِادب'' منوؔر کی رُباعیات کا مجموعہ جو ۱۹۲۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ دوسرا شعری مجموعہ '' کائناتِ دل'' نظموں پر مشتمل ہے جو ۱۹۳۹ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ ''نوائے کفر'' اور'' ادائے کفر'' غزلوں کے مجموعے ہیں جن کو ۱۹۶۱ء میں جناب راج نرائن رازؔ اور ۱۹۶۲ء میں جناب جگدیش حیاتؔ بھٹنا گر نے بالترتیب مرتب کیا۔

آنجہانی منوؔر لکھنوی نے رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور '' گیا نجلی'' اردو میں ترجمہ کیا تھا جسے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا۔ وہ ایک اچھے شاعر ہی نہیں بہت اچھے مترجم بھی تھے۔ عمر کے ایک حصّے میں ترجمہ ان کا ذریعۂ معاش بن گیا تھا، اسی لیے ان کی طبع زاد کتابوں کی تعداد مختصر ہے، لیکن تراجم کی فہرست کافی طویل ہے۔

منوؔر لکھنوی نے خالص اردو تہذیب میں آنکھ کھولی اور تمام زندگی اردو ماحول میں گزاری۔ ان کے اپنے گھر کے علاوہ ننیہال اور سسرال میں بھی خالص شاعرانہ ماحول تھا، حتیٰ کہ گھر کی کچھ خواتین بھی اردو میں شعر کہا کرتی تھیں۔ لکھنؤ اور دہلی میں اُن کے خانوادے کی پہچان صرف اردو کی ہی مرہونِ منت تھی، لیکن ان کی اردو پرستی کا یہ عالم تھا کہ مردم شماری کے موقع پر وہ اردو کے تئیں اپنے پورجوں کی خدمات کو یکسر فراموش کر کے اپنی اور اپنے گھر والوں کی زبان ہمیشہ ہی '' ہندی'' لکھایا کرتے تھے۔ منوؔر کا اردو کے تئیں یہ رویہ ان کی اپنی ذات تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے والے اپنے دوستوں کو بھی اس امر کی تلقین کیا کرتے تھے۔

منوؔر لکھنوی کا انتقال ۲۴ مئی ۱۹۷۰ء کو دہلی میں ہوا اور ان کے انتقال کے ساتھ دولتِ شعر و ادب اور اردو بھی پشتینی شاعروں کے گھر سے رخصت ہو گئی۔

نمونۂ کلام:

غزل

ہوں محوِ جستجوئے سکوں انتشار میں
منزل کی ہے تلاش ہجومِ غبار میں

مجبوریوں پہ بھی ہے یہ عالم، خدا کی شان
دنیا کی طاقتیں ہیں مرے اختیار میں

خود اپنے رنگ و بو پہ جسے اعتماد ہو
ایسا بھی کوئی پھول کھلا ہے بہار میں

سمجھوں گا آسماں کے اُسی رنگ کو میں رنگ
چڑھ جائے جو مری نگہِ اعتبار میں

میری نظر کا دور ہے شمس و قمر کا دور
مری روش ہے گردشِ لیل و نہار میں

ان سے مرے مزاج کی آسودگی نہیں
کھلنے کو پھول لاکھ کھلے ہیں بہار میں

کیا جانے کس سوال کا پایا ہے کیا جواب
آنسو بھرے ہیں دیدۂ امّیدوار میں

کیا فکرِ کیف و کم سے منوّر مجھے غرض
اک مست ہوں میں خم کدۂ روزگار میں

○

پتہ چمن کا بیاباں سے پوچھ تو لیتے
نشاں ترا دلِ ویراں سے پوچھ تو لیتے

کہیں نتیجۂ تالیفِ اہرمن تو نہیں
سبب وجود کا یزداں سے پوچھ تو لیتے

یہ کس کی ضد سے بکھرنے پہ ہو گئی مجبور
تم اپنی زلفِ پریشاں سے پوچھ تو لیتے
نمود یہ سرِ بازار ہے گوارا بھی
جمالِ یوسفِ کنعاں سے پوچھ تو لیتے
کھلے گا بھی مزے ماضی سے رازِ مستقبل
یہ راز گردشِ دوراں سے پوچھ تو لیتے
حیاتِ نو کا اسے بخشنا بجا ہی سہی
مگر منوّرِ بے جاں سے پوچھ تو لیتے

○

یہ ہر افسانہ آسان و مشکل یاد رکھتا ہے
زمانے بھر کی گویا داستاں دل یاد رکھتا ہے
عبورِ بحر کی ایک ایک مشکل یاد رکھتا ہے
شناور ہر ادائے موجِ ساحل یاد رکھتا ہے
طریقِ عشق کا ہر پیچ و خم دل یاد رکھتا ہے
سفر کا تجربہ منزل بہ منزل یاد رکھتا ہے
بھلا دینے میں بھی تجھ کو چھپا ہے یاد کا پہلو
تری صورت کو اس صورت میں بھی دل یاد رکھتا ہے
کہاں تک دیکھیے روداد رہتی ہے محبت کی
کہاں تک دیکھیے یہ داستاں دل یاد رکھتا ہے
دلوں میں نقش ہو جاتے ہیں سب پہلو محبت کے
مقابل کو بہر صورت مقابل یاد رکھتا ہے
محبت سے بدل دے آدمی جذبِ عداوت کو
اسے دل بھول جاتا ہے اُسے دل یاد رکھتا ہے

کہیں تو نقش ہو جاتا ہے خمیازہ تلاطم کا
جو دریا بھول جاتا ہے وہ ساحل یاد رکھتا ہے

کہاں ہے ہمتِ مردانہ بڑھ کر کچھ سہارا دے
منور تو تجھی کو وقتِ مشکل یاد رکھتا ہے

○

تخیلات سلامت! بلند بام ہوں میں
زمیں سے کام مجھے کیا، فلک مقام ہوں میں

رہینِ خشکیٔ لب، تشنۂ دوام ہوں میں
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ شادکام ہوں میں

امینِ حرمتِ مے خانہ چاہیے مجھ کو
شراب جس میں چھلکتی نہیں، وہ جام ہوں میں

مری فنا کا نہایت بلند رتبہ ہے
چراغِ صبح نہیں، آفتابِ شام ہوں میں

دیارِ عشق میں اللہ رے کفر کا پایہ
وہ منزلت ہے کہ مجبورِ احترام ہوں میں

تم ہی نہ حرف و تصور کی قید میں آؤ
یہ کیا ضرور کہ پابندِ شکل و نام ہوں میں

مرے دہن پہ خموشی کی مُہر لگ جائے
کلام کچھ تو ہو ایسا کہ لا کلام ہوں میں

حدودِ حسن سے ٹکرا کے یہ پتہ پایا
طریقِ عشق کی منزل ہوں میں مقام ہوں میں

فنا، بقا، مری ہستی کے دو کرشمے ہیں
مجھے تمام نہ کہنا کہ نا تمام ہوں میں

طلسم کس نے کیا ہے یہ دانے دانے پر؟
کہ باغ باغ چمن میں بزیرِ دام ہوں میں
مجھے خود اپنی ہی جانب پلٹ کے آنا ہے
کیا ہے میں نے مقرر جو، وہ مقام ہوں میں
مرے لیے مری آسودگی ہے موت مری
جو تشنگی سے ہے زندہ وہ تشنہ کام ہوں میں
کبھی کبھی تو منوّر گماں یہ ہوتا ہے
کوئی ولی ہوں، پیمبر ہوں یا امام ہوں میں

○

کیا سحر ہے، اعجاز ہے، میں جھوم رہا ہوں
تو مست مئے ناز ہے، میں جھوم رہا ہوں
کیا زمزمۂ ساز ہے، میں جھوم رہا ہوں
کس مست کی آواز ہے، میں جھوم رہا ہوں
یہ کس کے ترنّم میں ہے، مستیٔ مئے ناب؟
دل! گوش بر آواز ہے، میں جھوم رہا ہوں
ہر ذرّہ مرے ساتھ ہے اس رقص میں شامل
دُنیا، نظرِ انداز ہے، میں جھوم رہا ہوں
میخانے کے اسرار چھپائے نہیں چھپتے
مستی، مری غمّاز ہے، میں جھوم رہا ہوں
دُشوار ہے خود میرے لیے نشّہ کی تشریح
اس میں بھی کوئی راز ہے، میں جھوم رہا ہوں
اندر مجھے جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے
مے خانے کا در باز ہے، میں جھوم رہا ہوں
کچھ بس نہیں ظالم کی ترنگوں سے منوّر
دل! شعبدہ پرواز ہے، میں جھوم رہا ہوں

رُباعیات

آرائشِ خد و خال ہوتی ہی رہی
تزئین رُخِ جمال، ہوتی ہی رہی
آئینہ نظر سے ہوگیا خود اوجھل
آئینے میں دیکھ بھال ہوتی ہی رہی

○

تزئین مآل سے سنورتے ہی نہیں
تہذیبِ شعار سے نکھرتے ہی نہیں
ہیں یہ جتنے بھی سانس لینے والے
معیارِ حیات پر اُترتے ہی نہیں

○

خود اپنی غرض سے رام ہوجاتا ہوں
اِک مرغِ اسیرِ دام ہوجاتا ہوں
پھر غیر کا پڑتا ہے گلے میں پھندا
پہلے، اپنا غلام ہوجاتا ہوں

○

خود اپنی نگاہوں سے اُتر جاتا ہے
انسان! محکوم ہو کے مرجاتا ہے
مربھی جائے تو، پھر غنیمت ہے کچھ
مرنے کی حدوں سے بھی گزر جاتا ہے

○

دیدار سے ارجمند کرلیں آنکھیں
اوپر دیکھا، بلند کرلیں آنکھیں

کچھ ایسے مناظر نظر آئے مجھ کو
دُنیا کی طرف سے بند کرلیں آنکھیں

○

جو کچھ ہے عزیز، ہے حوالے تیرے
عقل و تمیز، ہے حوالے تیرے
دل، چشم، دماغ، روح، عقبیٰ، دنیا
میری ہر چیز ہے حوالے تیرے

○

میں رفع ملال کے لیے آیا ہوں
تزئین مآل کے لیے آیا ہوں
پیدا مرے نفس میں نفاست ہو جائے
اصلاحِ خیال کے لیے آیا ہوں

□□

منور نعمانی

امروہہ میں متولد محمد منور خاں نے شعور سنبھال کر جب شاعری شروع کی تو منور امروہوی کے طور پر ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے اور دہلی کے شعری و ادبی حلقوں میں اسی نام سے پہچان پیدا کی لیکن گزشتہ چند سالوں سے منور امروہوی سے منور نعمانی امروہوی لکھنے لگے ہیں۔

منور ۱۶رجون ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ بی۔ ایس۔ سی اور ڈپلومہ ان کرافٹسمین شپ کرکے دہلی سرکار کے محکمۂ تعلیم سے وابستگی اختیار کرکے بطور مدرس ریٹائر ہوئے۔ شاعری میں اپنے ہم وطن جناب ڈاکٹر مرزا احمد حسین سیفی کے شاگرد ہیں۔ اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں لیکن رسائل و جرائد میں چھپنے چھپانے سے بے نیاز ہیں۔ مجموعۂ کلام کی اشاعت پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔

نمونۂ کلام:

غزل

قد گھٹ گئے وہ سب کے برابر نہیں رہے
جو لوگ بستی والوں سے مل کر نہیں رہے

لازم ہے احتیاط کہ فتنہ ہے شہر میں
حالاں کہ بستی والوں سے ہم ڈر نہیں رہے

پنگھٹ نہیں رہے نہ کھنک چوڑیوں کی ہے
جب سے ہمارے گاؤں میں چھپّر نہیں رہے

اک عمر اپنے قدموں سے لپٹا رہا سفر
ہم جس قدر سفر میں رہے گھر نہیں رہے

تب جا کے یوں رُکا تھا تشدد کا سلسلہ
ہاتھوں میں جب کسی کے بھی پتھر نہیں رہے

ہم بے قبا ہیں آج نہ چادر ہی سر پہ ہے
ایسے تو ہم کبھی بلا بستر نہیں رہے

یارو! سند ملے ہمیں جن کے کلام سے
اِس دور میں اب ایسے سخنور نہیں رہے

جس شہر کی فضاؤں میں نفرت کا زہر ہو
اُس شہرِ بے اماں میں منور نہیں رہے

○

ہر قدم احتیاط سے رکھنا
تم یونہی مجھ سے فاصلے رکھنا

تبصرہ مجھ پہ کرتے وقت کوئی
میرے حالات سامنے رکھنا

گھر سے نکلے تو ہو ہواؤں پر
اپنی نظروں میں راستے رکھنا
جانے کب وقت کس کو ٹھکرا دے
تم کتابوں میں حاشیے رکھنا
بے ثمر ہیں جو سایہ دار درخت
سائے ان کے سنبھال کے رکھنا
اپنی پہچان کھو چکے وہ بھی
جن کی فطرت تھی آئینے رکھنا
آج ہر شہر شہر فتنہ ہے
گھر کے دروازے مت کھلے رکھنا
یہ بزرگوں کی وضع داری تھی
گھر کی دہلیز پر دیے رکھنا
جب منوّر غزل سنوارو تم
لفظ چن چن کے کچھ نئے رکھنا

○

نئے سفینوں کو ساحل کی دوریاں دے دیں
ذہین بچوں کے ہاتھوں میں تتلیاں دے دیں
وہ اک چراغ نہ بجھ پایا تم جس کے لیے
تمام شہرِ چراغاں کو آندھیاں دے دیں
بہت عظیم سہی دولتِ انا لیکن
انا پسندی نے کتنوں کو سولیاں دے دیں
یہ حادثہ ہے کہ کچھ وقت کے خداؤں نے
مسافروں کو سرابوں کے کشتیاں دے دیں

رئیسِ شہر متحیّر ہے اس قدر اس نے
چراغ مانگنے والوں کو بجلیاں دے دیں
یقین کرتے ہیں کچھ لوگ یوں نجومی پر
خدا کے ہاتھ میں جیسے ہتھیلیاں دے دیں

○

تہذیب کے سوال پہ تکرار کیا کریں
کیسے بچائیں جبّہ و دستار کیا کریں
خوں رنگ سرخیوں کی شکایت فضول ہے
حالات ہی کچھ ایسے ہیں اخبار کیا کریں
کیا کیا یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا
اب زندگی کو اور بھی دشوار کیا کریں
جگنو ملے خلوص سے تو وہ بھی شمس ہے
بے نور ان چراغوں کے انبار کیا کریں
سوچو ذرا کہ کیسے ہو تعمیرِ زندگی
یہ زلزلوں کا شہر ہے معمار کیا کریں
الفاظ اب برتنے لگے ہیں غریب تر
کم مائیگی کا دور ہے فنکار کیا کریں

○

جب اذیت درو دیوار کی تنہائی دے
مجھ کو تسکین تری یاد کی پُروائی دے
ذہن بخشا ہے اگر تو نے مجھے شاعر کا
میرے اللہ مجھے قوتِ گویائی دے
شہر ایسا کہ جہاں سر بھی چھپانا مشکل
اپنے بچوں کو کہاں سے کوئی انگنائی دے

لفظ جو برتو سلیقے سے برتنا یارو!
یہ بھی ممکن ہے کہ اک لفظ ہی رسوائی دے
اپنے بچوں کو میں سونے کا نوالہ دے دوں
تھوڑی راحت جو مجھے وقت دے مہنگائی دے
خاک کو روح جو بخشی ہے تو اے میرے خدا
دل کشادہ دے مجھے ہمت و بینائی دے
جس کو سن سن کے منوّر نے گزارے برسوں
پھر سماعت کو وہ آواز کی شہنائی دے

○

دل اگر صاف نہیں ہے تو دعا کیسی ہے
مخلصو! یہ تو بتاؤ یہ وفا کیسی ہے
آج بھی آپ سے ہے ترکِ تعلق لیکن
میری سانسوں میں یہ خوشبوئے حنا کیسی ہے
بات کہنی ہے تو چھا جاؤ سبھی ذہنوں پر
یہ نہ دیکھو کہ زمانے کی ہوا کیسی ہے
زندہ رہنے کو تو پتھر کی طرح بھی جی لیں
دیکھنا یہ ہے کہ جینے کی ادا کیسی ہے
فاصلے آپ نے دانستہ بڑھائے ہیں تو پھر
سسکیوں کی مرے کانوں میں صدا کیسی ہے
جس کی سانسوں سے دلاسوں کی مہک آتی تھی
اس کے چہرے پہ شکایت کی گھٹا کیسی ہے
جن کے سینوں میں منوّر تھے اصولوں کے چراغ
ان کے جسموں پہ لہو رنگ قبا کیسی ہے

□□

منیر ہمدمؔ

خوش شکل، خوش لباس، خوش اطوار، کم گو، نرم گفتار، آنکھوں میں چمک، لبوں پر مسکراہٹ، گفتگو میں نیاز مندی، چہرے پر ایک عجیب سی قلندرانہ متانت، منہ میں ہمہ وقت پان، اپنے وجود میں سمٹے اور دھان پان سے منیرؔ ہمدم نے مٹیا محل کے سلیمان ٹی اسٹال کی رات دیر گئے تک محفلوں اور پرانی دلّی کی گلی کوچوں کی چھوٹی بڑی شعری و ادبی نشستوں سے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا اور اپنے تیکھے، نئے اور تازہ لب و لہجے سے سخن فہموں کو چونکا کر دیکھتے ہی دیکھتے شہرِ میرؔ و غالبؔ کی نئی شعری نسل کا ایک معتبر نام بن گیا۔

منیر ہمدمؔ ۷ رجنوری ۱۹۶۱ء کو دلّی میں نور احمد صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے۔ نور احمد صاحب علاقہ ترکمان گیٹ کے رہنے والے نماز روزے کے پابند سیدھے سادے مسلمان اور ایک کاروباری انسان تھے۔ پرانی دلّی کے کرخندار اور کاروباری لوگ عام طور پر تعلیم اور شعر و شاعری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور اپنے خول میں زندگی گزارتے ہیں، جہاں خوش ذائقہ، لذیذ اور چٹ پٹے کھانے ہی ان کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز ہوتے ہیں، لیکن نور احمد صاحب ایک کامیاب کاروباری انسان ہونے کے باوجود شعر فہم اور ادب نواز تھے۔ ان کی ادب نوازی اور شعر فہمی نے منیر ہمدمؔ کی تخلیقی صلاحیتوں کو بڑی خاموشی سے تحریک دی اور گھر میں ادبی رسائل اور شعراء کے دواوین کے مطالعہ نے فکر کو جلا بخشی جس

نے اس کو خوبصورت اور تیکھے لب و لہجہ والا شاعر بنا دیا۔

منیر ہمدم نے اوائلِ عمر میں ہی شعر کہنا شروع کیا لیکن دنیائے شاعری کی دیرینہ اور عام روایت کے برعکس کسی استاد کی انگلی پکڑ کر شاعری کے کوچے میں قدم نہیں رکھا بلکہ اپنے مطالعے، مشاہدے اور وجدان ہی کو اپنا رہبر بنایا۔ منیر ہمدم کے اسی مطالعے، مشاہدے اور وجدان نے دنیائے ادب کو ''ایک پل'' اور ''غزل چہرے'' جیسے دو خوبصورت مجموعے عطا کیے جن کو پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ منیر ہمدم کے اندر مستقبل کا ایک بڑا شاعر چھپا ہوا بیٹھا ہے جو دھیرے دھیرے باہر آ رہا ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

زندگی اُس نے سنواری ہے سزا سے پہلے
نام لکھتا تھا خدا کا جو خدا سے پہلے

کوئی انجان سی خوشبو ہے میرے ہاتھوں میں
اک عجب نور چمکتا ہے دُعا سے پہلے

تم چراغوں کو سجانے کے لیے نکلے ہو
تم نے پوچھا بھی کبھی دوست ہوا سے پہلے

اُجلی راتوں کا یہ سناٹا عجب ہے لیکن
کوئی شے ٹوٹنے لگتی ہے صدا سے پہلے

پھر کہیں جا کے برستا ہے یہ پیاسا ساون
نور کی بوند چمکتی ہے گھٹا سے پہلے

○

ہر نئے زخم کو لفظوں سے نکھارا جائے
آؤ خوابوں کے جزیروں کو سنوارا جائے

دوستو! آج کے اندازے غلط ہوتے ہیں
کشتی مل جائے تو ہاتھوں سے کنارا جائے
زندگی خوابِ مسلسل کی طرح ہے یارو!
آنکھ کھل جائے تو صدیوں کا نظارا جائے
ہم سے بچھڑیں گے یہ سائے تو کہاں جائیں گے
کیا انھیں نیم کے سائے سے گزارا جائے
کوئی احساس تو جاگے کوئی دیپک تو جلے
آسمانوں کو زمینوں میں اُتارا جائے

○

کتنے پیکر خلا میں ڈھالے ہیں
اپنے الفاظ پھر بھی کالے ہیں
ایک سورج نے یہ کہا مجھ سے
تیری آنکھوں میں کیسے چھالے ہیں
میرے ماتھے پہ تیری قسمت ہے
تیرے سجدے مرے اُجالے ہیں
میں سمندر کی آنکھ ہوں یارو
تم نے دریا بہت کھنگالے ہیں
اپنی غزلوں میں کچھ نہیں ہمدم
سب تری ذات کے حوالے ہیں

○

بھیگی پلکوں میں ہیں استعارے بہت
اُس نے دیکھے ہیں دن میں ستارے بہت

کوئی چہرہ مکمل بنا ہی نہیں
نقش پانی سے اُس نے ابھارے بہت
گھر سے نکلیں چلو پھر سمندر چلیں
اچھے ساتھی ہیں اپنے کنارے بہت
جانے کیا کھوجتی ہیں نگاہیں مری
یوں تو بکھرے پڑے ہیں نظارے بہت
روشنی کی دُعا آج پوری ہوئی
آسمانوں سے برسے شرارے بہت

○

کوئی رشتہ کہیں ٹوٹا تو ہوگا
سمندر سے کوئی الجھا تو ہوگا
تمھارے ہاتھ بھی بھیگے ہوئے ہیں
ہتھیلی پر کوئی چہرہ تو ہوگا
ستاروں سے ہمارا نام لکھ کر
کتابوں کو کبھی چوما تو ہوگا
کوئی آنسو وفا کا پھول بن کر
زمینوں سے کبھی اُبھرا تو ہوگا
اُتر جائے گا وہ سب کی نظر سے
وہ شیشہ ہے تو پھر ایسا تو ہوگا

○

ہر ایک لفظ مکمل کتاب کر دیتا
جسے وہ چھو کے گزرتا گلاب کر دیتا

میں بھیگی آنکھ سے پڑھتا اُسی کی تحریریں
خدا کے نام اگر انتساب کر دیتا
سنہرے خواب دکھا کر وہ بوڑھا جادوگر
مجھے بھی چاند کھلاتا خراب کر دیتا
کسی کی یادیں کناروں پہ چھوڑ آئے ہیں
وگرنہ جینا سمندر عذاب کر دیتا
بس ایک پل کے لیے مجھ کو روشنی ملتی
وہ ایک پل تو مرا کامیاب کر دیتا

□□

موج رامپوری

موج رامپوری اردو شاعری کے منظرنامے پر اُن چند شاعروں میں سے ہیں جن کا شاعرانہ ترنم کانوں میں رس گھولتا ہے، اشعار خوشگوار تمازت کا احساس دلاتے ہیں اور رنگ برنگی خوبصورت تتلیاں اردگرد منڈلاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

موج جن کا خاندانی نام سید محمد علی میاں ہے ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ اسی شہرِ علم و تصوف میں تعلیم و تربیت پائی۔ دہلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا اور اپنے مولد میں آل انڈیا ریڈیو کے اناؤنسر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ یو پی ایس سی کے مقابلہ جاتی امتحانات پاس کر کے ریڈیو کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچے اور آج کل اسٹیشن ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔

شاعری میں جناب خیال رامپوری کے شاگرد ہیں۔ موج نے اردو شعر و ادب میں اپنے عہدوں کے وسیلے سے شہرت نہیں پائی بلکہ لہجے کی سادگی، پُرکاری اور خوبصورت شاعرانہ ترنم نے ان کو ایک مقبول شاعر بنایا ہے، ایک ایسا شاعر جس کے اشعار نطق کی منزل سے براہِ راست سننے اور پڑھنے والے پر اپنا سحر انگیز تصور قائم کرتے ہیں اور ہر شعر پر دادو تحسین کے ڈونگرے برسنے لگتے ہیں۔

موج رامپوری کی خوبصورت شاعری کے اب تک دو مجموعے ''سرخ رو'' اور ''شہرِ

وصال'' ۲۰۰۰ء منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ تیسرا مختصر مجموعہ '' مثنوی مناقبِ خواجہ'' ۱۹۹۹ء ہے جس میں موجؔ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حیاتِ مبارکہ کو اس طرح شعری پیکر میں ڈھالا ہے کہ یہ مثنوی ادبی اعتبار ہی سے نہیں خواجہ کے عاشقوں کے لیے بھی خاصے کی چیز ہوگئی ہے۔

موج رامپوری کا انتقال ۳۰ر اکتوبر ۲۰۰۴ء کو ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

سبھی تارے، سبھی جگنو میرے
اب وہ آنچل ہے اور آنسو میرے

قید کر لے کوئی آئینوں میں
عکس بکھرے ہوئے ہر سو میرے

کاش! ایسا ہو کہ تتلی بن کر
ہاتھ آجائے وہ خوشبو میرے

سب کی آنکھوں میں اُڑانیں ہیں مری
کس نے دیکھے پر و بازو میرے

ایک معصوم سا چہرہ ، اے موجؔ
کر گیا ذہن پہ جادو میرے

○

سیاہ شب کا مقدر سنورنے والا ہے
کسی دریچے میں اک چاند اُترنے والا ہے

اندھیرے جس کی لکیریں مٹائے دیتے ہیں
اُسی ہتھیلی پہ سورج اُبھرنے والا ہے

وہاں سے ہم نے مسافت کی ابتدا کی تھی
جہاں سے آج زمانہ گزرنے والا ہے
ابھی نگاہ کا تیشہ ، نگاہ میں رکھنا !
پہاڑ ٹوٹ چکا ہے ، بکھرنے والا ہے
وہ موجؔ اشکوں کی جھیلیں ، یہ درد کے دریا
چھلک نہ جائے وہ ساغر جو بھرنے والا ہے

○

رشتوں کے جنگل میں پوچھے کون کسی کا درد
سب کے اپنے اپنے غم ہیں، اپنا اپنا درد
دنیا کی ہر آسائش تھی، اور اکیلا درد
لوگوں نے کیا کچھ نہیں مانگا، ہم نے مانگا درد
جانے اُس کے لہجے میں تھی کیا البیلی بات
سنتے سنتے دل میں جاگا میٹھا میٹھا درد
جذبے کی سچائی کب ہے اہلِ دانش میں
دل والے ہی سمجھیں گے کچھ دل والوں کا درد
جاناں! باقی سارے رشتے بے مطلب سے ہیں
اک تُو ہوتا، اک میں ہوتا اور اک ہوتا درد
ہم جس بستی کے باسی ہیں موجؔ اُس بستی میں
باتوں باتوں غم بکھرا ہے ، لہجہ لہجہ درد

○

نجم بہت ، مہتاب بہت
آنکھیں ہوں تو خواب بہت
کوئی آنے والا ہے
موسم ہے شاداب بہت

پیار ملا جب غیروں سے
یاد آئے احباب بہت
میرے عہد کی آنکھوں میں
نیندیں کم ہیں ، خواب بہت
مصرف ہو تو ، ہر لحہ !
زیست کا ہے نایاب بہت

○

کھلی فضا میں زندہ میں
ایک آزاد پرندہ میں
اپنوں کی نادانی پر
غیروں سے شرمندہ میں
ظاہر اک انساں کا روپ
باطن ایک درندہ میں
وہ آکاش پہ رہتا ہے
دھرتی کا باشندہ میں
رادھا تُو ہے، میرا تُو
گوپالا ، گووندہ میں
تحریروں میں روشن تُو
کاغذ پر تابندہ میں
ظالم ! چھوڑ کے مت جانا !
مرجاؤں گا زندہ میں
دل کا حال سناؤں گا
باقی ، موجِ آئندہ میں

○

جو وقت مخالف تھا، موافق نکلا
اللہ کا فرمان ہی صادق نکلا
وہ گھر کے دریچے میں کھڑا تھا سرِ صبح
میں سمجھا فلک پر کوئی طارق نکلا
ایقانِ محبت کا کرشمہ دیکھو !
میری طرح وہ بھی مرا عاشق نکلا
میں نے جو تصوّر میں سجا رکھے تھے
چہرہ انھیں رنگوں کے مطابق نکلا
اس قریۂ ہجرت میں رفیق و انصار
ایک شخص تھا، سو وہ بھی منافق نکلا
کوئی ایسے مانے کہ نہ مانے، لیکن
سورج تو ہمیشہ سرِ مشرق نکلا
ہم جس کو سمجھ بیٹھے تھے، پاگل، مجذوب
وہ شخص تو اس عہد کا حاذِق نکلا
ہے اس کو فقط، اپنی ہی عذرا کا جنوں
یہ موجؔ بھی، اے دوستو! وامق نکلا

□□

مہیش چندر نقش

مہیش چندر نقش میرٹھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ میرٹھ میں پلے بڑھے اور وہیں تعلیم پائی، لیکن ان کی شاعری نے دہلی کی شعری و ادبی فضاؤں میں آنکھ کھولی اور آل انڈیا ریڈیو کے بہت سے ممتاز اور مشہور گلوکاروں نے ان کی غزلیں گا کر شہرت بخشی۔

شاعری میں باقاعدہ جناب رام کرشن مضطر کے شاگرد تھے لیکن حضرتِ بسمل سعیدی سے بھی وقتاً فوقتاً مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ نقش کی ذہنی تربیت گرچہ حضرتِ مضطر نے کی تھی لیکن وہ اپنے مزاج کی خامشی اور الگ تھلگ رہنے کی عادت کی وجہ سے جنابِ بسمل سعیدی کے زیادہ قریب تھے۔

''خرام''، ''انداز'' اور ''درپن'' ان کے شعری مجموعے ہیں جو مختلف اوقات میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر مقبولِ خاص و عام ہوئے۔

نقش دہلی ٹرانسپورٹ کارپوریشن میں ٹریفک انسپکٹر تھے۔ ۱۹۸۰ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام:

قطعات

مجھے تو آہ اتنی بھی نہ دی فرصت زمانے نے
کہ دو آنسو بہا کر اپنے دل کے داغ دھو لیتا
یہی شکوہ رہا اے نقش مجھ کو زندگانی سے
کبھی اس بے وفا کی گود میں سر رکھ کے رو لیتا

○

محبت کی حقیقت کُھل رہی ہے
نگاہِ ناز پھر دل کے قریں ہے
کسی کی کاکلیں سُلجھا رہا ہوں
غمِ دوراں مجھے فرصت نہیں ہے

○

نامرادی کے تُند طوفاں میں
مل گئے آج کچھ سہارے سے
اُن کے جلوؤں میں کھو گئیں نظریں
کشتیاں جا لگیں کنارے سے

○

ہزار آرزوئیں گھُٹ کے مر گئیں دل میں
ملا نہ کشمکشِ غم سے زندگی کو فراغ
ہجومِ یاس میں یوں کانپتی ہے اِک اُمید
کہ جیسے دور اندھیرے میں ٹمٹمائے چراغ

○

پُرفشاں ہے تھکا تھکا سا خیال
بے کراں وسعتوں کے گھیرے میں
جیسے اِک فاختہ ہو گرمِ سفر
شام کے ملگجے اندھیرے میں

○

اس طرح چمکی ہے سوزِ عشق سے
پُرسکوں الفاظ کی دھندلی لکیر
جیسے ایماں کے مقدس نور سے
جگمگا اُٹھے مجاہد کا ضمیر

○

نرم و نازک گلوں کے چہروں پر
اک نیا رنگ سا جھلکتا ہے
صحنِ گلشن میں پرتوِ خور سے
جب بھی شبنم کا دل دھڑکتا ہے

○

دورِ حاضر کے غم و آلام میں
ایک لو سی دے رہا ہے یوں دماغ
سردیوں کی دُھند میں پچھلے پہر
جل رہا ہو جس طرح کوئی چراغ

○

یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے
روز پیتا ہوں غم کی صہبا کو
جس تبسم میں غم نہیں پایا
میں نے لوٹا دیا ہے دنیا کو

○

تیری محبت میں اے دوست
بیت گئے کیا کیا لمحات
آخر آکر راز کھلا
ہنسنا رونا ایک تھی بات

○

تیرے سامنے آنکھ سے آنسو
تھم جو گئے ہیں بہتے بہتے
سوچ رہا ہوں کیا کہنا تھا
بھول گیا کچھ کہتے کہتے

○

غم کے ماروں کی اشک ریزی پر
جانے کیا کیا کہا ہے دنیا نے
ایک موہوم سی حقیقت کے
بن گئے ہیں ہزار افسانے

□□

ناشر کاظمی

صغیر احمد المتخلص بہ ناشر کاظمی ۱۳؍اپریل ۱۹۳۹ء کو امروہے میں پیدا ہوئے۔ شاعر ابنِ شاعر ہیں۔ ان کے والد ماجد محمد خلیل کاظمی بھی شاعر تھے اور خاکی تخلص کرتے تھے۔ ناشر کاظمی شاعری میں اپنے والد ہی کے شاگرد ہیں۔

دہلی میونسپل کارپوریشن میں ملازم تھے۔ اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ کم گو، خاموش طبع اور ایک حد تک گوشہ نشین شاعر ہیں اس لیے کہیں آتے جاتے نہیں۔ ''تلخابۂ حیات'' شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۸۵ء میں دہلی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

ہر شے میں حق ہے جلوہ نما کچھ نہیں ہوں میں
اس عکسِ عارضی پہ نہ جا کچھ نہیں ہوں میں
میں آب و باد و خاک بھی میں نور و نار بھی
لیکن بجا یہ ہے بخدا کچھ نہیں ہوں میں

تخلیقِ کائنات کا منشاء تو تھا وجود
جب تک رہا وجود رہا کچھ نہیں ہوں میں
ہستی میں عبرتوں کا تماشا بنا رہا
بعد از فنا مثالِ فضا کچھ نہیں ہوں میں
مثلِ سراب میری حقیقت بھی کچھ نہیں
نقشِ برآب ہوں بھی تو کیا کچھ نہیں ہوں میں
سانسوں کے آشیانہ میں شاخِ حیات پر
رہتا ہوں لے اڑے گی قضا کچھ نہیں ہوں میں
یہ جسم و جان و عمر تو ہیں رب کی ملکیت
اعمالِ نیک و بد کے سوا کچھ نہیں ہوں میں
ناشرؔ ستونِ دار سے آتی ہے یہ صدا
اے رہروانِ راہِ رضا کچھ نہیں ہوں میں

○

ایوانِ غزل ہو تہ و بالا نہیں ممکن
اردو کو ملے دیش نکالا نہیں ممکن
ہر حکم پہ بندہ سرِ تسلیم کرکے خم
احکامِ الٰہی میں مگر لا نہیں ممکن
حیران ہوں میں اہلِ بصیرت کو ہوا کیا
"اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن"
دریائے محبت کی ہر اک موج ہے پُر پیچ
ابھرے گا بھلا ڈوبنے والا نہیں ممکن
خوں ریز ہے صحرائے تمنا کا ہر اک خار
رہ جائے سلامت کوئی چھالا نہیں ممکن

آنکھوں کے دیے بجھ گئے اب ساز نہ آواز
کیا لے گا یہ بیمار سنبھالا نہیں ممکن
دنیا کی ہوس چھوڑ دے بیکار ہے ناشؔر
بھر جائے بھلا حرص کا پیالا نہیں ممکن

○

یا تو جلوہ نہ دکھاتا تو یہ بہتر ہوتا
یا مجھے مست بناتا تو یہ بہتر ہوتا
آج کی رات بھی کٹ جائے گی جیسے تیسے
دردِ فرقت نہ ستاتا تو یہ بہتر ہوتا
غیر تو غیر ہیں غیروں کی شکایت کیسی
زخم اپنوں سے نہ پاتا تو یہ بہتر ہوتا
یوں تو کہنے کے لیے ہیں بہت اپنے لیکن
کوئی اپنا نظر آتا تو یہ بہتر ہوتا
آگ اوروں کی بجھانے تو چلا تھا ناشؔر
اپنا دامن بھی بچاتا تو یہ بہتر ہوتا

○

نفرتوں کے داغ اپنے خون سے دھو جاؤں گا
خود خلا کی وسعتوں میں ایک دن کھو جاؤں گا
مجھ کو سولی پر چڑھایا جائے اس کا غم نہیں
حریت کے نخل تو ہر قلب میں بو جاؤں گا
میں تو برگِ خشک ہوں کل شاخ سے گرنے کے بعد
خاک میں مل جاؤں گا وجہ نمو ہو جاؤں گا
پا گیا ہوں وسعتِ کونین اپنی ذات میں
اب حدودِ ذات سے نکلوں گا تو کھو جاؤں گا

ایک جلوہ اک تبسم ایک چشمِ التفات
تیرے در سے مدعا یہ پاؤں گا تو جاؤں گا
اتنی مہلت ہی ملی تھی سیر دنیا کے لیے
شام ہونے آ رہی ہے اپنے گھر کو جاؤں گا
مضطرب تب تک ہوں ناشرؔ زندگی جب تک ہے پھر
پیر پھیلا کر بڑے آرام سے سو جاؤں گا

○

دونوں جانب سے تو کا رشتہ ہے
یعنی اب دو بدو کا رشتہ ہے
معتبر ہے یہ خنجر قاتل
اس سے قلب و گلو کا رشتہ ہے
کچھ بتائیں تو حضرتِ ناصح
آپ سے کیا عدو کا رشتہ ہے
تیرے منہ کیا لگے گی مے واعظ
ہم سے جام و سبو کا رشتہ ہے
پہلے تھے ایک جان دو قالب
''اب فقط گفتگو کا رشتہ ہے''
زیست پیوند ہر نفس ٹھہری
پیرہن سے رفو کا رشتہ ہے
اپنے اسلاف ہیں یہاں مدفون
اس زمیں سے لہو کا رشتہ ہے
قطرۂ آب جوئے عرفاں ہوں
بحر سے آب جو کا رشتہ ہے
اس کو دیکھا نہیں مگر ناشرؔ
پھر بھی اک جستجو کا رشتہ ہے

○

کیا کوئی اندیشۂ دل گیر لے کر آئی ہے

وہ نظر کیوں جذبۂ تحقیر لے کر آئی ہے

ہوگیا نذرِ تعصب جب مکانِ آشتی

تب حمیت جذبۂ تعمیر لے کر آئی ہے

دار پر اس سرفروشِ حق کا کہنا آ اجل

خوابِ ہستی کی حسیں تعبیر لے کر آئی ہے

ہم نے آزادی کو پایا کتنی قربانی کے بعد

اب سیاست پھر نئی زنجیر لے کر آئی ہے

آج دنیا کو ضرورت ہے سکون وچین کی

فکرِ نو ایسی کوئی تدبیر لے کر آئی ہے

بس وہی انسان کامل ہے جو قائم رکھ سکے

روح اپنے ساتھ جو تنویر لے کر آئی ہے

دستِ تدبیر و عمل شل ہوگئے اترا نہیں

زیست جو پیراہنِ تقدیر لے کر آئی ہے

صرف دھوکہ ہے مسرت چشمِ بینا کے لیے

ہر خوشی اک عارضی تاثیر لے کر آئی ہے

اُس نگاہِ عیب جو سے پوچھتے رہتے ہیں لوگ

آج کس کی آنکھ کا شہتیر لے کر آئی ہے

یہ مناسب ہے کہ آ کر دیکھ جا حالت مری

دفترِ پرسش تری تحریر لے کر آئی ہے

خود شناسی کے لیے ناشر مری وارفتگی

"میرے ماضی سے مری تصور لے کر آئی ہے"

□□

نرمل رائے پوری

نرمل سنگھ ان شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے عام شاعرانہ روایت کے مطابق اپنی شاعرانہ پہچان اور تخلص کے لیے کسی منفرد نام کا سہارا نہیں لیا بلکہ گھریلو نام ہی کو اپنا تخلص ٹھہرایا اور نرمل رائے پوری کے نام سے شعری منظرنامے پر ابھرے۔

نرمل رائے پوری ۴ر جولائی ۱۹۳۸ء کو ہوشیار پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں رائے پور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۰ء سے دہلی میں مقیم ہیں۔ نجاری کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ اردو اخبارات و رسائل کے مسلسل مطالعہ نے مہمیز دی اور لکڑی پر خوبصورت نقش و نگار ثبت کرنے والے تخلیقی ذہن نے شعر کو بھی اظہار کا وسیلہ بنالیا۔ ۱۹۶۱ء کے آس پاس شاعری شروع کی۔ اپنے وِجدان کی راہنمائی میں شاعری کرتے ہیں۔ ''بے برگ شاخ'' کے عنوان سے شعری مجموعہ شائع کر چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

مسرتوں سے سنور سج کے روبرو نہ ہوئی
یوں زندگی سے کبھی اپنی گفتگو نہ ہوئی
تلاش کرتے کہاں پہ سکون گم کردہ
کہ ہم سے اپنے دروں کی ہی جستجو نہ ہوئی
نہ کوئی دار، نہ زنداں، نہ قتل گہ، نہ صلیب
ہماری زندگی اب کے بھی سرخرو نہ ہوئی
سیئیں ادھر سے تو ادھر سے دریدہ ملے
یہ زندگی کی قبا عمر بھر رفو نہ ہوئی
تجھے منانے میں مصروف سب ہیں عمروں سے
مگر اے زندگی اب تک کسی کی تو نہ ہوئی
مئے ایثار میں لذت ملی جنھیں نزتل
پھر ان پہ حاوی کبھی کوئی آرزو نہ ہوئی

○

سرکشی کا بھیس بھرنے والی ہے
التجا تیور بدلنے والی ہے
گونج اس کی آسماں تک جائے گی
بے زبانی چیخ بننے والی ہے
رہ گئی پیچھے بہت ہم سے امید
بے دِلی حد سے گزرنے والی ہے
اب بکھرنے کو ہے کہرے کا نظام
یہ گھٹن طوفان بننے والی ہے

زندگی نکلے گی ہوکر سرخ رو
آگ دوزخ کی بھڑکنے والی ہے
اس کا پس منظر ہیں یہ تاریکیاں
اب زمیں کروٹ بدلنے والی ہے
ایک یہ منظر بھی ہوگا دیدنی
ناؤ اب پاپوں سے بھرنے والی ہے
ختم ہے اب تو نوشتہ کی میعاد
زندگی اس گھر کو تجنے والی ہے

○

یہ میرے دل کا گھروندا ہے ٹوٹ جانے کو
نہ آئے کوئی یہاں اب دیا جلانے کو
بس ایک تیرے تغافل کا کیا گلہ کرتا
بہت تھے اور بھی میرے مجھے ستانے کو
یہ ٹوٹ جاتے سبھی قفل خود بخود دل کے
تو لوٹنے کو نکلتا تو اس خزانے کو
تمام عمر جلا ہوں اسی کی لپٹوں میں
کبھی تو آیا تھا جس آگ کے بجھانے کو
خدا نے لوچ ہی دیا کہاں اسے اتنا
ہمیں ہی جانا پڑے گا اسے منانے کو
مزاج تیرا ہی دشمن ہے عکس تیرے کا
قصور وار لکھے تو مگر زمانے کو
ترا تو روٹھنا بھی رائیگاں گیا نرمل
نہ آیا کوئی تجھے آج تک منانے کو

○

نت نئے رنج، نئے غم سے ملاتا ہے مجھے
جب بھی خورشید نکلتا ہے جلاتا ہے مجھے
یاد کرتا ہے کبھی اب نہ بلاتا ہے مجھے
جانے کس جرم کا احساس دلاتا ہے مجھے
بے گناہی مری اتہاس لکھے پھر شاید
دیکھیے اب کے سزا کیا وہ سناتا ہے مجھے
الغرض لطف کوئی مجھ کو میسر ہی نہیں
نہ ہنساتا ہے نہ جی بھر کے رُلاتا ہے مجھے
میری تنہائی کرے پہروں خوشامد اس کی
تو کوئی گیت خلاؤں سے سناتا ہے مجھے
میری اک شب میں جو پل بھر کے لیے چمکا تھا
وہ شرر سا تھا کوئی یاد تو آتا ہے مجھے
ایک ہی بار سبھی میری سزائیں لکھ دے
بے سبب کیوں یہ تو قسطوں میں ستاتا ہے مجھے

□□

نریش کمار شاؔد

گزشتہ صدی کے پانچویں اور چھٹے دہے میں اسرارالحق مجاؔز لکھنوی اور نریش کمار شاؔد اردو کے مشہور و مقبول شاعر تھے اور مشاعروں کی کامیابی کے ضامن سمجھے جاتے تھے۔ مجاؔز شاعرانہ ترنم اور نرم و گداز غزلوں سے مشاعرے لوٹ لیا کرتے تھے اور نریش کمار شاؔد تحت اللفظ میں خوبصورت قطعات سے مشاعروں کو گرما دیا کرتے تھے۔ مجاؔز اور شاؔد میں کئی چیزیں مشترک تھیں۔ دونوں لا اُبالی، بے فکرے، جنوں کی حد تک مے نوش اور شراب کے دھنی۔ کثرتِ مے نوشی نے دونوں کو کسی گھر کا نہیں چھوڑا تھا۔ دونوں اکتالیس بیالیس سال کی عمر میں دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ مجاؔز لکھنؤ میں رات بھر دوستوں کی محفل میں بادہ نوشی کرتے رہے اور اگلی صبح ہوٹل کی چھت پر مردہ پائے گئے۔ اور شاؔد بھی ایک ایسی ہی محفلِ ناؤ نوش کے بعد اگلی صبح دہلی میں جمنا کے کنارے مردہ پائے گئے۔

نریش کمار شاؔد ۱۱ ردسمبر ۱۹۲۷ء کو یکیٰ پور ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ ان کو شاعری اور شراب نوشی ورثے میں ملی۔ ان کے والد ہر یارام دردؔ نکودری غزل کے اچھے شاعر تھے اور پنجاب کے ادبی حلقوں میں خاصے معروف تھے، لیکن شراب کے دھنی اور رِند بلانوش تھے۔ گرچہ صحافت کے پیشے سے تعلق تھا اور جالندھر کے ایک اہم اخبار میں کام کرتے تھے لیکن ہمہ وقت اور ہر قسم کی شراب نے انھیں کسی گھر کا نہیں چھوڑا تھا۔ اٹھتے

بیٹھتے شراب نوشی کے چکر میں ایسے لا پتہ ہوئے کہ عزیز واقارب صبر کرکے بیٹھ گئے۔

نریش کمار شاؔد دہلی میں معمولی سرکاری نوکر تھے۔ تنخواہ قلیل تھی، شراب اور گھر کے اخراجات زیادہ تھے۔ ان خرچوں کو پورا کرنے کے لیے سعادت حسن منٹو کی طرح اپنی تخلیقی کاوشیں بیچنے کے لیے ایڈیٹروں اور پبلشروں کے دفتروں کے چکر کاٹا کرتے تھے۔ نریش کمار شاؔد پبلشروں کی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے نثر بھی لکھا کرتے تھے۔ ''سرخ حاشیے'' ان کی ایک ایسی ہی نثری تصنیف ہے جو شراب کے پیسوں کے لیے وقتاً فوقتاً قلم برداشتہ لکھ گئی۔ ''قاشیں'' اور ''وجدان'' ان کے دوسرے شعری مجموعے ہیں جو ان کی دوسری متعدد کتابوں کی طرح اب نایاب ہیں۔

شاؔد نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ابتداء میں اپنے والد جناب درد نکودری سے اصلاح لی، لیکن بعد میں منشی تلوک چند محروم اور پنڈت لبھو رام جوؔش ملسیانی سے باقاعدہ اصلاح لی۔

نریش کمار شاؔد ایک ذہین اور باصلاحیت شاعر تھے لیکن افسوس ان کی ذہانت اور جملہ شاعرانہ صلاحیتیں شراب نوشی کی نذر ہو گئیں۔

شاؔد ۲۱ رمئی ۱۹۶۹ء کی صبح کو جمنا کے کنارے مردہ پائے گئے۔

نمونۂ کلام:

قطعات

کیف پر بھی ہے کیف کا عالم
آج مستی بھی محوِ مستی ہے
بات کرتے ہیں پھول جھڑتے ہیں
آنکھ اٹھاتے ہیں مے برستی ہے

○

مرمریں جسم گیسوؤں کے سحاب
کروٹیں لے رہی ہے روحِ شباب

ایسا محسوس ہورہا ہے مجھے
چاندنی رات پی رہی ہے شراب

○

عنبریں گیسوؤں کو لہرا کر
رنگ احساس کا سنہرا کر
یہ اندھیرا بہت مقدس ہے
اس اندھیرے کو اور گہرا کر

○

پتی پتی گلاب ہوجاتی
ہر کلی مست خواب ہوجاتی
تو نے ڈالیں نہ مے فشاں نظریں
ورنہ شبنم شراب ہوجاتی

○

داورِ حشر دیکھتا کیا ہے
میں وہی رند لا اُبالی ہوں
اس سے پہلے کہ تو سوال کرے
میں خود اک جام کا سوالی ہوں

○

کہہ رہی ہے یہ میکدہ کی فضا
ہر پیالے کے منہ کو چوم کے پی
اور غمِ دل یہ طنز کرتا ہے
تیرا اپنا لہو ہے جھوم کے پی

○

اس طرح بے تکلفی سے ہمیں
حادثات مہیب ملتے ہیں
چلتے چلتے کسی دوراہے پر
جیسے بچھڑے حبیب ملتے ہیں

○

شیخ صاحب مقابلہ کیا ہے
آپ کا ہم شراب نوشوں سے
ایک عصمت فروش بہتر ہے
آپ جیسے خدا فروشوں سے

○

زہرِ آلام کی ضرورت کیا
سرخوشی کا لباس کافی ہے
ایک شاعر کی جان لینے کو
ایک عورت کی ذات کافی ہے

○

داستانِ مآلِ گل کہہ کر
مصلحت کیا اسے ڈرائے گی
مسکرانا کلی کی فطرت ہے
خون ہوکر بھی مسکرائے گی

○

تو مری زندگی کا پرتو ہے
میں تری آرزو کا سایا ہوں
پھر بھی تجھ کو میں حدِ منزل تک
احتیاطاً پکار آیا ہوں

○

داغ ہے، نورِ ماہتاب نہیں
درد ہے نغمۂ شباب نہیں
اے غمِ زیست میرے ساغر میں
خونِ احساس ہے شراب نہیں

○

حسنِ احساس کی ضرورت ہے
ذرّہ ذرّہ حسین مورت ہے
تیری نظریں ہیں بے بصر ورنہ
زندگی اب بھی خوبصورت ہے

○

روح احساس میں رچائے ہیں
آرزو کا لہو پلائے ہیں
اے غمِ زندگی اُداس نہ ہو
آ تجھے ہم گلے لگائے ہیں

○

کچھ مرقع ہیں زندگانی کے
چند عنواں ہیں اک کہانی کے
چاندنی رات، رقص، شعر، شراب
مختلف نام ہیں جوانی کے

○

ترے اطوار کی طرح زاہد
کیا بھروسہ تری بہشتوں کا
مجھ کو انسان سے محبت ہے
میں نہیں معتقد فرشتوں کا

○

ساز کے دل میں سوز پلتا ہے
مسکراہٹ میں درد ڈھلتا ہے
حسن ایسے چراغ کی لو ہے
عشق کا خون جس میں جلتا ہے

○

اسیر طائر ہیں سخت بزدل
فضول بھرتے ہیں سخت آہیں
قفس کو بھی ساتھ لے اُڑیں یہ
اگر قفس سے نکلنا چاہیں

○

زندگی کے حسیں گلستاں میں
ہر تبسم ہے داغدارِ الم
جب نچوڑا ہے خندۂ گل کو
اس سے ٹپکا ہے گریۂ شبنم

○

خلوص مہر و محبت کی جلوہ گاہ تو ہیں
نہیں ہیں منزلِ مقصود سنگِ راہ تو ہیں
اگر ثواب کے قابل نہیں ہیں ہم نہ سہی
خدا کے فضل سے شائستۂ گناہ تو ہیں

غزل

کسی کے جور وستم کا تو اک بہانہ تھا
ہمارے دل کو بہر حال ٹوٹ جانا تھا
تری نظر نے نئی روح پھونک دی ورنہ
ہمارے درد کا قصہ بہت پرانا تھا
ہمیں کو بارِ طرب ناگوار تھا لیکن
ہمیں کو شدتِ غم میں بھی مسکرانا تھا
یہ کم شناس تلاطم کسے ڈراتا ہے
وہ لوگ ڈوب گئے جن کو ڈوب جانا تھا
بجا کہ دیر و حرم بھی قریب تھے لیکن
ہماری راہ میں حائل شراب خانہ تھا
گناہ سے ہمیں رغبت نہ تھی مگر یارب
تری نگاہِ کرم کو تو منہ دکھانا تھا

○

ایک دھوکا ہے یہ شب رنگ سویرا کیا ہے
یہ اُجالا ہے اُجالا تو اندھیرا کیا ہے
تو مرے غم میں نہ ہنستی ہوئی آنکھوں کو رُلا
میں تو مر مر کے بھی جی سکتا ہوں میرا کیا ہے
ذرّے ذرّے میں دھڑکتی ہے کوئی شے جیسے
تری نظروں نے فضاؤں میں بکھیرا کیا ہے
دردِ دنیا کی تڑپ دل میں مرے رہنے دے
تُو تو آنکھوں میں بھی رہ سکتی ہے تیرا کیا ہے
تنگ ہے شاد مرے ذوق کی وسعت کے لیے
حلقۂ زلف ہے آفاق کا گھیرا کیا ہے

○

کون سلگتے آنسو روکے، آگ کے ٹکڑے کون چبائے
اے ہم کو سمجھانے والے کوئی تجھے کیوں کر سمجھائے
جیون کے اندھیارے پتھ پر جس نے تیرا ساتھ دیا تھا
دیکھ کہیں وہ کومل آشا آنسو بن کر ٹوٹ نہ جائے
اس دنیا کے رہنے والے اپنا اپنا غم کھاتے ہیں
کون پرایا روگ خریدے کون پرایا دُکھ اپنائے
ہائے مری مایوس امیدیں وائے مرے ناکام ارادے
مرنے کی تدبیر نہ سوجھی جینے کے انداز نہ آئے
اس دنیا کے غم خانے میں غم سے اتنی فرصت کب ہے
کون ستاروں کا منہ چومے کون بہاروں میں لہرائے
ضبط بھی کب تک ہوسکتا ہے صبر کی بھی اک حد ہوتی ہے
پل بھر چین نہ پانے والا کب تک اپنا روگ چھپائے
شاؔد وہی آوارہ شاعر جس نے تجھ سے پیار کیا تھا
شہروں شہروں گھوم رہا ہے ارمانوں کی لاش اٹھائے

○

پھر اس دنیا سے امیدِ وفا ہے
تجھے اے زندگی کیا ہوگیا ہے
بڑی ظالم نہایت بے وفا ہے
یہ دنیا پھر بھی کتنی خوشنما ہے
کوئی دیکھے تو بزمِ زندگی میں
اُجالوں نے اندھیرا کردیا ہے
خدا سے لوگ بھی خائف کبھی تھے
مگر لوگوں سے اب خائف خدا ہے

مزے پوچھو کچھ اس سے زندگی کے
حوادث میں جسے جینا پڑا ہے
مرے پہلو میں دل ہے تو یقیناً
ازل ہی سے مگر ٹوٹا ہوا ہے
زبان و فن سے میں واقف نہیں ہوں
مگر وجدان میرا رہنما ہے
مرے نقاد میری شاعری تو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے
کہاں ہوں شآد میں تو شاد سا ہوں
وہ شادِ خوش نوا تو مرچکا ہے

□□

نصرت گوالیاری

نصرتؔ کے باپ دادا دلّی والے تھے اور زردوزی کے کام کے مشہور کاریگر، لیکن یہ چوں کہ اپنی ننیہال گوالیار میں پیدا ہوئے، وہیں ہوش سنبھالا اس لیے گوالیاری کا لاحقہ ان کے نام کا جز بن گیا اور یہ خاندانی دہلی والے ہوتے ہوئے بھی غیر دہلی والا بن گئے۔ نصرت کا خاندانی نام محمد عثمان ہے۔ یہ ۱۸؍اگست ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد عمر دراز صاحب زردوزی کے کام کے ماہر کاریگر تھے اور ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

نصرتؔ نے بارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدائے شاعری میں جناب عشرت کرتپوری سے اصلاح لی۔ عشرت کرتپوری صاحب جناب احسان دانشؔ کے شاگرد تھے اور ہمدرد دواخانے میں ملازم ہونے کی وجہ سے دہلی میں رہائش پذیر تھے۔ نصرت جب شاعری میں چل نکلے اور دہلی اور اس کے قرب و جوار کے مشاعروں میں اپنے اشعار اور ترنم کا جادو جگانے لگے تو مزید شعری صلاح و مشورے اور تربیت کے لیے عشرت صاحب ہی کے ایماء پر جناب احسان دانشؔ سے رجوع کیا۔ چند برس کی اصلاح اور شعری مشوروں کے بعد جناب احسان دانش نے نصرتؔ گوالیاری کو فارغ الاصلاح قرار دیا۔

نصرتؔ گوالیاری اب خود استادی کے مرتبے کو پہنچ گئے ہیں۔ دہلی اور اس کے قرب و جوار کے شہروں کے انگنت نوجوان شعراء کی ذہنی تربیت اردو شعر و ادب کی خاموش

خدمت کر رہے ہیں۔

"سائبان" (۱۹۸۲) اور "سب خواب" (۱۹۹۸ء) جناب نصرت گوالیاری کے شعری مجموعے ہیں جو منظرِ عام پر آ کر مقبولِ عوام و خواص ہو چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

ختم کر دے یہ شبِ جہل سویرا کر دے
میرا اک خواب تو سچّا مرے مولا کر دے

تہمتیں اس کے رویّے پہ لگانے والو!
وہ کہیں تم کو نہ تصویرِ تماشا کر دے

اعتبار اس کا میں کرنے پہ ہوں بیحد مجبور
جس کا کوئی بھی بھروسہ نہیں کب کیا کر دے

بدحواس اتنے ہوئے دھوپ کی شدت پا کر
لوگ سورج ہی سے کہنے لگے سایہ کر دے

بھول جانے کا مجھے مشورہ دینے والے
یاد خود کو بھی نہ میں آؤں کچھ ایسا کر دے

گہرے سناٹے کی تہ میں بھی چھپی ہیں چیخیں
ایسے سننے سے تو بہتر ہے کہ بہرا کر دے

اے خدا قبر کے مُردوں سے نہیں میری مراد
چلتے پھرتے ہیں جو مردے انھیں زندہ کر دے

اک تماشے کی طرح بھیڑ میں شامل ہیں جو
ان کی پہچان بتا کر انھیں تنہا کر دے

تیرگی ایسی تصور بھی نہ منظر دے پائے
روشنی ایسی کہ سورج کو بھی تنہا کر دے

○

کچھ ایسے پھول ناگہاں ہوا اُڑا کے لے گئی
لگا کہ سارا گلستاں ہوا اُڑا کے لے گئی

مسافروں کے حوصلے بلند تھے بہت مگر
تمام میل کے نشاں ہوا اُڑا کے لے گئی

بندھی ہوئی تھیں رسّیوں سے ساحلوں پہ کشتیاں
انھیں بھنور کے درمیاں ہوا اُڑا کے لے گئی

وہ پتّہ اپنی شاخ سے ذرا جدا ہوا ہی تھا
نہ جانے پھر کہاں کہاں ہوا اُڑا کے لے گئی

یہ مانا نصرتؔ اس گلی میں آپ خود گئے نہیں
تو کیا نصیبِ دشمناں ہوا اُڑا کے لے گئی

○

زاویے بدلو نظر بدلو نہ منظر بدلو
صرف اتنا کرو حالات کے تیور بدلو

پاؤں ڈھکتے ہو تو کھلتا ہے بدن سینے تک
تم نے قد اپنا بڑھایا ہے تو چادر بدلو

بھیڑ میں رہنے سے رشتوں کا جنم ہوتا ہے
اب یہ ویران جگہ چھوڑ دو منظر بدلو

راہ خود اپنی بناتے ہیں تقاضے فن کے
نقش ابھرتے نہیں تیشے سے تو پتھر بدلو

میرے فن پارے پرکھنے کے لیے نقادو
سوچ کے زاویے تنقید کے پیکر بدلو

بام و در اپنی جگہ چھوڑ چکے ہیں نصرتؔ
اس سے پہلے کہ یہ چھت تم پہ گرے گھر بدلو

○

خواب پھولوں کا دکھا رکھا ہے
پیڑ کانٹوں کا لگا رکھا ہے
سستے لمحوں کی خریداری میں
قیمتی وقت گنوا رکھا ہے
ذہن الجھا ہے کسی خواہش میں
دل کہیں اور لگا رکھا ہے
تلخ لہجوں کا گلہ ہے لب پر
زہر نسلوں کو پلا رکھا ہے
واقعی آپ اگر ہیں سچّے
شور کیوں اتنا مچا رکھا ہے
آؤ قد اپنے برابر کرلیں
اختلافات میں کیا رکھا ہے

○

سیلِ غم کے اثر سے گزرا ہے
وقت اندھے سفر سے گزرا ہے
بھیس اکثر بدل کر اک لمحہ
حیرتِ بام و در سے گزرا ہے
رُک گئیں جیسے شہر کی سانسیں
ایسا طوفان سر سے گزرا ہے
لوگ وہم وگماں سے گزرے ہیں
وہ نہ جانے کدھر سے گزرا ہے
آرزو دیکھنے کی کیا کیا تھی
اور کیا کیا نظر سے گزرا ہے
کون جانے وہ جھیل بننے تک
پیاس کے کس کھنڈر سے گزرا ہے

○

خواب تھا روشنی کے منظر کا
ہے سفر آگ کے سمندر کا

پتھر اک دوسرے پہ مت پھینکو
یہ زمانہ نہیں ہے پتھر کا

اپنے گھر کی فضا خراب نہ کر
رنگ اچھا نہیں ہے باہر کا

اک قسم اور زندہ رہنے کی
وار تیکھا سہی مقدر کا

وہ پرندہ ابھی اُڑے گا نہیں
جائزہ لے رہا ہے شہپر کا

بھاگتے پھر رہے ہو تم جس سے
خوف ہے وہ تمھارے اندر کا

ہو رہی ہیں پرستش اس کی
جب سے وہ بن گیا ہے پتھر کا

ایک ہی در بہت ہے میرے لیے
میں بھکاری نہیں ہوں در در کا

□□

نظؔر برنی

نظؔر برنی شاعرابنِ شاعر ہیں۔ ان کے والد جناب خضؔر برنی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے، غزل کے تمام تر تقاضوں کوملحوظِ نظر رکھ کر شعر کہتے تھے۔ نظؔر نے شعری مزاج اُن سے پایا لیکن ان کی شعری روایت کو آگے بڑھانے کی بجائے طنز ومزاح کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔

نظؔر برنی ۱۷رنومبر ۱۹۴۱ء کو بلند شہر میں پیدا ہوئے لیکن تعلیم وتربیت دہلی میں پائی۔ لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی ہیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی سے ڈپٹی لائبریرین کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ متعدد شعری کتابوں کے مصنف ہیں جن میں قابلِ ذکر بوئے گل، متاعِ نظر، ذوقِ نظر، چمچے، کفگیر، گورکھ دھندا، گستاخی معاف، شمعِ فروزاں، شمعِ فروزاں حصہ دوم ہیں۔ ان کے علاوہ نظؔر برنی نے نثر میں مولانا محمد علی : شخصیت اور خدمات اور بعد میں اسی کتاب پر نظر ثانی کر کے ''مولانا محمد علی جوہر: شخصیت اور خدمات'' کے نام سے دوبارہ شائع کی۔ ماہ جنوری ۲۰۰۵ء میں دورانِ حج مکہ مکرمہ میں انتقال ہوا اور مکہ میں ہی تدفین ہوئی۔

نمونۂ کلام:

غزل

ہے اب تو حسیناؤں کا حلقہ مرے آگے
سلمٰی مرے پیچھے ہے زلیخا میرے آگے
بیوی کے لیے کیا کوئی قانون نہیں ہے؟
''ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے''
ہر بھانت کی عورت ہے مرے خواب کی تعبیر
ٹُن ٹُن مرے پیچھے ہے تو ریکھا مرے آگے
اب بچ کے کہاں جایئے ہر سمت ہے دیوار؟
بیوی مرے پیچھے تو بچّہ مرے آگے
بے پردہ وہ کالج میں تو پھرتی ہیں برابر
اوڑھا مری محبوب نے برقعہ مرے آگے
دھن وان ہے سسرال یہی میری سزا ہے
ہر وقت ہی بیوی کا ہے ڈنڈا مرے آگے
کیوں مجھ کو منسٹری سے ہٹانے پہ تلے ہو
''رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے''
کھا کھا کے دوائیں، میں جواں رہتا ہوں ہر دم
لگتا ہے مرا لڑکا بھی ابّا مرے آگے
دس بچوں کے ابّا ہیں، مگر ہے یہی خواہش
ہر وقت ہی بیٹھی رہے لیلٰی مرے آگے
میں اب کے الیکشن میں گنوا بیٹھا ضمانت
ڈوبا مری قسمت کا ستارہ مرے آگے
اب وہ بھی تو کہنے لگے مجھ کو نظر انکل
نکلا ہے مرادوں کا جنازہ مرے آگے

○

کسی کو دے کے "ووٹ" اپنا نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
جو سر خالی ہو "بھیجے" سے تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
ہمارے لیڈروں کی کامیابی کا یہ نکتہ ہے
جو "کرنا ہے" رکھو دل میں وہ پبلک میں بیاں کیوں ہو
کہا صیاد نے پر نوچ کر صحنِ گلستاں میں
گھٹن ہو لاکھ سینے میں مگر آہ و فغاں کیوں ہو
بڑھاپے میں بھی کر ڈالی ہے تو نے تیسری شادی
ذرا انصاف سے کہہ دے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو
"قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم"
چلا ہے جس پر "بلڈوزر" وہ میرا ہی مکاں کیوں ہو
قطب سے کود جاؤں گا اگر مرنا ہی ٹھہرا ہے
"تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو"
وہ کہتا ہے کہ امریکہ کو "لینن" نے بسایا تھا
ہو جب استاد ہی جاہل تو میرا امتحاں کیوں ہو
نظر نے ان کو جب دیکھا تو ڈیڈی ساتھ تھے ان کے
ہمارے درمیاں ہر وقت وہ پیرِ مغاں کیوں ہو

○

وہی بیگم کی خونخواری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہی دیرینہ بیماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہی ٹر ٹر وہی خفگی وہی غمزے وہی عشوے
وہ طعنوں کی بیماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
بڑھاپے میں بھی ان کو شوق ہیں عہدِ جوانی کے
"لپ اسٹک" کی خریداری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

وہی ہے روٹھنا ان کا ، وہی میکے کی ہی دھمکی
وہی ذلت وہی خواری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
کبھی ہے ساس کا رونا کبھی نندوں سے ہے جھگڑا
زباں ہے اس کی "دودھاری" جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
فقط اپنے ہی میکے کی کیا کرتی ہیں تعریفیں
میری اماّں سے بیزاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
ادب کا ڈاکٹر بن کر ملا کیا ہم غریبوں کو
غریبی اور بیکاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
ہوئی شادی ہوئے بچّے نظر کا حال ہے پتلا
وہی اب بھی ہے لاچاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

○

آپ اگر کوشش فرماتے، ملتے جلتے آتے جاتے
خاموشی سے نوٹ دکھاتے، ملتے جلتے آتے جاتے
گر خواہش ہے پروموشن کی چوری چوری باس سے ملتے
دفتر کا دستور نبھاتے، ملتے جلتے آتے جاتے
راہ و رسم سے باس پگھلتا لنچ و ڈنر سے آپ کا ہوتا
خود جاتے یا اسے بلاتے، ملتے جلتے آتے جاتے
سامنے اس کے بن کے رہتے بھیگی بلّی اور چغد بھی
لیکن پیچھے رعب دکھاتے ملتے جلتے آتے جاتے
آپ میں گر ہمّت کی کمی تھی پھر تو سہارا غیر کا لیتے
اس کے چمچوں کو ہی پٹاتے، ملتے جلتے آتے جاتے
خالی محنت اور دیانت افسر کو کیا لینا دینا
ایک منسٹر دوست بناتے ملتے جلتے آتے جاتے

پہلے اپنے ہتھکنڈوں سے لوگوں کو گرویدہ کرتے
لیڈر کی پھر دھونس جماتے ملتے جلتے آتے جاتے
افسر کو افسر ہی سمجھو اپنا نظرؔ وشواس یہی ہے
شان میں اس کی شعر سناتے ملتے جلتے آتے جاتے

○

بڑھاپے میں بھی ان میں عشق کا امکان باقی ہے
ریٹائر ہوگئے پھر بھی بدن میں جان باقی ہے
نہ کرسی ہے نہ عہدہ ہے نہ اب پہچان باقی ہے
صفایا ہوگیا مضمون کا، عنوان باقی ہے
کنارے پر کھڑا محبوب چلاّتا رہا پھر بھی
بھنور میں اپنی کشتی ہے ابھی طوفان باقی ہے
سیاست میں سیاست داں نہیں کرسی ضروری ہے
نہیں ملتے اسے گاہک مگر دوکان باقی ہے
زباں کھلوا نہیں سکتا کسی قیمت پہ وہ ہم سے
اگر منہ میں بنارس کا ذرا سا پان باقی ہے
وہ ہیں مقروض سرتاپا مگر دعوت کھلاتے ہیں
زمیں داری کی ان میں آج تک کچھ آن باقی ہے
نظرؔ تعلیم کے پیشے میں ہم کنگال رہتے تھے
سیاست کا ہمارے واسطے میدان باقی ہے

□□

نظمی سکندر آبادی

سمیع الدین ابن مسیح الدین مرحوم جولائی ۱۹۳۰ء کو فتح پور سیکری آگرہ کے ایک ذی علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بلند شہر کے قصبہ سکندر آباد میں ہوش سنبھالا، میٹرک تک تعلیم پائی، عارضی نوکریاں کرتے ہوئے دہلی سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ہمدرد دوا خانے کی مستقل ملازمت نے فکرِ معاش سے چھٹکارا دلایا تو شاعری کے سوتے رِسنے لگے اور سمیع الدین نظمی سکندر آبادی بن کر دہلی کے ادبی منظرنامے پر اُبھرے۔

نظمی سکندر آبادی کامل نظامی دہلوی کے شاگرد ہیں۔ شیخ ریاض احمد کامل نظامی مرحوم نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی کے شاگرد تھے۔ زبان و بیان پر بھرپور دسترس حاصل تھی۔ خالص شاعرانہ ترنم تھا، مشاعروں میں جم کر پڑھتے تھے۔

جناب کامل نظامی خالص غزل گو شاعر تھے۔ ان کی تربیت نے نظمی سکندر آبادی کے فکر کے سوتے غزل کی طرف موڑ دیے۔ نظمی نے گرچہ ضرورتاً یا فکر کا ذائقہ بدلنے کے لیے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کی غزلوں کا نرم اور سبک انداز ہی ان کی شاعری کی شناخت ہے۔

نظمی سکندر آبادی ایک سادگی پسند اور خاموش طبع انسان ہیں۔ ادبی و سماجی زندگی میں گھن گرج اور ہنگاموں کے قائل نہیں ہیں۔ اب تک تین شعری مجموعے ''کربِ احساس (۱۹۸۸ء)، ''حصارِ فکر'' (۱۹۹۵ء) اور ''فروغِ نظر'' (۲۰۰۲ء) اردو دنیا کو دے چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

نقشِ پا سے راہِ منزل کو جلا دے جاؤں گا
تم سے بچھڑوں گا تو ملنے کا پتہ دے جاؤں گا

سرکشی کی نذر سر ہو بھی گیا تو دوستو
ظلم کے سائے میں جینے کی ادا دے جاؤں گا

مسکرا کر بانٹ لوں گا میں جہاں غیروں کے غم
زندگی پر سوچنے کا زاویہ دے جاؤں گا

میں نے کیا پایا ہے دنیا سے کبھی سوچا نہیں
سوچتا یہ ہوں کہ میں دنیا کو کیا دے جاؤں گا

میرے ہی احباب مجھ سے بدگماں ہو جائیں گے
اِن کی خود بینی کو جس دن آئینہ دے جاؤں گا

جب حصارِ فکر ٹوٹے گا کسی جھٹکے کے ساتھ
اور بھی کچھ اپنی سوچوں کے سوا دے جاؤں گا

میں اگر مٹ بھی گیا نظمی وفا کی راہ میں
آنے والوں کو وفا کا حوصلہ دے جاؤں گا

○

فکرِ مستقبل بھی احساسِ شکستہ پائی بھی
آدمی کو مار دیتی ہے کبھی تنہائی بھی

موسمِ باراں میں اب کے پھول بھی کھلتے رہے
اور زخموں کا پتہ دیتی رہی پروائی بھی

ڈوب بھی سکتا ہے موجوں میں سفینہ شوق کا
دل میں ہوتی ہے سمندر کی طرح گہرائی بھی

ایک ہوں میں اور دو قاتل ہیں راہِ شوق میں
میری کوشش بھی تمھاری حوصلہ افزائی بھی
عمر بھر کے قرض خواہوں میں خوشی بٹ جائے گی
اب اگر دو چار دِن کو زندگی راس آئی بھی
زندگی بھر ہم نے معیارِ نظر اونچا رکھا
سادگی پر جان بھی دی سادگی اپنائی بھی
آج تک راہِ فرارِ غم نہ ڈھونڈی جا سکی
زندگی پر دور تک نقمی نظر دوڑائی بھی

○

کون جانے ہے بجز سیلِ بلا گھر میرا
کس سے پوچھو گے پتہ شہر کے اندر میرا
فکر کی شمع فروزاں ہے اندھیرے میں ابھی
دوش پر میرے سلامت ہے ابھی سر میرا
حادثے چین سے جینے بھی نہیں دیتے مجھے
مجھ میں مرنے بھی نہیں دیتے سخن ور میرا
کتنے ٹوٹے ہوئے کانٹوں سے لہو رنگ ہوں میں
دیکھو آئینۂ اشعار میں پیکر میرا
ہونے کو ارض و سما زیرِ نگیں ہیں میرے
کہنے کو دشت ہے میرا نہ سمندر میرا
میں نے اک بار اُچھالا تھا ہوا میں پتھر
مجھ پہ سو مرتبہ پھینکا گیا پتھر میرا
میری اُفتادِ طبیعت تو ہے قاتل نقمی
زندہ رکھنے کے لیے ہے مجھے، جوہر میرا

○

وہ شخص کوئی جس کا سہارا نہیں ہوتا
زندہ تو نظر آتا ہے زندہ نہیں ہوتا
ہر آدمی رکھتا نہیں زخموں کو چھپا کر
ہر شخص کو جینے کا سلیقہ نہیں ہوتا
اِس دورِ پُرآشوب کی پہچان یہی ہے
تنہائی میں بھی آدمی تنہا نہیں ہوتا
ہوتی ہے تمنا تو نہاں دل میں ہمارے
ہونٹوں پہ مگر حرفِ تمنا نہیں ہوتا
وہ تو یہ کہو راحتیں مربوط ہیں باہم
ورنہ کوئی دنیا میں کسی کا نہیں ہوتا
عسرت تو اندھیرے کو بسا لیتی ہے گھر میں
دولت کے بنا گھر میں اُجالا نہیں ہوتا
یہ سچ ہے کوئی شوق پنپتا نہیں نظمی
ماحول اگر حوصلہ افزا نہیں ہوتا

○

حقیقتوں کے جب آئینہ دار ہم بھی نہ تھے
یہاں کسی کی طبیعت پہ بار ہم بھی نہ تھے
جو تم صبا کی طرح تھے تو راہ میں ہم بھی
تھے سنگ میل کی صورت غبار ہم بھی نہ تھے
دُکھوں کو بانٹ ہی سکتے تھے شہر میں رہ کر
غریب شہر تھا وہ شہریار ہم بھی نہ تھے
زمانے بھر سے چھپاتے جو رازِ دل اپنا
جہاں میں اتنے سلیقہ شعار ہم بھی نہ تھے

گلوں کے ساتھ ہمیں بھی تھا ذوقِ جامہ دری
کہ ناشناسِ مزاجِ بہار ہم بھی نہ تھے
تجھے تھا کون وفاؤں سے روکنے والا
تری نظر میں تو بے اعتبار ہم بھی نہ تھے
بس اک صفت تھی بہم قدرِ مشترک نظمی
وہ سادہ دل تھے بہت ہوشیار ہم بھی نہ تھے

○

جیالوں کی طرح خوش ہم بھی ہر منظر میں رہتے ہیں
تبسم لب پہ رہتا ہے مسائل سر میں رہتے ہیں
نہ جانے چاہتی ہیں دیکھنا کس کس کو خوش آنکھیں
نہ جانے کتنے ارماں اک دلِ مضطر میں رہتے ہیں
پڑوسی نام سے واقف نہ شغل و شوق سے اپنے
عجب انداز سے ہم لوگ اپنے گھر میں رہتے ہیں
ردائے حیثیت سے ہم کبھی باہر نہیں جاتے
ہمارے دست و پا سمٹے اسی چادر میں رہتے ہیں
کسی سے کیا کہیں جب سے ہوا بدلی ہے دنیا کی
قیامت دل میں رہتی ہے قدم محشر میں رہتے ہیں
دلوں کے سرد خانوں میں پڑے جذبوں کو گرما کر
جو کوئی کام لیتے ہیں وہ پس منظر میں رہتے ہیں
ذرا تکرار ہو نظمی حکومت جاگ اُٹھتی ہے
ہمیں بستی میں لگتا ہے کہ ہم لشکر میں رہتے ہیں

□□

نیّر قریشی

نیّر قریشی جن کا خاندانی نام سعید احمد ہے۔ ۲۱رستمبر ۱۹۳۸ء کو ضلع سہارنپور کے گنگوہ جیسے مردم خیز قصبے میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم پانے کے بعد دہلی کو اپنا وطنِ ثانی بنایا اور ۱۹۵۵ء سے یہیں مقیم ہیں۔ تجارت ان کا پیشہ ہے۔

شاعری میں جناب بسمل سعیدی جیسے قادرالکلام اور مسلم الثبوت استاد شاعر کے شاگرد ہیں۔ کاروباری مصروفیتوں کی وجہ سے شعری و ادبی سرگرمیوں سے دور رہتے ہیں۔ نیّر قریشی کا پہلا شعری مجموعہ ''نمودِ سحر'' ۱۹۸۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

نئی صدی کے تقاضوں کا سامنا کرنا
پھر اُس کے بعد وفا کا مطالبا کرنا

لگام دوں اسے کیسے زبان ان پڑھ ہے
اسے تو آتا ہے سچ بات برملا کرنا

نئے زمانے کے بچوں کی شوخیاں دیکھو
شرارتوں میں بڑوں کا مقابلہ کرنا
غرض کی اس میں حرارت ہے یا ہے سچّی لگن
کسی کے پیار کا پہلے مطالعہ کرنا
تعصب اپنے پرائے کا دل میں آئے کیوں
جو حق ہو جس کا خوشی سے اُسے ادا کرنا
محافظوں کو کرو پیش پیار کی خوشبو
کبھی نہ جنگ کا اُن سے مطالبہ کرنا
جھکاؤ سر نہ ستم گر کے سامنے نیّر
ہمیشہ ڈٹ کے ستم کا مقابلہ کرنا

○

یہ کس کے تکلّم کا جادو بہت ہے
فضائیں معطّر ہیں خوشبو بہت ہے
گھنے دشت میں ہے عجب ہو کا عالم
اندھیرا مٹانے کو جگنو بہت ہے
زباں پر نہ لایا وہ حرفِ شکایت
غمِ دل سنانے کو آنسو بہت ہے
فریبِ نظر ہے وہ شاداب چہرا
اداسی چھپانے کو گھنگرو بہت ہے
زمانے پُر ہول رستوں سے کیا ڈر
"دل آنگن" کی تابش کو بس تو بہت ہے
بزرگوں کا ورثہ ہے تہذیب نیّر
مرا میرے بچّوں پہ قابو بہت ہے

○

جدوجہد کا دل سے ارادہ کرے کوئی
جینے کی راہ پھر نئی پیدا کرے کوئی

بوکر بدی کے بیج، بھلائی کا پھل ملے
کم ظرف ہے جو ایسی تمنا کرے کوئی

اب کیسے آدمی پہ کریں گے یقین ہم
کیوں اپنے اعتبار کا سودا کرے کوئی

کس کے خیال وخواب میں ہم جاگتے رہے
رونا ہمارا رات میں دیکھا کرے کوئی

میرے نگر میں محوِ سفر یوں تھا اجنبی
گلشن میں سیر جیسے کہ تنہا کرے کوئی

نیّرؔ شکستہ پا ہے تھکن سے ہے چور چور
اب کیا زمانہ اُس سے تمنا کرے کوئی

○

دنیا کی نگاہوں میں سر افراز رہے گا
فن کار کا کردار جو ممتاز رہے گا

ہاتھوں کے قلم ہونے کا افسوس کہاں تک
یہ ذوقِ عمل محوِ تگ و تاز رہے گا

شہرت کی تمنا اسے افشا نہ کرے گی
پوشیدہ مرے دل میں ترا راز رہے گا

طوفاں کے تھپیڑوں سے وہ ہوگا نہ ہراساں
اک رحمتِ یزداں پہ جسے ناز رہے گا

جو خونِ جگر ہم نے دیا غنچۂ و گل کو
گلشن کے لیے مایۂ صد ناز رہے گا

اب چاہے بکھر جائے یہ شیرازۂ ہستی
دل میرا مگر پیار کا غماز رہے گا
پہنچے گا وہی منزلِ مقصود پہ نیّر
ہر لمحہ جو مصروفِ تگ و تاز رہے گا

□□

واجد سحری

سیّد واجد حسین رضوی جو شعر و ادب کی دنیا میں واجد سحری کے نام سے مشہور ہیں ۱۹۳۹ء میں رامپور، اتر پردیش کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں ہمدرد دوا خانے کی ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں عزیز وارثی، عشرت کرتپوری، زبیر رضوی، مخمور عثمانی اور یعقوب عامر جیسے بہت سے معروف اور غیر معروف شاعر ہمدرد میں ملازم تھے اور دواخانے کی فضائیں شعر و شاعری کے چرچوں سے معمور رہا کرتی تھیں۔ حالاں کہ واجد سحری کی ننیہال میں شعری و ادبی ماحول تھا اور ان کے حقیقی ماموں جناب سحر رامپوری بذاتِ خود بہت اچھے شاعر تھے، لیکن واجد کی شاعری نے ہمدرد دواخانے کے نیم ادبی ماحول میں ہی آنکھ کھولی اور دہلی کی ادبی فضاؤں میں پروان چڑھی۔

واجد نے اپنے ماموں سحر رامپوری کی نسبت سے سحری کا لاحقہ اختیار کیا وگرنہ وہ شاعری میں ہمدرد میں اپنے رفیقِ کار جناب جرار چھولسی کے شاگرد ہیں۔ جرار صاحب کے علاوہ واجد نے پاکستان کے مشہور شاعر جناب مظفر وارثی سے بھی اصلاح لی اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ واجد سحری مترنم شاعر ہیں لیکن اب تحت میں مشاعرے پڑھتے ہیں۔

واجد سحری کے اب تک تین شعری مجموعے "سنہری آنچ" (۱۹۸۴ء)، "تصویرِ حرف" (۱۹۹۴ء)، مطبوعہ کراچی اور "پیاس کا دریا" (۲۰۰۲ء) شائع ہو چکے ہیں۔ ان

شعری مجموعوں کے علاوہ واجدؔ نے ۱۹۸۰ء میں '' غالب کی رہگزر'' کے عنوان سے غالب کی غزلوں کی زمین میں کہی ہوئی دوسرے شعراء کی غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا۔ '' روحِ افکار'' (۱۹۷۱ء) کے تحت مختلف موضوعات پر شعراء کے چیدہ چیدہ اشعار کا گلدستہ مرتب کیا اور '' شہنشاہِ کونین'' (۱۹۹۴ء) کے عنوان سے اردو کے تقریباً تمام اہم شعراء کی نعتوں کا خوبصورت مجموعہ مرتب کیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

محروم بصارت ہوں یا آئینے دھندلے ہیں
باتیں بھی کریں جھوٹی سچّے بھی وہ لگتے ہیں

کس طرح انھیں سوچوں کس رُخ سے انھیں پرکھوں
رُخ اُن کے بھی دو دو ہیں انساں نہیں سکّے ہیں

دُشمن ہے ہوا کتنی لے اُڑتی ہے تحریریں
ہم برف کے ٹکڑوں پہ جب بھی تمھیں لکھتے ہیں

شیشہ ہیں نقابیں بھی کشکول ہیں آنکھیں بھی
غیرت سہی نام ان کا وہ ذات کے منگتے ہیں

حق کس نے دیا ان کو انگشت نمائی کا
سایہ بھی جو اوروں کا اوڑھے ہوئے پھرتے ہیں

اے بادِ سحر گاہی اتنا تو بتا جانا!!!
نیندوں کو جو لاتے ہیں وہ کون سے جھونکے ہیں

ٹھہرے ہوئے پانی میں پھینکا ہوا پتھر ہوں
پھیلاؤ ہے سب میرا سب دائرے اپنے ہیں

ان لفظ طرازوں سے کیا بات کروں واجد
ٹوٹے ہوئے لہجے میں سوکھے ہوئے فقرے ہیں

○

زندگی جتنی بہک جاتی ہے
ظرف سے اُتنی چھلک جاتی ہے

جب بھی چلتا ہوں میں اُن رستوں پر
روشنی دور تلک جاتی ہے

اُس کی آواز کے آئینے میں
اُس کی صورت بھی چمک جاتی ہے

بعض اوقات مسافر کی طرح
رہ گزر خود بھی بھٹک جاتی ہے

پاؤں اُٹھتے ہیں جب آزادی کے
ایک زنجیر کھنک جاتی ہے

جب بھی کرتا ہوں میں تنقید اُس پر
بات میں بات اٹک جاتی ہے

عشق کا ایک بھی آنسو ہے بہت
فصل یہ بوتے ہی پک جاتی ہے

اس قدر دل میں چبھے ہیں کانٹے
اب تو خوشبو بھی کھٹک جاتی ہے

بجھنے لگتی ہے تو واجد سحری
شمع کچھ اور بھڑک جاتی ہے

○

لب ہوتے ہیں رنگ و بو کے
دیکھا ہے پھولوں کو چھو کے

لاش پہ منتر پھونک رہا ہے
قاتل بھیس میں ہے سادھو کے

ذہنوں میں کالک ہی کالک
جسموں پر رنگین شلو کے
جیون اپنا گانٹھ رہا ہے
سانسیں ہیں یا تار رفو کے
بیٹھا ہے دھرتی پر انساں
اور اونچے آکاش پہ تھوکے
چہک رہی ہے خاموشی بھی
باغ میں جیسے کوئل کوکے
اپنے جسم کے میخانے سے
پیتے ہیں ہم جام لہو کے
اُن زلفوں کی چھاؤں میں بیٹھوں
جھونکے جب آتے ہیں لو کے
میخانے پر چھائے ہوئے ہیں
مے کے ندیدے جام کے بھوکے
لب پر میٹھی بات ہے واجد
تیور ہیں تیکھے ابرو کے

○

گواہ جرم بنا ، فیصلے دلیل ہوئے
جنھوں نے دعویٰ کیا تھا وہی وکیل ہوئے
تجوریوں کو فقط دھن ہی زیب دیتا ہے
جو عزتوں کے خریدار تھے ذلیل ہوئے
خود اپنی زندگیوں سے مذاق ہم نے کیا
کبھی چراغ کبھی راہ کی فصیل ہوئے
عدالتوں میں بھی انصاف بکتے دیکھا ہے

جنھوں نے ساتھ دیا ظلم کا عدیل ہوئے

کیا جو صبر تو سیراب کربلا کردی

نہیں کیا تو شیاطین غرقِ نیل ہوئے

جو بے قرار تھے اوروں کی لاش روندنے کو

سنا ہے اپنے ہی تابوت کی وہ کیل ہوئے

بہت پجاری تھے جب آگ اور جادو کے

اُسی زمانے میں موسیٰ ہوئے خلیل ہوئے

نہ کوئی مجھ سے بھی واجدؔ مریضِ دل ہوگا

علاج کر کے مرا چارہ گر علیل ہوئے

○

اپنی آنکھوں کے سمندر سے پلادو جانم

تشنگی اب تو الاؤ ہے بجھادو جانم

گھر کا آئینہ تو اُکتا گیا چہرے سے مرے

اپنے چہرے کا اب آئینہ دکھادو جانم

ہم سے ہر موڑ پہ کترا کے نکلنے والی

ہمسفر بھی کہیں ہم ہوں گے بتادو جانم

دل ہے دریا تو ہیں گرداب تمھاری یادیں

ڈوبنے دو مجھے یا پار لگادو جانم

خود ہی بولے نہ مری بات کا دے کوئی جواب

اپنی تصویر بھی کمرے سے ہٹا دو جانم

تم مری راہ گزر پر کوئی احساں تو کرو

سبزہ و گل نہ سہی سنگ بچھادو جانم

ایک مدت سے ہے واجدؔ سحری چپ چپ سا

اس کی حالت یہ سہی اس کو ہنسادو جانم

○

آنچل یہ گریں اس کے یہ کچھ کم تو نہیں ہے
آنسو ہیں مری آنکھ کے شبنم تو نہیں ہے
لہراتا ہے کیوں تیز ہواؤں میں ستمگر
یہ میرا گریبان ہے پرچم تو نہیں ہے
جس راہ سے جاتے ہیں محبت کے سفر پر
اُس راہ میں اک موڑ ہے سنگم تو نہیں ہے
چل کر ترے دروازے پہ میں آتو گیا ہوں
لیکن مری گردن میں کوئی خم تو نہیں ہے
میں ہوں مری پرچھائیں ہے یا چاپ ہے میری
تنہائی کا عالم کوئی عالم تو نہیں ہے
قاتل سے تو امید نہیں چارہ گری کی
زخموں پہ لہو جم گیا مرہم تو نہیں ہے
سوکھے ہوئے پتّے ہیں بہاروں کے عزادار
گلشن بھی ترا کوفۂ ماتم تو نہیں ہے
ٹانکوں تری چادر پہ یہ آنسو بھی میں کیسے
سوئی میں رگیں ہیں مری، ریشم تو نہیں ہے
واجدؔ کو بھی تسلیم تو کرتا ہے زمانہ
ہر چند کہ یہ شاعرِ اعظم تو نہیں ہے

○

سر اپنا اُٹھا کر سرِ مقتل بھی چلیں گے
خیراتِ دُعا، بھی کوئی دے گا تو نہ لیں گے
ہم لائے ہیں قدرت سے پتنگے کا مقدر
محفل میں چراغوں کی طرح ہم بھی جلیں گے

میخانے کی تہذیب کو کیا ہوگیا یارو
رِندوں میں شرابیں نہیں پیمانے چلیں گے

حالات کی پت جھڑ سے ملاقات تو ہوگی
ہم پر بھی کبھی اہلِ چمن ہاتھ ملیں گے

ہم بھی وہ مسافر ہیں جو منزل نہیں رکھتے
اے تیز ہوا ہم بھی ترے ساتھ چلیں گے

سچائی کے بازار میں اب جھوٹ چلے گا
سکّے یہی ٹکسال میں دنیا کی ڈھلیں گے

ہر راستہ دشوار ہے ہر موڑ کٹھن ہے
واجد وہ کہاں تک مرے ہمراہ چلیں گے

□□

(مولانا) واصف دہلوی

مفتیِ اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ دہلویؔ جیسے عالمِ دین باپ کے بیٹے اور ابوالمعظم سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی جیسے فصیح البیان شاعر کے شاگرد حفیظ الرحمٰن واصفؔ دہلوی نے باپ اور استاد دونوں کی دینی، علمی اور شعری روایتوں کی پاسداری کی، زبان و بیان کی شاعری کی، علمِ دین حاصل کیا، درس وتدریس سے وابستہ ہوئے، دینیات پر قلم اٹھایا، چار جلدوں میں ''درس الاسلام''، نو جلدوں میں ''فتاویٰ مفتیِ اعظم''، ''جمعیۃ علماء پر تاریخی تبصرہ''، ''اردو مصدر نامہ''، ''تذکرۂ سائل''، ''سہ لسانی مصدر نامہ''، ''ادبی بھول بھلیاں''، ''قصہ بلّی کا'' (فارسی نظم کا اردو منظوم ترجمہ)، ''ترانی پند نامہ''، ''عقیدہ ورواداری'' جیسی مذہبی اور دینی کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔ ۱۹۷۶ء میں اپنا شعری مجموعہ ''زرِ گل'' منصۂ شہود پر لائے لیکن ادبی گہما گہمیوں، مشاعروں اور شعری نشستوں سے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھا، کہیں آتے جاتے نہیں تھے حتیٰ کہ ابیات و ادبیات سے تعلق رکھنے والے حضرات سے بھی کوئی رسم و راہ نہیں تھی۔ اس خانہ نشینی اور لاتعلقی کی وجہ سے مولانا واصفؔ کا کلام کبھی ادبی رسائل و جرائد کے صفحات کی زینت نہ بن سکا اور سخن فہم حضرات اُن کے شعری کمالات سے واقف نہ ہو سکے۔

واصف صاحب ۱۰ر فروری ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے اور ۱۳ر مارچ ۱۹۸۷ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

کبھی جھلکا طرف حجاب سے کبھی جھانکا گوشۂ بام سے
مری کم نگاہی کو ہے گلہ ترے حسن برقِ خرام سے
جو یقیں نہیں ہے تو فائدہ نہ سجود سے نہ قیام سے
کہ ہزار منزلیں طے ہوئیں مری ایک لغزشِ گام سے
تجھے کیا بتاؤں میں ہم نشیں نہیں کھیل غم کا نباہنا
یہ ہے اور بات کہ چپ رہوں کبھی احتیاطِ مقام سے
کوئی سن سکے تو سناؤں میں جو کھلی ہیں مجھ پہ حقیقتیں
کسی میکسار کی صبح سے کسی غم نصیب کی شام سے
رہے جھونکے بادِ نسیم کے رہے چھینٹے ابرِ بہار کے
مگر آج تک نہ ملا سکوں مرے دل کو سوز دوام سے
ابھی کاٹنی ہے شب فراق ابھی جھیلنی ہیں مصیبتیں
دل زار تجھ کو یہ کیا ہوا کہ ہے مضمحل سرِ شام سے
یہ بنا رہے ترا میکدہ وہ شراب دے مجھے ساقیا!
کہ بدل دوں گردشِ چرخ کو فقط ایک گردشِ جام سے
اسی اجنبی سے ہے دوستی اسی بے وفا سے ہے واسطہ
نہ نوازے واصف زار کو جو کبھی جوابِ سلام سے

○

مرا پروانۂ دل اپنی منزل یاد رکھتا ہے
کہ جلتا ہے مگر آدابِ محفل یاد رکھتا ہے
ستارے یہ ستارے کیا کریں گے رہبری میری
مرا ہر اک قدم خود اپنی منزل یاد رکھتا ہے

نکالا تھا بڑی ذلت سے جس کو تو نے محفل سے
وہ جنت میں بھی جا کر تیری محفل یاد رکھتا ہے
بہت نازک سی حد ہے بیخودی میں اور مستی میں
وہی ہے باخبر جو حدِ فاصل یاد رکھتا ہے
مٹا کر اپنی ہستی رُخ بدل دیتا ہے طوفاں کا
بگڑنے پر بھی قوت اپنی ساحل یاد رکھتا ہے
خدا کا واسطہ دوں گا اسے میں نے یہ سوچا تھا
مگر اب تو خدا کو بھی وہ قاتل یاد رکھتا ہے
تلاشِ عزت و شہرت میں کیوں آوارہ ہے واصفؔ
وہی انساں ہے جو خود اپنی منزل یاد رکھتا ہے

○

دل کشی اب کوئی گلگشت خیاباں میں نہیں
واقف اپنا کوئی اب صحن گلستاں میں نہیں
ضعف پیہم سے اگر مجھ کو نہیں تابِ سخن
تم سمجھتے ہو تلاطم مرے ارماں میں نہیں
پیش کر نذرِ وفا اہل توکل کے حضور
پرسشِ جنس وفا درگاہ سلطاں میں نہیں
دولت ہر دو جہاں جس سے گداؤں کو ملی
آج وہ صبر و رضا مردِ مسلماں میں نہیں
خار ہوں تیری نظر میں ہوں مگر جز و چمن
کیا رگِ گل کا لہو خارِ گلستاں میں نہیں
کیا ہوا قیدِ قفس سے جو رہائی بھی ملی
خاک بھی اب تو اڑانے کو گلستاں میں نہیں
یہ تو واصفؔ ہے جو رویا ہے باندوہ چمن
اشک شبنم کی نمی خاکِ شہیداں میں نہیں

○

چُن لیا قدرت نے تجھ کو آزمانے کے لیے
حوصلہ پیدا کر اے دل غم اٹھانے کے لیے
قتل کی دیتے ہو دھمکی آزمانے کے لیے
کچھ سلیقہ چاہیے میرے ستانے کے لیے
گریۂ شبنم ہے غنچوں کے تبسّم کی دلیل
اشک پیدا کر چمن میں مسکرانے کے لیے
ہم نشیں ہم بیکسوں کی بے نوائی کو نہ دیکھ
آسماں کافی ہے ہم کو سر چھپانے کے لیے
دم بخود نیچی نگاہیں پیکرِ تسلیم ہوں
مجھ سے بہتر کون ہوگا آزمانے کے لیے
ہے یقیں دل میں تو کچھ اندیشۂ طوفاں نہیں
موج اٹھ کر آئے گی تجھ کو بچانے کے لیے
کیا کرو گے سن کے افسانہ دلِ مظلوم کا
اک زمانہ چاہیے سننے سنانے کے لیے
کس قدر مشکل ہے دنیا میں مسرت کا حصول
کتنے ساماں ہوتے ہیں گل کو ہنسانے کے لیے
غم بڑی شے ہے اگر دل میں ہی پوشیدہ رہے
ہاں مگر دل چاہیے غم کو چھپانے کے لیے
مدعی ہرگز نہ ہوگا کوئی میرے خون کا
کون آئے گا تمھارے ناز اٹھانے کے لیے
بھول جا اے ہم نشیں افسانۂ نجد و یمن
اب تو ہم ہیں باعثِ عبرت زمانے کے لیے

ہم جگانے آئے تھے اور خود ہی آ کر سو گئے
اب ہمیں کون آئے گا واصفؔ جگانے کے لیے

○

پے بہ پے قاصد وہاں آتے رہے جاتے رہے
عمر بھر ہم یوں ہی اپنے دل کو بہلاتے رہے

پوچھتے ہیں وہ ترے جی میں ہے کیا کچھ تو بتا
کیا بتائیں ہم تو اپنے جی سے ہی جاتے رہے

کیا خبر تھی بزم میں وہ شوخ بھی آجائے گا
مدتوں اپنی غزل ہم پڑھ کے پچھتاتے رہے

سامنے آنکھوں کے اپنا گلستاں لٹتا رہا
اور ہم بے چارگی کا اپنی غم کھاتے رہے

آنکھیں ہی ملتے رہے ہم آئی جب فصلِ بہار
پھول اس گلشن کے اک اک کر کے مرجھاتے رہے

امتحاں راہِ طلب کا کس قدر جاں سوز تھا
رہنما ملتے رہے اور ہم کو بھٹکاتے رہے

باتوں باتوں میں ہنسایا میں نے ان کو بارہا
وہ مگر مجھ کو ہمیشہ خون رُلواتے رہے

مدعا یہ تھا ، رہے شاداب کشتِ آرزو
اپنی آنکھوں سے ہمیشہ اشک برساتے رہے

ایسی قسمت تھی کہاں واصف کہ وہ دیتے جواب
پھر بھی ہم ان کو سلامِ شوق کہواتے رہے

شاہجہاں آباد مرحوم

دلّی جو ایک شہر ہے دلچسپ و دلرُبا
اہلِ کمال سے کبھی خالی نہیں رہا
سنتے تھے یہ مقولہ بزرگوں کا برملا
واصفؔ ہمیں بھی اس میں کبھی شک نہیں ہوا

افسوس اب وہ شہر تو افسانہ ہوگیا
اپنی نظر میں آہ وہ ویرانہ ہوگیا

اب ہے یہ ورکشاپ ٹھنا ٹھن دھڑم دھڑام
منڈی ہے اک بڑی سی کھٹا کھٹ کھڑم کھڑام
پہلو میں کہنیاں لگیں چلیے اگر دوگام
سنیے عجب زبان اگر ہو کہیں قیام

شائستگی کے قاعدے مفقود ہوگئے
خلق و ادب کے ضابطے نابود ہوگئے

مرکز وہ علم و دانش و فن کا کہاں گیا
مجمع وہ اہلِ شعر و سخن کا کہاں گیا
جھونکا نسیمِ صحنِ چمن کا کہاں گیا
وہ قافلہ کنار جمن کا کہاں گیا

اہلِ کمال اب ہمیں ملتا نہیں کوئی
اک لفظ جس سے پوچھیے ایسا نہیں کوئی

وہ اہلِ علم و اہلِ ہنر کی حویلیاں
وہ حلقہ ہائے درسِ حکیمانِ خوش بیاں
تہذیبِ عہدِ رفتہ ہوئی خاک میں نہاں
باقی نہیں ہے شہر میں اس کا کوئی نشاں

ملک فنا کی سمت رواں کائنات ہے
باقی ہے جس کی شان وہی ایک ذات ہے

وشواناتھ دردؔ

شاعر، صحافی اور نثر نگار وشواناتھ دردؔ ۱۹۲۴ء میں راولپنڈی کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے میں انقلاب کے نعرے لگائے اور صعوبتیں برداشت کیں۔ صحافت اور درس و تدریس کے پیشے اپنائے، پرائیویٹ اسکولوں میں انگریزی کے مدرس رہے، کئی ادبی و نیم ادبی ماہناموں کی ادارت کی۔ رائے زادہ کے قلمی نام سے اردو ہندی میں متعدد ناول لکھے۔ اب گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

ساقی بھی وہی، ساغر بھی وہی، وہ بات نہیں پیمانوں میں
دل جن کے سہارے زندہ تھا، وہ جان کہاں ارمانوں میں
دل خون جو ہوکر بہتا ہے، بہنے دو اسے تم بہنے دو
دل کا تو ذرا غم بھی نہ کرو، تم رنگ بھرو افسانوں میں
جو پھول کھلیں گلزاروں میں، وہ رونق محفل ہوتے ہیں
وہ جانِ بہاراں ہوتے ہیں، جو پھول کھلیں ویرانوں میں

دیکھے یا سنے ہیں تم نے کہیں، ایسے بھی شرابی کچھ تو کہو
جو ابھرے ہوں میخانوں میں اور ڈوبے ہوں پیمانوں میں
مت روک مجھے پینے سے کہ میں یہ سوچ سمجھ کے پیتا ہوں
شاید کہ بجھادے دل کی لگی، یہ آگ ہے جو پیمانوں میں
جو کچھ بھی کہا وہ ہم نے کہا، جو کچھ بھی کیا سو ہم نے کیا
جو آئے کسی کے جی میں کہے، اب آ جو گئے بیگانوں میں

○

در کھلا جب بھی کسی فریاد کا
چھڑ گیا چرچا تری بیداد کا
یوں کسی کی یاد آ کر چھو گئی
جیسے عنواں ہو کسی روداد کا
کیا کریں اپنی اسیری کا گلہ
کھٹکھٹایا ہم نے در صیّاد کا
دیر تک سکتے کے عالم میں رہے
جب خیال آیا دلِ ناشاد کا
ہر طرف دیوار بے مہری ملی
کس جگہ سر پھوڑتے فریاد کا
آج تک زندہ رہا احساسِ غم
ہے کرم یہ بھی کسی کی یاد کا
اپنی بربادی پہ رونا آ گیا
حشر دیکھا جب کسی برباد کا

□□

وقار مانوی

وقار مانوی کا اصلی نام محمد ظہیر ہے۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۳۹ء کو محمد نظیر خاں صاحب کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اوائل میں جب شاعری شروع کی تو محمد ظہیر سے ظہیر وقار ہو گئے۔ شعر و ادب کی دنیا میں باقاعدہ قدم رکھا تو یہ ظہیر وقار مانوی ہو گئے۔ وقت گزرنے، لہجے میں توانائی اور شعر میں پختگی آنے کے بعد یہ صرف وقار مانوی رہ گئے ہیں اور شعری و ادبی محفلوں اور اردو رسائل کے قارئین کے حلقوں میں اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں لیکن وقار کے ساتھ مانوی کی نسبت عام لوگوں کے لیے چیستاں سے کم نہیں۔ مشاعروں کے سامعین اور رسائل کے قارئین ان کو مشرقی یوپی یا بہار کے مانہ نامی کسی غیر معروف گاؤں یا قصبے کا رہنے والا سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ پشتینی دہلی والے ہیں۔ شعر و شاعری کے دلدادہ دہلوی باپ دادا کی اولاد اور مصورِ غم علامہ راشد الخیری جیسے ادیب شہیر کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بھی دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے اور تعلیم و تربیت پائی لیکن عام دلی والوں کی طرح دہلوی کو جزوِ نام بنانے کی بجائے اپنے استاد علامہ مانی جائسی کے نامِ نامی کو نسبت کے طور پر اختیار کر کے مانوی ہو گئے۔ علامہ مانی جائسی اپنے وقت کے قادر الکلام شاعر تھے اور کسی زمانے میں جوش ملیح آبادی کے اتالیق بھی رہ چکے تھے۔

وقاؔر مانوی گھر کے نامساعد حالات اور معاشی تنگی کی وجہ سے ہائی اسکول سے آگے تعلیم نہیں پا سکے اور ان کی صلاحیتوں کو کھل کھیلنے کا بھرپور موقع نہیں مل سکا لیکن اس کے باوجود ان کی صلاحیتیں چھپی ہوئی نہ رہ سکیں۔ ابتدائی عمر میں کیرم سے شغف رہا اور یہ شغف اتنا بڑھا کہ بارہ سال کی عمر میں دلّی اسٹیٹ کیرم چیمپئن شپ کا مقابلہ جیت کر بڑوں بڑوں کو حیران کر دیا۔ کم عمری کی مناسبت سے وقاؔر مانوی کا یہ ریکارڈ آج تک قائم ہے۔ کیرم کے ساتھ شاعری کا شوق شروع ہوا اور یہ شوق اس قدر بڑھا کہ کیرم کو چھوڑ کر شعری دنیا کے ہی ہو رہے۔ وقاؔر مانوی نے کیرم کی دنیا کی طرح شعری دنیا میں بھی اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔ ان کی شاعری کی طرح ان کا ترنم بھی خوبصورت اور جاندار ہے۔ مشاعروں میں پسند کیے جانے والے ترنم اور دلوں کو گدگدا دینے والی شاعری کے باوجود وقاؔر مانوی مشاعروں کی دنیا سے بہت دور ہیں۔ مشاعروں سے دوری کا سبب ان کی وہ بے نیازی اور خودداری ہے جو ان کو اپنے بڑوں سے ورثہ میں ملی ہے اور بے نیاز لوگوں کی صحبت میں پروان چڑھی ہے۔

وقاؔر مانوی ستائش کی تمنا سے بے نیاز خاموشی کے ساتھ عروسِ غزل کے گیسو سنوار رہے ہیں اور اب تک تین شعری مجموعے وقارِ سخن (۱۹۷۸ء)، وقارِ آگہی (۱۹۹۱ء) اور وقارِ ہنر (۱۹۹۸ء) اردو دنیا کو دے چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

سہہ سہہ کے غم کے وار غزل کہہ رہا ہوں میں
پھر یہ کہ شاہکار غزل کہہ رہا ہوں میں
رُک جا غمِ جہاں، درِ دل پر صدا نہ دے
ہوں محوِ یادِ یار غزل کہہ رہا ہوں میں
ایسے میں غم گساری بھی خاطر پہ بار ہے

اے میرے غم گسار غزل کہہ رہا ہوں میں
آسودہ ہوں کہ آج دلِ زخم زخم سے
سینہ ہے لالہ زار غزل کہہ رہا ہوں میں
افسردہ ہوں، خزاں کے پُر آشوب دور میں
پھر بھی سدا بہار غزل کہہ رہا ہوں میں
لیکن بیان تیرا سراپا نہ کرسکا
جانِ غزل ہزار غزل کہہ رہا ہوں میں
مائل بہ لطف کاش وہ جانِ غزل بھی ہو
جس کے لیے وقارؔ غزل کہہ رہا ہوں میں

○

آنا نہ سامنے، کہیں اس سامنے کے بعد
ترجیح تم مجھی کو نہ دو آئینے کے بعد
آنکھوں کو اپنی بند نہ کرلوں تو کیا کروں
اب دیکھنا ہی کیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد
دل توڑنا تو سہل ہے لیکن یہ سوچ لو
جوڑا نہ جاسکے گا یہ دل توڑنے کے بعد
ہم جیسی دادِ حسن نہ دے گا یہ آئینہ
آخر ہمیں کو دیکھو گے تم آئینے کے بعد
محسوس یہ ہوا کہ جو مانگا تھا مل گیا
تجھ پر نظر پڑی جو دُعا مانگنے کے بعد
دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کے بھی کہلا رہا ہے دل
آئینہ آئینہ نہ رہا ٹوٹنے کے بعد
بوجھل تمام جسم ہے، شل دست و پا وقارؔ
منزل ملی تو کیا ملی، تھک ہارنے کے بعد

○

مرے وجود کو پامال کرنا چاہتا ہے
جو حادثہ ہے مجھی پہ گزرنا چاہتا ہے
وہ جنبش اپنے لبوں کو نہ دے، یہ بات الگ
ادا ادا سے مگر بات کرنا چاہتا ہے
کماں سے چاہے نہ نکلے کسی کا تیرِ نظر
مگر یہ لگتا ہے دل میں اترنا چاہتا ہے
گماں یہ ہوتا ہے تصویر دیکھ کر تیری
کہ عکس سے تیرا پیکر ابھرنا چاہتا ہے
خوشا یہ زخم، زہے لذتِ نمک پاشی
کرید لیتا ہوں جب زخم بھرنا چاہتا ہے
غریب کو ہوسِ زندگی نہیں ہوتی
بس اتنا ہے کہ وہ عزت سے مرنا چاہتا ہے
میں زندگی کو لیے پھر رہا ہوں کب سے وقار
یہ بوجھ اب مرے سر سے اترنا چاہتا ہے

○

میں نچوڑا جا چکا، نکلے نہ بل تقدیر کے
کتنے گہرے حلقے ہیں اللہ اس زنجیر کے
بس نہیں چلتا کسی کا سامنے تقدیر کے
اُڑتے دیکھے ہیں پرخچے دامنِ تدبیر کے
تم کہو، تم دیکھ بھی سکتے ہو زخموں کی بہار
میرا کیا، میں تو دکھادوں گا کلیجہ چیر کے
دل تو ٹکڑے ٹکڑے ہے پھر بھی دکھا سکتا ہوں میں
دل کے ہر ٹکڑے میں کچھ ٹکڑے تمھارے تیر کے

غم گساری یہ بھی ہے، یہ کرلیا کر، کم سے کم
پاس جاکر بیٹھ جایا کر کسی دل گیر کے
پڑھ لیا کرتا ہوں اکثر اپنی قسمت کا لکھا
آج بھی محفوظ ہیں پُرزے تری تحریر کے
کب سے مصروفِ دعا ہوں لیکن اب تک اے وقارؔ
پاس سے بھی تو نہیں گزری دُعا تاثیر کے

○

وضع داری کا، چلن کا نہ طرح داری کا
یہ زمانہ ہے نمائش کا اداکاری کا
قافلے سے بھی بہت پیچھے ہیں، منزل سے بھی دور
یہ صلہ ہم کو ملا ہے قافلہ سالاری کا
خوش لباسی کی یہ خوبی یہ صفت کم تو نہیں
عیب کچھ دیر چھپا لیتی ہے ناداری کا
آخر اک دن ابدی نیند میں سو جاؤں گا میں
خواب ہو جائے گا عالم مری بیداری کا
اس کی تعبیر میں اک عمر سے ہوں قیدیِ غم
خواب میں دیکھا تھا منظر جو گرفتاری کا
کیا پسندیدہ سی شے ہوگئی ظاہر داری
جو عمل ہے وہ دکھاوے کا ریاکاری کا
آڑے آجاتا ہے ہر راہِ ترقی میں وقارؔ
مسئلہ میری انا کا مری خود داری کا

○

اُدھر مسافتِ منزل بہت زیادہ تھی
اِدھر جو سمتِ سفر تھی خلافِ جادہ تھی

ورق ورق تھی اگرچہ ہمارے دل کی کتاب
عبارت اس کی مگر حرف حرف سادہ تھی

متاعِ عیش تھی اک چھاؤں، ایسی چھاؤں کہ جو
کہیں نہ تھی کہیں کم تھی کہیں زیادہ تھی

وہ آج قافلے میں بھی نہیں جنھیں کل تک
تلاشِ منزلِ مقصود جادہ جادہ تھی

نہ جانے تنگ ہوئی ہم پہ کیوں زمینِ وطن
ہمارے واسطے کل تک تو یہ کشادہ تھی

قدم ہمارے درِ یار ہی پہ جاکے رُکے
ہماری پیش روی گرچہ بے ارادہ تھی

وقارؔ آج کے لوگ اس سے بھی ہیں مستثنیٰ
ہمارے دور میں کچھ قدرِ استفادہ تھی

◻◻

(پنڈت) ہری چند اختر

مشاعروں کے اسٹیج پر اور نجی محفلوں میں مجاز لکھنوی کی بذلہ سنجی اور ظریفانہ چٹکیاں بہت مشہور ہیں اور ادب کا ایک حصہ بن چکی ہیں۔ پنڈت ہری چند اختر بھی اُسی قبیل کے شاعر تھے۔ طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لطائف وظرائف کی پوٹ، بے حد خوش طبع، زندہ دِل انسان تھے۔ ساری عمر ادبی محفلوں کی جان رہے۔ مشاعروں کے اسٹیج پر اور نجی محفلوں میں اپنی بذلہ سنجی اور خوبصورت ظریفانہ چٹکیوں سے دوستوں کے لیے قہقہوں کا سامان فراہم کرتے رہے۔

پنڈت ہری چند اختر ہوشیار پور (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ فارسی میں منشی فاضل اور انگریزی میں ایم۔ اے پاس کیا۔ ابتداء ہی سے شعرو ادب کا ذوق تھا، لاہور میں تعلیم کے دوران ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتوں نے ہری چند کو ہری چند اختر بنا دیا۔

ایم۔ اے کے بعد لاہور میں کچھ عرصہ تک اخبار نویسی کی۔ ہفتہ وار ''پارس'' پارس بنایا۔ ''پھول اور تہذیب'' جیسے رسالوں میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ پنجاب اسمبلی، محکمۂ اطلاعات، جنگی پبلسٹی اور آل انڈیا ریڈیو سے مختلف اوقات میں وابستہ رہے۔ تقسیم وطن کے بعد دہلی کو اپنا مستقر بنایا اور یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو یہیں انتقال ہوا۔

پنڈت ہری چند اختر نہایت خوش ذوق، سخن فہم، پختہ کار اور با کمال شاعر، زبان اور فن کی باریکیوں کے ماہر، لطیف و نفیس نثر لکھنے والے اور صحیح معنوں میں انشاء پرداز تھے۔ مزاحیہ اشعار کہنے، دوسروں کے کلام کی پیروڈی لکھنے اور شعراء کے پڑھنے کی نقل اتارنے میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ سنجیدہ شکل وصورت تھے، خود کم ہنستے لیکن دوستوں کو ہنساتے رہتے تھے۔

پنڈت ہری چند اختر کو ادبی رسائل و جرائد میں چھپنے چھپانے کا شوق نہیں تھا، اس لیے پُرانے ادبی رسائل میں ان کا کلام نظر نہیں آتا۔ کسی زمانے میں اُن کا شعری مجموعہ ''کفر وایمان'' شائع ہوا تھا جواب ناپید ہے۔

نمونۂ کلام:

خدا تو خیر مسلماں ہے اُس سے کیا شکوہ
میرے لیے میرے پرماتما سے کچھ نہ ہوا

○

کہا ہم چین کو جائیں، کہا تم چین کو جاؤ
کہا جاپان کا ڈر ہے، کہاں جاپان تو ہوگا
کہا کابل چلے جائیں، کہا کابل چلے جاؤ
کہا افغان کا ڈر ہے، کہا افغان تو ہوگا
کہا ہم اونٹ پر بیٹھیں، کہا تم اونٹ پر بیٹھو
کہا کوہان کا ڈر ہے، کہا کوہان تو ہوگا
ملے گی شیخ کو جنت، مجھے دوزخ عطا ہوگا
بس اتنی بات ہے جس کے لیے محشر بپا ہوگا
رہے دونوں فرشتے ساتھ اب انصاف کیا ہوگا
کسی نے کچھ لکھا ہوگا، کسی نے کچھ لکھا ہوگا
بروزِ حشر حاکمِ قادرِ مطلق خدا ہوگا
فرشتوں کے لکھے اور شیخ کی باتوں سے کیا ہوگا
تری دنیا میں صبر و شکر سے ہم نے بسر کر لی
تری دنیا سے بڑھ کر بھی ترے دوزخ میں کیا ہوگا

مرکب ہوں میں نسیان و خطا سے کیا کہوں یارب
کبھی حرفِ تمنا بھی زباں پر آ گیا ہوگا

سکونِ مستقل، دل بے تمنا، شیخ کی صحبت
یہ جنت ہے تو اس جنت سے دوزخ کیا بُرا ہوگا

بھروسہ کس قدر ہے تجھ کو اختر ان کی رحمت پر
اگر وہ شیخ صاحب کا خدا نکلا تو کیا ہوگا

○

چمن بندی تو صحرا کی ہوئی لیکن میرا رستہ
اب اگلے سال اے خارِ مغیلاں کون دیکھے گا

مری یاد آئے گی اور سوگ بھی ہوگا مگر تجھ کو
مری آنکھوں سے اے زلفِ پریشاں کون دیکھے گا

دمِ آخر سرِ بالیں پہ نہ آؤ رحم فرماؤ
تمھیں اپنی جفاؤں پر پشیماں کون دیکھے گا

وہاں محشر میں سب کو اپنی اپنی تو پڑی ہوگی
بغل میں لے چلو پینے کا ساماں کون دیکھے گا

○

دیا جنّت کا لالچ شیخ ہم سے یہ کہا ہوتا
چلو کعبے کے رستے میں صنم خانے بھی آتے ہیں

تماشا ہے کوئی جن کے لیے برباد ہوتا ہے
وہی احباب ناصح بن کے سمجھانے بھی آتے ہیں

جنھیں سن کر ضمیرِ حضرتِ یزداں لرز جائے
کتابِ زندگی میں ایسے افسانے بھی آتے ہیں

خدا توفیق دیتا ہے جنھیں رُشد و ہدایت کی
وہ اکثر میکدے میں وعظ فرمانے بھی آتے ہیں

□□

یعقوب عامر

ڈاکٹر یعقوب عامر قصبہ سیوہارہ، اتر پردیش کے ایک ذی علم قاضی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۲؍جنوری ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ وہیں ہوش سنبھالا اور تعلیم و تربیت پائی۔ گریجویشن کے بعد دہلی میں ہمدرد دواخانے کی نوکری سے عملی زندگی کا آغاز کیا، لیکن اس نوکری پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ملازمت کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور شبینہ کلاسوں میں داخلہ لے کر دہلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے و ایم لٹ کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یعقوب عامر نے ایم لٹ اور پیایچ ڈی کے لیے اردو کے شعرائے متاخرین و متقدمین کے ادبی معرکوں پر کام کیا اور ''میر تقی میر کے ادبی معرکے'' اور ''انشاء سے غالب تک: ادبی معرکے'' کے موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھے۔ ''اردو کے ابتدائی معرکے: غواصی سے ملا وجہی تک'' یعقوب عامر کا ادبی معرکوں میں تیسرا بڑا مقالہ ہے جسے ترقی اردو بورڈ نے ۱۹۸۶ء میں کتابی شکل میں شائع کیا۔

یعقوب عامر منفرد انداز کا تحقیقی کام کر کے اور یونیورسٹی کی اعلیٰ ترین ڈگریاں لے کر بھی درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ نہ ہو سکے اور ان کو اعلیٰ تعلیم کا بھرم رکھنے کے لیے حکومتِ ہند کے پبلی کیشنز ڈپارٹمنٹ میں نوکری کرنی پڑی اور اسی محکمے سے اسسٹنٹ

ایڈیٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

یعقوب عامر شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔ نظم و غزل دونوں اصناف میں شعر کہتے ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "آسمانی خطوط" مثنوی کی شکل میں ان کی مشہور طویل نظم ہے جو ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی اور اردو اکادمی، دہلی نے انعام سے نوازا۔ اس کے علاوہ "سبزۂ گفتار" (۱۹۸۰ء)، "دستِ نارسا" (۱۹۸۴ء)، "رقصِ خیال" (۱۹۸۶ء)، "چراغِ انجمن" (۱۹۸۶ء) اور "شعلۂ رخس پوش" (۱۹۸۷ء) ان کے دوسرے شعری مجموعے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

جان کے دشمن لیل و نہار
رہتے غائب ، غیر دیار

کوئی حمایت ساتھ نہیں
صرف مقدر اپنا یار

فصلِ بہاراں دور سے ہم
کب تک دیکھیں رنگِ بہار

ریت کا ٹیلہ سارا نگر
عرصۂ ہستی گرد و غبار

یاد دلائیں کس کو کیا
بھول گئے سب قول و قرار

شہر میں آکر جائیں کہاں
کوئی نہیں ہے راہِ فرار

ساتھ فلک ہے اور نہ زمیں
جان پہ اپنی دار و مدار

تنگ سی راہیں دُھند میں گُم
پاؤں کے نیچے گہرے غار
ٹوٹتے کوٹھے، گرتی چھتیں
ذہن کی بستی سب مسمار
تنگ جہاں محدود سفر
چاروں طرف سے ایک حصار
گلشنِ ہستی سرد و خموش
ظلم و ہوس کے رنگ ہزار
قہر کا ساماں ایک سے ایک
ہم سے نا خوش والا تبار
حضرتِ عامرؔ شکر کرو
تم ہو شکاری اور نہ شکار

○

ہے فتنہ گر کے حق میں ہر گواہی
عجب ہیں یہ سیاست کے سپاہی
نہیں کچھ بے سبب یہ حال اپنا
کہ ان حالوں پہ بھی ہے کج کلاہی
عدو کا جوشِ بد خواہی تو دیکھو
ہمیں دکھلا رہا ہے خیر خواہی
مواقع روٹھتے اُن سے نہ دیکھے
اشارے پر جو دیتے ہیں گواہی
نہیں ہٹتا نگاہوں سے وہ منظر
خود اپنے سامنے اپنی تباہی

غرض مندوں کی اس بستی میں ہم نے
اٹھائیں مشکلیں لیکن تباہی
ہماری قدر دانی کیا کرے گی
ہمارے وقت کی یہ کم نگاہی
کبھی باہر نہ آئی بندگی سے
وفاؤں پر ہماری داد خواہی
محبت میں کیا دل خون ہم نے
کبھی تم نے ہماری خیر چاہی
بھلا چاہا کیا دنیا کا ہم نے
مگر اپنی بھلائی خود نہ چاہی
جہاں اب کچھ نئے چہرے ہیں عامر
کبھی اُن راستوں کے ہم تھے راہی

○

کیسے فریب وقت نے ڈھالے ہیں آج کل
وعدے نہیں ہیں مے کے پیالے ہیں آج کل
شہرت پہ جایئے نہ کبھی اشتہار کی
اخبار نے بھی نام اُچھالے ہیں آج کل
تہذیب کی وہ چاندنی یارو کہاں گئی
زر کے ہر ایک سمت اُجالے ہیں آج کل
دفتر کہیں ہے، گھر کہیں، یار آشنا کہیں
یہ مورچے ہمیں نے سنبھالے ہیں آج کل
اب دودھ بھی پلائیں گے اُن کو کہ ہم نے ہی
کچھ سانپ آستین میں پالے ہیں آج کل

جتنا بھروسا کیجیے نقصاں اٹھائیے
سب اپنا نفع دیکھنے والے ہیں آج کل

آسان راہ تھی مگر پُرپیچ ہوگئی
حرفِ غرض نے ایسے نکالے ہیں آج کل

سب کچھ بدل کے رکھ دیا، ناٹک کے دور نے
دنیا کے کاروبار نرالے ہیں آج کل

عامرؔ بچن نہ لیجیے وعدوں کا کیا یقیں
ہر ہر قدم پہ حیلے حوالے ہیں آج کل

○

سالِ نو اک اور لے کر انتظار آ ہی گیا
لو وہ پھر سے وعدۂ فصلِ بہار آ ہی گیا

فصل میں اب کے اُگے ہیں خار کیسے نوکدار
سوئے خرمن جو گیا ہو کر فگار آ ہی گیا

جب کسی بھی موڑ پر موسم نے کروٹ لی کوئی
ہم پکار اٹھے کہ لو ''ابرِ بہار آ ہی گیا''

مٹ گیا جو کچھ لکھا تھا ہم نے بابِ شہر پر
اب مقدّر پر ہمیں بھی اعتبار آ ہی گیا

زخمِ تازہ شہر میں تقسیم کرنے کے لیے
ایک ساحر اپنے مرکب پر سوار آ ہی گیا

منتظر تھا دیر سے صیّاد کی خوش قسمتی
داؤ پر آخر وہ من چاہا شکار آ ہی گیا

کیوں نہ بوتے وقت دیکھا تھا کہ تخمِ زہر ہے
اُس شجر کا ذکر کیا جب برگ و بار آ ہی گیا

ہو گئے تھے مشتہر سفاک جھونکے وقت کے
پردہ داری کے لیے پھر پردہ دار آ ہی گیا
لے گئے اہلِ ہوس بے چینیاں بھی چھین کر
رفتہ رفتہ اپنی حالت پر قرار آ ہی گیا
اُس نے عامرؔ مجھ کو چاہا نیم بسمل دیکھنا
میں یہ سمجھا مجھ پہ اس قاتل کو پیار آ ہی گیا

مئے پندار

تمھیں حق ہے
مجھے جس رُخ سے چاہو پیش کر سکتے ہو محفل میں
کہ کُرسیِ صدارت پر تمھارا نام لکھا ہے

مرے ماتھے پہ دل آویز خوشنودی کا وہ سجدہ
کہ تم اس دور میں اب جس کو اپنا حق سمجھتے ہو
کہ جس کو دیکھ کر
ٹھٹھری رگوں میں خوں کی آہٹ تم کو ہوتی ہے
کہ جس کو دیکھ کر
تم سرخ رو ہوتے ہو اہلِ قد کے جھرمٹ میں
کہ جس کو دیکھ کر
عظمت تمھاری فخر سے گردن اٹھاتی ہے
مرے ماتھے پہ دل آویز خوشنودی کا وہ سجدہ
کبھی بھی میرے چہرے کا ملمع بن نہیں سکتا
اگر تم آنکھ کے تِل میں بھی کوئی خوردبیں رکھ کر
مرے رنگِ شکستہ کو

کسی خستہ تریں حالت میں دیکھو گے
تو اک باریک سے باریک ذرّہ بھی
مری فطرت کی پہنائی میں آزادی کی نے ہو کر
مرے انفاس کی دنیا میں ہم رنگِ صبا ہو کر
مئے پندار سے سرشار نکلے گا۔

گروہوں میں اُگے چہرے

یہ سب چہرے
گروہوں میں اُگے چہرے
گروہوں میں پلے چہرے
یہ صف آرا، یہ بل کھاتے، یہ ٹکراتے ہوئے چہرے
یہ آویزش کی تپتی دوپہر کے خشمگیں چہرے
یہ چہرے جن کے قامت کی بلندی
سرسری چھو کر گزرنے سے
اُبھر آتے ہیں صدہا نفرتوں کے داغ
ہر انگشت کے اوپر

یہ چہرے جن کی سفاکی کے عبرت خیز افسانے
لکھے جاتے ہیں ہر دن شہر کی دیوارِ گریہ پر
یہ چہرے جو نظر رکھتے ہیں
سیدھی مستقل اپنے نشانے پر
یہ چہرے چھپکلی کی طرح ہر دم
جو شکار آمادہ رہتے ہیں

یہ چہرے جن کی پیشانی پہ
حرفِ مدّعا لکھا ہوا ہے گہری کالک سے

یہ چہرے جن کے نرغے میں
صداقت منصفی کی راہ سے نظریں چراتی ہے
یہ چہرے جو پنپتے ہیں
عداوت کی غلاظت میں، دھڑے بندی کی لعنت میں

یہ چہرے برسرِ منبر
یہ چہرے برسرِ محفل
ابھی تک سرخ رو ہیں کیوں کہ یہ چہرہ سیاست میں
ابھی اقدارِ ہستی کا کوئی چہرہ نہیں اُبھرا۔

□□

یوسف پاپا

بستی، اتر پردیش کے موضع بدیلہ میں یکم اپریل ۱۹۴۰ء کو متولد محمد یوسف نے اپنے ادبی سفر کا آغاز سنجیدہ شاعری سے کیا۔ شاعری میں گرچہ باقاعدہ استاد کسی کو نہیں بنایا، لیکن ابتدائے شاعری میں جناب محمد احمد دلکش سے مشورۂ سخن کیا۔ سنجیدہ شاعری کرتے کرتے طنز و مزاح کے میدان میں نکل آئے اور پاپا تخلص اپنا کر طنز و مزاح کے شاعر یوسف پاپا بن گئے۔

یوسف پاپا زندگی بھر درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہ کر ۱۹۹۰ء میں جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول کے وائس پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ آج کے مشاعروں میں طنز و مزاح کے شاعر ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں، لیکن یوسف پاپا تدریسی ذمہ داریوں کے پیشِ نظر مشاعروں کی دنیا سے ہمیشہ دور رہے۔

''چلم نام'' (۱۹۶۸ء)، ''پاپا کی کنڈلیاں'' (ہندی)، ''دیوارِ قہقہہ'' ۱۹۸۲ء، ''روشن دل'' ۱۹۹۷ء اور ''بچوں کے گیت (ہندی) ۱۹۹۷ء، یوسف پاپا کے شعری مجموعوں کے نام ہیں جو اب تک منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

شیخ جب زیرِ بام ہوتا ہے
کتنا نازک مقام ہوتا ہے
عشق اولاد کر رہی ہے مگر
میرا جینا حرام ہوتا ہے
جس جگہ پر حسین پٹتے ہیں
اس جگہ یہ غلام ہوتا ہے
دل لڈّو سے پھوٹتے ہیں مرے
جب بھی وہ ہم کلام ہوتا ہے
شب میں کوئی ہو اس کے گھر لیکن
صبح کو میرا ہی نام ہوتا ہے

○

کفر کو ملی دنیا زہد نے خدا پایا
میں نے صورتِ بیوی درد لا دوا پایا
رات کے اندھیرے میں حسن کے محلے میں
گھس گئے اُسی گھر میں جس کا در کھلا پایا
ہر صدائے عف عف پر ہڈیوں کی بارش ہے
دورِ نو کے کتّے نے نالۂ رسا پایا
جب بھی پی کے دیکھا ہے دانت مار دیتا ہے
شربتِ محبت کو ہم نے کرکرا پایا
ہے کہاں تمنّا کا تیسرا قدم یا رب
ہم نے دونوں قدموں کا ایک نقشِ پا پایا

○

تیغِ ابرو سے وار کرتا ہے
پھر وہ لاشیں شمار کرتا ہے

پہلے وعدہ وہ یار کرتا ہے
پھر بہانے ہزار کرتا ہے

جب وہ مجھ سے دُلار کرتا ہے
تنگ لیل و نہار کرتا ہے

وہ محبت کے لین دین میں بھی
آرزوئے اُدھار کرتا ہے

پہلے گھر سے نکالتا ہے وہ
اور پھر انتظار کرتا ہے

یوں تو کرتا ہے ہر کوئی کچھ اور
وہ سمجھتے ہیں پیار کرتا ہے

اہلِ اردو جہاں پہ غور کریں
ہندی والا بچار کرتا ہے

وہ مرا یار اپنی علت کو
میرے سر پر سوار کرتا ہے

کیا بندھا وہ امیر لڑکی سے
رات بھر کار کار کرتا ہے

فاعلاتن مفاعلن فعلن
کیوں میاں بار بار کرتا ہے

تیرا پاپا عروض کے بدلے
ایک دو تین چار کرتا ہے

○

میری نظر جدید تو ان کی کمر جدید
آدھا اِدھر جدید ہے آدھا اُدھر جدید
سر کے تغیرات سے دھوکا نہ کھایئے
منت کشِ خضاب ہے صاحب کا سر جدید
جلوت میں جانے کون سے ارکان رہ گئے
پیدا ہوا امام کے گھر میں پسر جدید
گھر میں بجائے بیوی کے وائف جو آ گئی
اس اک جدیدنی نے کیا گھر کا گھر جدید
ہم بن کے ماسٹر بھی وہیں کے وہیں رہے
ہم سے کئی گنا ہے نصیبن کا گھر جدید

○

جب سے ان کی دُم کا چھلّہ بن گئے
ہم اکیلے تھے محلّہ بن گئے
سال بھر میں یا خدا یہ کیا ہوا
مرد سے ہم اوئی اللہ بن گئے
بن گیا جس وقت میں نفرت کی گیند
سب چلم بردار بلّا بن گئے
حسن جب بیوی بنا ہم اس کے بعد
نون لکڑی تیل غلّہ بن گئے
شانتی والوں سے جب کرسی چھنی
سب کے سب ہڑبونگ ہلّا بن گئے
دیکھتے ہی دیکھتے ان کو جبیں صاف بھس
ایک جلوے میں مجلّا بن گئے

شاعرات

اسما سعیدی

جنابِ مخمور دہلوی اور حضرتِ مشیر جھنجھانوی کی طرح جناب بسمل سعیدی کی شعری و ادبی میراث بھی اُن کی بڑی صاحبزادی اسما سعیدی کو پہنچی، جنھوں نے اپنے خاندان کی شعری، علمی و ادبی روایتوں کو خوبصورتی سے نبھایا اور شعر و ادب کی خاموش خدمت کی۔

اسما سعیدی ٹونک میں پیدا ہوئیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی جیسے تعلیمی اداروں میں تعلیم پائی۔ حسرت عظیم آبادی کی شاعری اور شخصیت پر تحقیقی مقالہ لکھ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی لیکن دہلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں اُن پر کسی کالج یا یونیورسٹی میں تو کُجا اسکول کی سطح پر بھی درس و تدریس کے در کھولنے میں معاون ثابت نہیں ہوسکیں جس کے نتیجے میں وہ فرسٹریشن کا شکار ہوگئیں اور اُن کی اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں خانہ داری کی نذر ہوگئیں۔

اسما سعیدی کو گھر کے علمی، ادبی اور شاعرانہ ماحول کی وجہ سے شعر کے ساتھ فطری لگاؤ اور تعلقِ خاطر تھا۔ بسمل صاحب کی معمولی توجہ نے اُن کو ایک اچھی شاعرہ بننے میں بہت مدد کی، ایک اچھی شاعرہ ہونے کے باوجود اسما سعیدی نے اپنی شاعری کو مشاعروں کی نذر نہیں ہونے دیا اور ادبی ہنگاموں سے زندگی بھر دور رہیں۔

"گلہائے فکر" اسما سعیدی کا قابلِ قدر شعری مجموعہ ہے جو حکومتِ ہند کے

ڈپارٹمنٹ آف کلچر کے مالی تعاون سے ۱۹۷۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس اچھی، قابلِ قدر لیکن زندگی کی خوشیوں سے محروم شاعرہ کا انتقال ۱۰ر نومبر ۱۹۹۶ء کو دہلی میں ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

کیوں کر نشاطِ شوق کی مدّت گزر گئی
اک موجِ بوئے گُل اِدھر آئی اُدھر گئی

اک عمر جس امید پر اپنی گزر گئی
آخر کو جان بھی اسی امید پر گئی

دن رات ہو گئے ہیں بہم اک مقام پر
زلفِ سیاہ جب ترے رُخ پر بکھر گئی

وہ ناز وہ غرور وہ انداز کیا کہیں
کس کس طرح نہ ہم پہ قیامت گزر گئی

تھک کر جو آج بیٹھ گئے راہِ عشق میں
اے اہلِ شوق پہلی سی ہمّت کدھر گئی

آسؔما ملی بھی کوئی خوشی کی اگر گھڑی
وہ بھی غموں کی یاد میں یونہی گزر گئی

○

محبت ہے نہ ذوقِ آرزو ہے
حیات اب کس قدر بے رنگ و بو ہے

تصور میں نہیں جلوہ کسی کا
نظر میں ہے نہ کوئی روبرو ہے

کبھی ڈرتے تھے جس کے وہم سے بھی
وہی منظر نظر میں ہو بہو ہے

فضا سنسان ہے اور ہو کا عالم
اندھیرا اور وحشت چار سو ہے
نہیں وہ رونقِ صحنِ گلستاں
بہاروں میں نہ وہ جوشِ نمو ہے
گراں سی ہے نظر کو سیرِ عالم
کمی ہر شے میں گویا کو بکو ہے
اُمنگیں ہیں نہ وہ اب ولولے ہیں
نہ شوقِ سعی و ذوقِ جستجو ہے
مٹا جب دل سے احساسِ محبت
خوشی بھی غم ہے اک طوقِ گلو ہے
کسی کی کج نگاہی کا گلہ کیا
زمانے کی یہی فطرت ہے خو ہے
بہ ایں کیفیتِ صد حزن و حسرت
نظر میں آج بھی بس تو ہی تو ہے

○

نشاط و طرب سے حذر کر چکے
زمانے کو ہم پے سپر کر چکے
نشاں ان کا پاؤ گے کیسے یہاں
کہ جو اس جہاں سے سفر کر چکے
بناؤ نشیمن تم اپنا یہاں
بہر طور ہم تو بسر کر چکے
ضرورت نہیں تیری اے حشر اب
جہاں کو وہ زیر و زبر کر چکے

تغافل کا کیا ہوگا ان پر اثر
تری یاد سے جو حذر کر چکے
یہ پرواز آسماؔ ابھی کچھ نہیں
بہت لوگ طے بحر و بر چکے

○

ناکامیوں کا غم سرِ منزل نہیں رہا
اب دل کسی بھی راہ کے قابل نہیں رہا
سہنی پڑیں کچھ اتنی زمانے کی سختیاں
دل اُن کی آرزو پہ بھی مائل نہیں رہا
اے بارگاہِ حسن یہ کیا وقت آ گیا
تیرے کرم کا اب کوئی سائل نہیں رہا
پامالِ حزن و غفلت و غم کی یہ لاش ہے
اب بھی کہیں گے آپ "میں غافل نہیں رہا"
اب دل ہے اور آرزوئے ترکِ شوق ہے
اب دل کسی کے عشق کے قابل نہیں رہا
کیا حادثاتِ زیست کے ہم نذر ہو گئے
لطف و کرم کسی کا جو شامل نہیں رہا
آسماؔ چہل پہل تھی وہ مجنوں سے دشت میں
اب دل رُبا نظارۂ محمل نہیں رہا

○

تمھیں یہ چاند ستارے تلاش کرتے ہیں
حسین شب کے نظارے تلاش کرتے ہیں
تمھارے نغمۂ دلکش کی گونج ہے اب تک
تمھیں ندی کے کنارے تلاش کرتے ہیں

بچھڑ گئے ہو جو اے رہروانِ راہِ حیات
تمھیں رفیق تمھارے تلاش کرتے ہیں
تمھیں نگاہ بہر سو تلاش کرتی ہے
تصوّرات ہمارے تلاش کرتے ہیں
تمھارے بعد جو تنہا ہیں بیکس و غمگیں
وہ پھر تمھارے سہارے تلاش کرتے ہیں
تمھیں کو ڈھونڈنے میں ساری زندگی گزری
تمھیں کو ہم تھکے ہارے تلاش کرتے ہیں
حسین یاد کے گُل، آہ کے شرارے ہیں
تمھیں یہ گل یہ شرارے تلاش کرتے ہیں
وہ لمحے عشرتِ رفتہ کے آج ہم اسما
کبھی جو ہنس کے گزارے تلاش کرتے ہیں

○

تمھیں مہکی ہوئی دلکش فضائیں یاد کرتی ہیں
سحر کی یہ طرب افزا ہوائیں یاد کرتی ہیں
یہ آہیں یاد کرتی ہیں یہ آنسو یاد کرتے ہیں
تمھیں تھا ناز جن پر وہ وفائیں یاد کرتی ہیں
نشاطِ زندگی بخشی تمھاری جن جفاؤں نے
تمھیں ایک ایک کر کے وہ جفائیں یاد کرتی ہیں
حسیں لمحات گزرے تھے کبھی جن کے کناروں پر
انھیں چشموں کی یہ شیریں صدائیں یاد کرتی ہیں
عروسِ حسنِ فطرت کی ادائیں تم کو پیاری تھیں
وہی پیاری وہی رنگیں ادائیں یاد کرتی ہیں

تمھیں سے کیف ونغمہ تھا نواسنجانِ گلشن میں
نوا سنجان گلشن کی نوائیں یاد کرتی ہیں
نگاہیں بن کے جو تم پر کبھی قربان ہوتی تھیں
تمھیں آسما کے دل کی وہ دعائیں یاد کرتی ہیں

□□

بلقیس ظفیر الحسن

بلقیس ظفیر الحسن (خاندانی نام بلقیس پروین) یکم ستمبر ۱۹۳۸ء کو موتی ہاری (بہار) میں پیدا ہوئیں۔ گرچہ کسی اسکول یا کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن گھر میں ماں باپ کی خصوصی توجہ اور تربیت نے اسکول و کالج کی تعلیم کا تدارک کر دیا۔ اوائلِ عمر میں ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا، لیکن شاعر باپ جناب عنایت الرحمٰن عنایت کی نصیحت اور مشورے پر تخلیقی صلاحیتوں کا رُخ نثر کی طرف موڑ دیا۔ ایک زمانے تک بلقیس رحمانی بانو کے نام سے افسانے اور کہانیاں لکھتی رہیں۔ شادی کے بعد بلقیس ظفیر الحسن کے نام سے افسانہ نگاری کا سلسلہ جاری رہا اور ان کے افسانے اور کہانیاں ادبی رسائل و جرائد میں چھپتی رہیں لیکن گھریلو ذمہ داریوں اور خانگی مصروفیات نے ان کی افسانہ نگاری کو تھپک کر سلا دیا۔

ممکن تھا کہ بلقیس ظفیر الحسن کی افسانہ نگاری قصۂ پارینہ بن جاتی اور ایک تخلیقی ذہن خانگی مصروفیات کی نذر ہو جاتا لیکن دہلی کی ادبی سرگرمیوں نے ان کی افسانہ نگاری کو پھر سے جگا دیا لیکن اس بار افسانہ نگار بلقیس ظفیر الحسن کا شاعرانہ روپ بھی ابھر کر آیا۔ انھوں نے سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے خوبصورت نظمیں بھی سپردِ قلم کی ہیں۔ ''گیلا ایندھن'' بلقیس کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۹۴ء میں اردو اکادمی، دہلی کے مالی

تعاون سے شائع ہوکر مقبول ہوا۔ بلقیس کی بہت سی نظموں کے ترجمے انگریزی اور ہندی کے کلیکشنز میں شائع ہو چکے ہیں۔
بلقیس ظفیر الحسن ڈرامہ نگار بھی ہیں اور اب تک کئی عمدہ ڈرامے تصنیف کر چکی ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

منظر در منظر ہے، کوئی کہاں تک جا سکتا ہے
لا متناہی ایک سفر ہے، کوئی کہاں تک جا سکتا ہے

ساری راہیں لے جاتی ہیں ایک اندھیری گھپ گھاٹی میں
روشنی بس فرلانگ ہی بھر ہے کوئی کہاں تک جا سکتا ہے

گلی گلی کوچے کوچے میں دہشت کی ناکہ بندی ہے
وحشت کے گھیرے میں نگر ہے، کوئی کہاں تک جا سکتا ہے

چھت دیوار سے ٹکرائی گھائل ٹوٹی پرواز پڑی ہے
گنبدِ بے در کوئی یہ گھر ہے کوئی کہاں تک جا سکتا ہے

اپنے آپ میں غلطاں پیچاں اہلِ ہنر اربابِ دانش
بے سمتی میں کھوئی نظر ہے، کوئی کہاں تک جا سکتا ہے

جتنی بار ابھرنا چاہا اور اندر غرقاب ہوئے ہم
لہروں میں پوشیدہ بھنور ہے، کوئی کہاں تک جا سکتا ہے

لیکن جب چلنا ہی ٹھیرا، رکنا اور جھجکنا کیسا
اب کیا سوچیں کون ڈگر ہے کوئی کہاں تک جا سکتا ہے

چاروں کھونٹ تو پھر آئے بلقیس کہاں سے نہ گزرے ہیں ہم
سپنوں والا گاؤں کدھر ہے؟ کوئی کہاں تک جا سکتا ہے

○

جینا ہے خوب اوروں کی خاطر، جیا کرو
اک آدھ سانس خود بھی مگر لے لیا کرو

یوں چپ رہا کرے سے تو ہو جائے ہے جنوں
زخمِ نہاں کرید کے کچھ رو لیا کرو

کیا حرج ہے جو دل کی بھی سن لو کبھی کبھی
یوں اپنے آپ سے نہ ہمیشہ لڑا کرو

یہ بارِ زیست جھیلتے رہنا ہے عمر بھر
اپنی تھکن پہ ٹک کے کبھی سو لیا کرو

اُفعی بھی سو رہے ہیں چنبیلی کی چھاؤں میں
نو واردِ چمن ہو سنبھل کر چلا کرو

اس ناشنیدنی سے تو بہتر ہے چپ رہو
ہے کیا ضرور شکوۂ بے فائدا کرو

نالے اُبل رہے ہوں تو رستہ بھی چاہیے
بلقیسؔ گاہے گاہے غزل کہہ لیا کرو

○

دیوار و در میں سمٹا اک لمس کانپتا ہے
بھولے سے کوئی دستک دے کر چلا گیا ہے

صبر و شکیب باقی، تاب و تواں سلامت
دل مثلِ عود جل جل خوشبو بکھیرتا ہے

ہم خاک ہو چکے تھے اپنی ہی حدتوں میں
سمٹی جو راکھ پھر سے پیکر نیا بنا ہے

اک زخم زخم چہرا ٹکڑوں میں ہاتھ آیا
اور ہم سمجھ رہے تھے آئینہ جڑ گیا ہے

صحرائے نیم شب میں بے آس ریتیوں پر
دن بھر کے کشت وخوں کا مارا تڑپ رہا ہے
دہشت بھری زمیں پر وحشت زدہ مکاں یہ
اس شہر بے اماں کا آخر کوئی خدا ہے
ہم پر تو کھل چکا بھی در بند ہر بلا کا
کیا جانیے اجل کو اب انتظار کیا ہے
مل جائے آبلوں کو دادِ مسافرت اب
اب دردِ بے نوائی کچھ حد سے بھی سوا ہے
گل چینیوں کا ہم سے بلقیس حال پوچھو
انگشتِ آرزو میں کانٹا اتر چکا ہے

○

ایک گردابِ بلا خیز میں ڈوبوں ابھروں
اپنے تنکے کے سہارے میں کہاں تک جوجھوں
راس آئے نہ جنوں ہی نہ خرد کام آئے
اب میں جینے کا نیا حیلہ کہاں پر ڈھونڈوں
خون رو دیتی ہیں آنکھیں مری ہر یاد کے ساتھ
شیشۂ دل کے یہ ریزے میں چنوں یا نہ چنوں
سچ تو دیکھا ہی نہیں کوئی ابھی تک پورا
اک نرا جھوٹ میں اب مان کے سچا دیکھوں
پُر شکایات سے کر رکھے ہیں دل کے اوراق
اُس کی فرصت سے جو مل پاؤں یہ دفتر کھولوں
کیا نہیں ہوتا ہے دنیا میں کبھی تو یوں ہو
میں بھی دیکھوں کبھی اُس کو کبھی گھر کو دیکھوں

ریزہ ریزہ کرے کام ودہن چبھتی ہیں آنکھیں پھر بھی
ریت مٹھی میں بہر طور پکڑنا چاہوں
جان میں کیسی یہ اک لو سی لگی ہے بلقیسؔ
روز آنکھوں میں جلوں اپنی، پگھل کے ٹپکوں

○

دم گھونٹنے والی ہے اُمس بند فضا ہے
طوفان کوئی آئے گا ، یا آ کے گیا ہے؟
ہم خواب میں ہیں یا ہیں خود اک خواب کسی کا
پھر کیوں تڑپتا ہوا کچھ جاگ رہا ہے
جتنا نظر آیا ہے وہ اتنا ہی نہیں تھا
جو سامنے آیا نہیں وہ بھی تو ہوا ہے
آغاز کے اوراق ہیں گم لاپتہ انجام
افسانہ ہے دلچسپ مگر بے سر و پا ہے
اک عالمِ وحشت میں پھرے جاتے ہیں کب سے
کیا پانے کو ہم نکلے تھے اب کس کو پتا ہے
ہے دور فلک اور زمیں پاؤں تلے سخت
نا راہِ مفر کوئی نہ ہی چھپنے کی جا ہے
اک بار تو کھل جاتا کسی پر دلِ کمبخت
کب سے کئے دروازے سبھی بند پڑا ہے
ہاں دید کے قابل تھی کبھی تاب وتب اس کی
یہ داغ سا جو سینے سے اب اپنے لگا ہے
محتاط نہیں رہنے کو کب کہتے ہیں بلقیسؔ
پرچھائیں سے اپنی بھی ڈرو کس نے کہا ہے

○

پابندیوں سے اپنی نکلتے وہ پا نہ تھے
سب راستے کھلے تھے مگر ہم پہ وا نہ تھے

اک آگ سائبان تھا سر پر تنا ہوا
پل پل زمیں سرکتی تھی اور ہم روا نہ تھے

پانی میں رہ کے کوئی نہ بھیگے تو کس طرح
ہم بے نیاز تیری طرح اے خدا نہ تھے

ہرگز گلہ نہیں ہے کہ تو مہرباں نہ تھا
کب ہم بھی اپنے آپ سے بے حد خفا نہ تھے

ناکام آرزو کو مری صبر دے دیا
تیرے کرم کے ہاتھ کبھی بے عطا نہ تھے

وہ اور ہم سے پوچھے کہ بلقیسؔ کچھ تو کہہ
کمبخت ہم! کہ ہوش ہی اپنے بجا نہ تھے

□□

بیگم ممتاز مرزا

مشاعروں میں خوبصورت اشعار اور مسحور کن ترنم سے دیرپا اثرات مرتب کرنے والی بیگم ممتاز مرزا ایک ریجنل اور معتبر شاعرہ تھیں اور برِ صغیر ہندوستان و پاکستان میں شعر کہنے والی خواتین میں ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتی تھیں۔ بیگم ممتاز مرزا ۲۰ر جولائی ۱۹۲۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم کے بعد صحافت سے عملی اور ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ فارسی میں غیر معمولی دسترس رکھتی تھیں۔ ابتداء میں آل انڈیا ریڈیو میں فارسی کی اناؤنسر رہیں پھر ایرانی سفارت خانہ کے تہذیبی شعبے میں سُپر وائزر، لائبریرین، ٹیچر اور مترجم کے فرائض انجام دیے۔

شاعری میں حضرت علامہ میکش اکبرآبادی جیسے قادرالکلام استاد شاعر سے تلمذ حاصل تھا۔ حکومتِ ہند نے ۱۹۷۶ء میں ان کی شعری و ادبی خدمات کے اعتراف میں ''پدم شری'' کے اعزاز سے نوازا۔ بیگم ممتاز مرزا ''پدم شری'' کا اعزاز حاصل کرنے والی اردو دنیا کی پہلی شاعرہ تھیں۔ دہلی اور یوپی کی ریاستی سرکاروں کی اردو اکادمیز نے ان کو متعدد انعامات سے نوازا۔ اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ کونسل کی دو بار ممبر رہیں۔ ''یادوں کے سائے'' کے عنوان سے ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔

۲۸ر جنوری ۱۹۹۷ء کی شب میں انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام:

غزل

وفا فریبِ نظر کھا گئی تو کیا ہوگا
خلوصِ شوخ پہ آنچ آ گئی تو کیا ہوگا
یہ نو دمیدہ، یہ معصوم آرزو کی کلی
بھری بہار میں مرجھا گئی تو کیا ہوگا
یہ چاندنی جو تری یاد سے عبارت ہے
یہ چاندنی بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا
ابھی تو ایک شرارہ ہے غنچۂ نورس
یہ آگ نشو و نما پا گئی تو کیا ہوگا
میں دل کو راہِ وفا سے ہٹا تو لوں ممتاز
جبیں نشانِ قدم پا گئی تو کیا ہوگا

○

سوادِ دشت کہ صحنِ چمن سے گزرے ہیں
جہاں سے گزرے بڑے بانکپن سے گزرے ہیں
تغیراتِ زمانہ سے کیا ڈراتے ہو ؟
ہم آزمائشِ دار و رسن سے گزرے ہیں
بھرا ہوا ہے گلوں سے نگاہ کا دامن
نہ جانے کون صلیبوں کے بن سے گزرے ہیں
ہر ایک شاخ ہے رقصاں، ہر ایک گل خنداں
صبا کے قافلے صحنِ چمن سے گزرے ہیں
کیا ہے جب بھی تصور حیات کا ممتاز
ہر ایک بار اُسی انجمن سے گزرے ہیں

○

لائی بہار شوق کے ساماں نئے نئے
دنیا نئی نئی سی دل و جاں نئے نئے
ساقی کی اک نگاہ نے بخشی حیاتِ نو
دل میں مچل گئے مرے ارماں نئے نئے
ہر آن طرزِ نو سے ستائے ہے آسماں
میرے لیے ستم کے ہیں عنواں نئے نئے
بربادیوں کا میرے نشیمن کی غم نہ کر
تعمیر ہو رہے ہیں گلستاں نئے نئے
فصلِ بہار آئی مبارک ہو اے جنوں
دامن نئے نئے ہیں گریباں نئے نئے
اس چشمِ نیم باز کی وہ کم نگاہیاں
دل میں اتر گئے مرے پیکاں نئے نئے
دل پھر شکارِ وعدۂ فردائے دوست ہے
پھر سے ہوئے ہیں موت کے ساماں نئے نئے
مسجد میں بھی فسانہ بتوں کا جناب شیخ
شاید ہوئے ہیں آپ مسلماں نئے نئے
ممتاز اک چراغ سرِ رہگزر سہی
ہوں گے چراغ اس سے فروزاں نئے نئے

○

یہ میں نے کیا کیا کہ جفا اور بڑھ گئی
جرمِ وفا کے بعد سزا اور بڑھ گئی
گل ہائے رنگ رنگ ہیں، ان کو نہیں ثبات
چپکے سے یہ صبا نے کہا، اور بڑھ گئی

اک برقِ جاں فروز مرے آشیاں کے پاس
ٹھہری بس اک ذرا کی ذرا اور بڑھ گئی
اے ربِ دو جہاں، تری رحمت کے میں نثار
کس جرم کی بنا پہ سزا اور بڑھ گئی
ممتاز، یوں تو بزم میں لاکھوں چراغ ہیں
آنے سے تیرے کچھ تو ضیا اور بڑھ گئی

○

محرومیِ دوام پہ نازاں کوئی تو ہو
اے دل جفائے دوست کے شایاں کوئی تو ہو
آخر کسی کو کہہ تو سکیں رفتۂ بہار
پھولوں کی طرح چاک گریباں کوئی تو ہو
برقِ چمن کو ہم سے عداوت نہیں مگر
ایامِ گل میں سوختہ ساماں کوئی تو ہو
کوئی کلی تو کھل کے ہنسے صحنِ باغ میں
اے دل حریفِ گردشِ دوراں کوئی تو ہو
رسوائیاں کہ دار و رسن یا درِ حبیب
ممتاز اپنی زیست کا عنواں کوئی تو ہو

○

یہ رنگِ وفا، لطف کے انداز تو دیکھو
انجام ابھی دور ہے آغاز تو دیکھو
پھر جاگ اٹھی مردہ و خوابیدہ تمنا
اک رشکِ مسیحا کا یہ اعجاز تو دیکھو

پھر دیدۂ و دل میں ہے وہی کیف کا عالم
جذب و اثرِ حسنِ فسوں ساز تو دیکھو

اک جذبۂ بے نام لیے پھرتا ہے دل کو
اس طائرِ پر بستہ کی پرواز تو دیکھو

ممتازؔ ہر احساس کو بخشتا ہے نیا روپ
یہ معجزۂ عشقِ صنم ساز تو دیکھو

□□

جمیلہ بانو

ہندوستان و پاکستان میں شعر کہنے والی بہت سی خواتین عصری مسائل اور تقاضوں کی شدت سے متاثر ہوکر شاعری کررہی ہیں اور زندگی کے مسائل کو عورت کے مخصوص نقطۂ نگاہ سے دیکھ رہی ہیں لیکن اکثریت اُن شاعرات کی ہے جو تفنّنِ طبع یا صرف مشاعروں کے لیے کلاسیکل انداز کی غزلیں کہتی ہیں اور خوبصورت ترنم سے مشاعرے لوٹ لیتی ہیں۔ خوش گلو، خوش گو جمیلہ بانو بھی شاعرات کی اسی اکثریت سے تعلق رکھتی ہیں لیکن یہ شعر تفنّنِ طبع کے لیے کہتی ہیں اور ان کی شاعری اس تہذیبی اور فنّی روایت کی امین ہے جو ان کے بزرگوں سے اُن تک پہنچی ہے۔

جمیلہ بانو ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ کے ایک ذی علم اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سید شبیر حسن قتیل مرحوم خود شاعر تھے اور ان کا شمار اُس وقت کے ممتاز شاعروں اور صحافیوں میں ہوتا تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ میٹرک کا امتحان علیگڑھ سے پاس کیا اور بی۔ اے کی سند مرحوم دہلی کالج سے ملی۔

جمیلہ بانو پچھلے تیس پینتیس برسوں سے دہلی میں مقیم ہیں اور یہاں کی شعری وادبی دنیا میں پوری طرح رچ بس گئی ہیں۔ "تلاشِ آگہی" ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جسے انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ لٹریچر لندن نے ۲۰۰۲ء میں اردو اور ہندی زبانوں میں شائع کیا ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

میری تنہائی کے صحرا سے نکالو مجھ کو
وقت کی تیز ہواؤں سے بچالو مجھ کو
آئینہ میرے تعاقب میں ہے میں خائف ہوں
تم کسی اور نئی شکل میں ڈھالو مجھ کو
میرا وعدہ کہ پھر اُجڑے گی یہ بستی نہ کبھی
اپنے خوابوں میں خیالوں میں بسالو مجھ کو
اس سے پہلے کہ میں تاحدِ نظر بھی نہ ملوں
کوئی صورت ہو کسی طرح بلالو مجھ کو
تم ہو اک خواب تو اُس خواب کی تعبیر ہوں میں
میں اگر روٹھ بھی جاؤں تو منالو مجھ کو
شمع محفل نہ سہی دودِ چراغِ محفل
اک ذرا انجمنِ دل میں بٹھالو مجھ کو
اے جمیلہ کسی تاریک صنم خانے میں
روشنی کے لیے چاہو تو جلا لو مجھ کو

○

یاد آتا ہے تمھارا ہر اک انداز مجھے
جب سے بچھڑے ہو دیے جاتے ہو آواز مجھے
تلخیاں سارے زمانے کی پلادے مجھ کو
میرے ساقی نہ کر ایسے نظر انداز مجھے
میں نے افلاک کی ہر راہگزر دیکھی ہے
اب کہاں لے کے چلی قوتِ پرواز مجھے

جب بھی ماضی کی کتابوں کے ورق اُلٹے ہیں
داستاں لکھنے کو ملتے گئے الفاظ مجھے
اے جمیلہ نہ کھلا رازِ حقیقت نہ سہی
ذرّے ذرّے کی نظر لگتی ہے غمّاز مجھے

○

گل کھلے ہیں نہ تو گلشن میں بہار آئی ہے
دل کی بستی میں یہ کیسی چمن آرائی ہے
جگمگاتے رہے شب بھر تری یادوں کے چراغ
دیکھیں کس طور سے گزرے جو سحر آئی ہے
نام تیرا کوئی لے کر جو مخاطب کرتا
میں سمجھتی کہ مری خود سے شناسائی ہے
آج ماضی کے دریچوں سے ہٹا کر پردے
ایک بھولی سی کہانی مجھے یاد آئی ہے
راہ رو پوچھ رہے ہیں رہِ منزل مجھ سے
اے جنوں تیری بدولت یہ گھڑی آئی ہے

○

کیا پوچھتے ہو تم ہمیں دنیا نے کیا دیا
کچھ زخم دل کو عمر کو کچھ تجربہ دیا
صدمے رہِ حیات کے سہنا محال تھا
اک تیری جستجو نے ہمیں حوصلہ دیا
ہم قافلے سے چھوٹ کے تنہا نہیں رہے
بڑھ کر ہجومِ شوق نے اک راستہ دیا
ہر سمت چل رہی تھی قیامت کی آندھیاں
ہم نے ہوا کے رُخ پہ سفینہ لگا دیا

ڈوبا ہوا لہو میں ہے کیوں عکسِ زندگی
یہ کس نے آدمی کو درندہ بنادیا
چُپ چاپ دیکھتے ہیں تماشائے آب و گِل
دانائی تو نے چین سے جینا سکھادیا

○

غمِ حیات گوارا کوئی تو بات کرو
ہو زندگی کا سہارا کوئی تو بات کرو
تمام اہلِ خرد چُپ ہیں آج محفل میں
ملے جنوں کو اشارا کوئی تو بات کرو
حضورِ دوست لبوں پر ہزار پہرے تھے
مِرا وجود پُکارا کوئی تو بات کرو
بہت گھٹن ہے کہیں دم نہ گھٹ کے رہ جائے
کوئی تو بولو خدا را کوئی تو بات کرو!

○

اب کس سے شکایت ہو زمانے میں جفا کی
بتلاؤ کہ دنیا نے کسی سے بھی وفا کی
کچھ بات ہی ایسی ہے کہ اب چپ سی لگی ہے
پہلے تو کئی بار ترے در پہ صدا کی
جب تیری رضا چاہیے ہر ردِ عمل کو!
پھر کون کرے بات سزا اور جزا کی
گلشن میں ہر اک گُل کے ہے چہرے پہ اُداسی
سازش نظر آتی ہے مجھے اس میں صبا کی
خوش ہوں میں جمیلہ کہ محبت میں ملے زخم
حاجت نہیں اب کوئی دوا اور دُعا کی

ذکیہ سلطانہ نیّر

شعر کہنے اور باقاعدہ شاعری کرنے والی خواتین میں ذکیہ سلطانہ نیّر کا نام ایک معتبر و مستند نام ہے۔ ذکیہ سلطانہ نیّر صاحبہ ۱۱/اپریل ۱۹۲۴ء کو مراد آباد کے ذی علم اور صاحبِ حیثیت خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد مولوی عبدالہدیٰ خاں صاحب مراد آباد کے نہ صرف ایک کامیاب ایڈوکیٹ تھے بلکہ شاعر بھی تھے لیکن وہ تفنّنِ طبع کے لیے شاعری کرتے تھے اور مشاعروں کی دنیا سے دور رہتے تھے۔ ذکیہ نے اپنے شاعر باپ کے اثرات قبول کیے اور اوائلِ عمری سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں اپنے تایا خان بہادر ڈاکٹر حمید الظفر خاں صاحب رُسوا سے اصلاح لی لیکن جناب ساغر نظامی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد رسوا صاحب سے صلاح و مشورے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

شادی سے پہلے ذکیہ کی شاعری اس زمانے کے رسائل تک محدود تھی، لیکن ساغر صاحب سے شادی کے بعد وہ ساغر صاحب کے ساتھ باقاعدہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگیں۔ اس زمانے میں خواتین کی شاعری کے بارے میں شکوک عام تھے اور ان کا اسٹیج پر آ کر کلام سنانا مشاعروں کی دیرینہ روایت کے خلاف تھا۔ ذکیہ نے مشاعروں میں شرکت کر کے نہ صرف ان شکوک و شبہات کو دور کیا بلکہ مشاعروں میں شاعرات کی شرکت کی راہیں ہموار کیں۔ انھوں نے خاندیش، بمبئی اور سورت کے مشاعروں سے مشاعروں

کے سفر کا آغاز کیا۔ ان دنوں ساغر صاحب بمبئی میں مقیم تھے اور فلمی دنیا سے الگ ہو کر ماہنامہ 'ایشیا' نکالتے تھے اور اپنے طباعتی ادارے 'ہند پبلشر' کی جڑوں کو مستحکم کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ذکیہ نے ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۴ء تک نہ صرف ماہنامہ ایشیا کی ادارت کی بلکہ طباعتی ادارے کے انتظام وانصرام کی تمام تر ذمہ داریاں بھی انجام دیں۔

ذکیہ سلطانہ نیّر ۱۹۵۴ء سے دہلی میں مقیم ہیں۔ ساغر صاحب کے انتقال کے بعد اب مشاعروں میں جانا ترک کر دیا ہے، لیکن ان کی سماجی اور ادبی خدمات جاری ہیں۔ سرکار کی طرف سے چلائے جانے والے کئی سماجی اداروں کی ممبر ہیں۔ دوبار اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ باڈی کی ممبر رہ چکی ہیں۔ ذکیہ صاحبہ نے اپنے شعری مجموعے کی طباعت و اشاعت پر آج تک کوئی توجہ نہیں کی لیکن ساغر صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے ماہ وسال کی یادوں کو سمیٹ کر ۲۰۰۰ء میں ''بیتے لمحے: یادوں کے چراغ'' روشن کیے ہیں جو خوبصورت اور رواں دواں نثر کا خوبصورت نمونہ ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

عندلیبِ خستہ جاں کو نغمہ زن سمجھے تھے ہم
اک خموشی تھی جسے سازِ چمن سمجھے تھے ہم

ہم نوائی ایک موسم بھی نہ اس سے ہو سکی
عندلیبِ نغمہ خواں کو ہم سخن سمجھے تھے ہم

اب کھلا ہم پر کہ تھی دیوانگی بھی مرحلہ
مستقل ہنگامۂ دار و رسن سمجھے تھے ہم

خیر سے ہم کو بھی پھولوں کا مسلنا آ گیا
جانے کیا شئے تھی جسے حبِ چمن سمجھے تھے ہم

پھول بھی کانٹے ہیں یاں کانٹوں کا رونا ہی نہیں
کس بیابانِ جراحت کو چمن سمجھے تھے ہم

ہمتِ تازہ عطا کی اس نے سب کچھ لوٹ کر
راہبر نکلا وہ جس کو راہزن سمجھے تھے ہم
یہ اندھیرے صبح کے یہ روئے فردا کا دھواں
زندگی کو ایک نکہت اک کرن سمجھے تھے ہم
واں پہنچ کر اپنی حیثیت کا اندازہ ہوا
انجمن کو تری اپنی انجمن سمجھے تھے ہم
دل فقط ویرانۂ ماضی ہے اے نیّرؔ جسے
نادمیدہ آرزوؤں کا چمن سمجھے تھے ہم

○

ہر چند ایک رمز ہے پردا سرائے گل
سنتے ہیں پھر بھی اہلِ جنوں ہر صدائے گل
اس راہ میں صبا تو فقط گردِ راہ ہے
بادِ خزاں بہار میں ہے رہ نمائے گل
کچھ ہیں اگر تو اہلِ جنوں راز دار ہیں
ورنہ ہے کون باغ میں رمز آشنائے گل
دامان و جیب ہی نہیں مرہونِ رنگ و بو
کھلتے نہیں ہیں زخمِ جگر بے ہوائے گل
فصلِ خزاں نوید ہے فصلِ بہار کی
خود خونِ گل ہے اہلِ چمن خوں بہائے گل
گو شاخِ گل پہ گل نے تبسّم نہیں کیا
لیکن کلی کلی کے لبوں پر ہے ہائے گل
نیّرؔ ہو عندلیب ہو یا نکہت و نسیم
ہر ایک کی زباں پہ چمن میں ہے ہائے گل

○

بن جائے جہنم اسے دنیا نہیں کہتے
مر مر کے ہو جینا اسے جینا نہیں کہتے
جو لاکھ شراروں سے تپیدہ نہو دل میں
اس سوزِ خیالی کو تمنا نہیں کہتے
یہ کار گہہِ شوق طلب کرتی ہے وحشی
جو کام نہ آئے اُسے سودا نہیں کہتے
چنگاری ہی چنگاری ہو جس میں وہ ہے نغمہ
ہو سوز سے محروم اسے نغمہ نہیں کہتے
جو شعلوں سے محروم شراروں سے تہی ہو
عشاق اسے قلبِ تپیدہ نہیں کہتے
جو اک نئے خورشید کی کرنیں نہ بکھیرے
ہم نور کے شیدا اسے فردا نہیں کہتے
نیرؔ یہ سویرا ہے فقط نور کا دھوکا
ہم دُھند کے طوفاں کو سویرا نہیں کہتے

○

صدائے بلبل آشفتہ کار آئی ہے
گلوں کو خونِ جگر سے نکھار آئی ہے
ہر ایک پھول کی آشفتگی یہ کہتی ہے
کہ تیری بزم سے اُٹھ کر بہار آئی ہے
ہمیں یہ تہمتِ دیوانگی ہے کیوں آخر
بہار خود بھی تو دیوانہ وار آئی ہے
یہاں سے اٹھ کے کہاں جائیں تیرے دیوانے
تری گلی کی ہوا ساز گار آئی ہے

حیاتِ نو کی ہمیں سازگاریاں معلوم
یہ زندگی بھی بہت سازگار آئی ہے
الٰہی یہ نہ ہو نورِ سحر سے آلودہ
بہت دنوں میں شبِ انتظار آئی ہے
ضمیرِ عشق کا سر جھک گیا ہے اے نیّر
جو یاد وہ نگہ شرمسار آئی ہے

ایک باغ یہاں ایسا بھی ہے
(جلیاں والا باغ)

جس باغ کے ذرّے ذرّے میں
خنداں ہے جواں خوں پھولوں کا
جس باغ کی پیاری دھرتی کو
کلیوں نے لہو سے سینچا تھا
صیاد نے جس کے سبزے پر
دریا اک خوں کا بہایا تھا
وہ دریا آج بھی جاری ہے
بہتا ہی رہے گا وہ دریا
وہ دریا خشک نہیں ہوگا

ہر موج ہے اس کی اک ساحل
ہر موڑ ہے اس کا اک منزل
ہر ذرہ اس کا اک دنیا
ہر قطرہ اس کا اک دریا
ہر حلقۂ گرداب اک کشتی

ہر طوفاں اس کا راہ نما
ہر فصلِ خزاں اک موسمِ گل
اور بادِ صبا جس کی بلبل
اک باغ یہاں ایسا بھی ہے

صیاد نے جس کے سبزے پر
دریا اک خوں کا بہایا تھا
وہ دریا آج بھی جاری ہے
بہتا ہی رہے گا وہ دریا
وہ دریا خشک نہیں ہوگا

عہد

اے وطن کیوں ہے تیرے چاند سے ماتھے پہ شکن
ہم نے توڑے ہیں نہ توڑیں گے وفا کے بندھن
پھر تری خاک سے ہم عہدِ وفا کرتے ہیں
پھر محبت کو تری راہ نما کرتے ہیں

تجھ پہ مر مٹنے کی پھر آج دعا کرتے ہیں
پھر تری خاک سے ہم عہدِ وفا کرتے ہیں

پھر تری خاک کو ہم رنگِ حنا کردیں گے
اپنا سب کچھ تری عزت پہ فدا کردیں گے

جو تری راہ میں مرتے ہیں جیا کرتے ہیں
پھر تری خاک سے ہم عہدِ وفا کرتے ہیں

برق ہے ابر ہے اور شعلہ فشاں بادِ سموم
ہے فصیلوں پہ تری لاکھ بلاؤں کا ہجوم

ایسے طوفاں میں کوئی نیند لیا کرتے ہیں
پھر تری خاک سے ہم عہدِ وفا کرتے ہیں

کسی گستاخ کو گلشن میں نہ آنے دیں گے
پیرہن لالۂ و گل کا نہ جلانے دیں گے
ہم وہ ہیں برق کو جو موجِ صبا کرتے ہیں
پھر تری خاک سے ہم عہدِ وفا کرتے ہیں

ترے گاتے ہوئے دریاؤں کے دھاروں کی قسم
ترے سورج ترے چندا ترے تاروں کی قسم
دل کے داغوں کے کہیں دیپ بجھا کرتے ہیں
پھر تری خاک سے ہم عہدِ وفا کرتے ہیں

ماہ و انجم سے بلندی میں بڑھا دیں گے تجھے
ہیں تو ناچیز مگر عرش بنا دیں گے تجھے
ہم پرستار چٹانوں کو خدا کرتے ہیں
پھر تری خاک سے ہم عہدِ وفا کرتے ہیں

جن کا مقصود تری آن پہ مٹ جانا ہے
اور پھر مٹ کے حیاتِ ابدی پانا ہے
وہ کہیں موت سے مرعوب ہوا کرتے ہیں
پھر تری خاک سے ہم عہدِ وفا کرتے ہیں

جان دے دیں گے ترے امن پہ آزادی پر
تری خوشحالی و تعمیر پہ آبادی پر
نئی دنیا جو بناتے ہیں مٹا کرتے ہیں
پھر تری خاک سے ہم عہدِ وفا کرتے ہیں

زندگی کا تجھے فردوس بنا دیں تو سہی
اپنے سجدوں سے تجھے اور سجا دیں تو سہی
کعبۂ امن رہے تو یہ دعا کرتے ہیں
پھر تری خاک سے ہم عہدِ وفا کرتے ہیں

□□

سطوت زہرا

سطوت زہرا ۱۳راگست ۱۹۴۸ء کولکھنؤ کے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئیں جو نہ صرف شاعری سے بہرہ ور تھا بلکہ علم و ادب کا گہرا ذوق رکھتا تھا۔ ان کے والد سید اعظم حسین صاحب اعظم مرحوم خود اچھے شاعر تھے۔ سطوت نے گھر کے شعری و ادبی ماحول کا اثر قبول کیا اور اوائلِ عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ شاعری کی ابتداء میں اپنے چچا جناب شمیم کرہانی سے غزلوں پر اصلاح لی۔

سطوت زہرا شاعری کے ساتھ افسانہ نگاری بھی کرتی ہیں اور اب تک افسانوں کے دو مجموعے ''پجاری'' (۱۹۹۰ء)، اور ''سوکھا گلاب'' (۱۹۹۸ء) شائع ہو چکے ہیں۔ سطوت بنیادی طور پر ایک خاموش طبع اور سنجیدہ خاتون ہیں اس لیے مشاعروں کی دنیا سے دور اور نام و نمود سے بے نیاز رہتی ہیں۔

تعلیم و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اور آج کل حکومتِ دہلی کے سرکاری اسکول میں ہیڈ مسٹریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

ہمارے ہاتھ میں پتّھر تھما دیا کس نے
ہمیں بھی بھیڑ کا حصّہ بنا دیا کس نے

ابھی تو دامنِ تخلیق میں سجایا تھا
وہ شعر تازہ تھا اس کو مٹا دیا کس نے

خلافِ ظلم کبھی تو اٹھے کوئی آواز
تمام شہر کو گونگا بنا دیا کس نے

ضرور تلخیٔ حالات کا شکار ہے وہ
وہ شخص موم تھا پتھر بنا دیا کس نے

ہمارا کون سا مصرعہ برا لگا کس کو
تخیلات کا دیواں جلا دیا کس نے

بھنور سے بچ گئے ساحل بھی سامنے تھا مگر
سفینہ اُبھرا تو پھر سے ڈبو دیا کس نے

تیرا مزاج تو بچپن سے شوخ تھا سطوتؔ
یہ یک بہ یک تجھے سادہ بنا دیا کس نے

○

فلک سے توڑ کے لاؤ گے ماہ و انجم کو
کبھی تمھیں نے کہا تھا جو یاد ہو تم کو

خوشی سے ڈوبیں گے جب تم ہی ناخدا ٹھہرے
خبر کرو تو ذرا موج اور تلاطم کو

یہ کیسی بزم ہے ویران میکدہ کیوں ہے
نگاہیں ڈھونڈتی رہتی ہیں بادہ و خُم کو

جہیز نام کی فکروں سے ڈر گئیں خوشیاں
دُلہن ترستی ہے بے فکر سے تبسّم کو
مکاں ہے شیشے کا ہر وقت سہمی رہتی ہوں
میں روک بھی نہیں سکتی ہوائے برہم کو
سبھی تو اپنے تھے پر گھر جلادیا کس نے
جھلستے شعلوں نے ہم کو جلا دیا تم کو

وہ بزمِ غیر میں اندازِ بے رُخی سطوت
کبھی بھلا نہ سکی میں تیرے تکلّم کو

○

کہیں دور تک نہیں برگ وگل یہ خزاں کا وار تو دیکھیے
یہاں درد ہے وہاں ٹیس ہے یہ میری بہار تو دیکھیے
تو اُداس ہو تو میں غمزدہ تو جو مسکرائے میں ہنس پڑوں
میرے دل پہ اپنے وجود کا ذرا اختیار تو دیکھیے
یہاں خار تک کا نہ ذکر ہو وہاں گلشنوں کی حکایتیں
ذرا آپ اپنی عنایتوں کا اصولِ کار تو دیکھیے
کبھی ڈوبئے تو پتہ چلے ذرا موج موج کی بے کلی
کبھی غور سے میری حالتِ دلِ تار تار تو دیکھیے
میری الفتوں میں رچا بسا وہ ضرور لوٹ کے آئے گا
میرے اختیار میں کچھ نہیں مگر اعتبار تو دیکھیے
ہوئے مہرباں تو ہیں قدر داں نہیں مہرباں تو ستم روا
کبھی پھول ہیں کبھی خار ہیں یہ مزاجِ یار تو دیکھیے
میں جہاں کی سطوت وقت ہوں مرا دل وفاؤں کا تاج ہے
میرے جذبۂ خلوص کو ذرا ایک بار تو دیکھیے

○

ہر دل میں بغض ذہن میں شر دیکھتے رہے
کس درجہ گر چکا ہے بشر دیکھتے رہے
منزل کبھی قریب کبھی دور ہوگئی
ہم تو فقط طلسمِ سفر دیکھتے رہے
مظلومیت کے سامنے ظالم تھے سرنگوں
نیزوں پہ جو بلند تھے سر دیکھتے رہے
کس طرح آفتاب پہ ڈالیں نقاب ہم
ٹوٹے ہوئے مکاں کی گگر دیکھتے رہے
محفل میں ہم کو چھوڑ کے فنکار تھے سبھی
ہم خود ستائشی کے ہُنر دیکھتے رہے
پھر کاروانِ شوق گزرتا چلا گیا
پھر ہم غبارِ راہ سفر دیکھتے رہے
سطوتؔ خوشی کی ایک کلی بھی نہ کھل سکی
بس خواہشوں کے زرد شجر دیکھتے رہے

○

تیری جدائی میری زندگی کو راس بھی ہے
بچھڑ کے پھر کبھی ملنے کی مجھ کو آس بھی ہے
یہ گرم آنسو، یہ آہیں، یہ درد اور یہ کسک
کسی کی دی ہوئی سوغات میرے پاس بھی ہے
یہ کیسے رِند ہیں، ساقی ہیں، کیسا میخانہ
کہ مل رہے ہیں جنھیں جام ان کو پیاس بھی ہے
کبھی وہ اپنے ہوئے اور کبھی پرائے ہوئے
ہماری زیست میں تلخی بھی ہے مٹھاس بھی ہے

میں باغباں ہوں ہر ایک گل میں تو ہے پوشیدہ
ہر ایک کلی میں تیرے پیرہن کی باس بھی ہے
جنونِ عشق کی بربادیاں کہوں کس سے
کہوں تو کیا کہوں اہلِ خرد کا پاس بھی ہے
ملی جو داد غزل کی تو یوں لگا سطوت
کہ اب ہمارا زمانہ نظر شناس بھی ہے

○

جو تم نے زخم دیے بن گئی میں سودائی
مریضِ عشق ہوں کرتے ہو کیوں مسیحائی
میں حسن و عشق کی منزل میں پا برہنہ ہوں
مجھے نہ پاسِ خرد ہے نہ خوفِ رسوائی
مکاں کو پھونک کے سب قہقہے لگاتے تھے
عجب جنون تھا سب ہو گئے تھے سودائی
ہزار خواہشیں اور خواہشات کی تکمیل
میری حیات نے لی نا تمام انگڑائی
کبھی میں شہر میں اہلِ خرد کا مرکز تھی
بنی ہوں آج اُسی بھیڑ میں تماشائی
بس ایک بار تیرا جلوہ خواب میں دیکھا
ابھی گئی نہیں نظروں کی میرے رعنائی
بھری بہار میں گر ٹوٹ جائے دل سطوت
تو کیسی بزم ہے اور کیسی بزم آرائی

□□

شاہدہ نکہت باقی

خواتین کا شعر کہنا اور باقاعدہ شاعری کرنا اردو شعروادب کی ایک قدیم روایت ہے لیکن گزشتہ صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے تک یہ شاعری عام طور پر گھر آنگن تک ہی محدود رہتی تھی اور مذہبی، اخلاقی، سماجی پابندیوں، شعری ادبی قدروں اور مشاعروں کی روایتوں کی وجہ سے خواتین کا مشاعرے میں غزل سرا ہونے کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شعر و ادب کی کئی سو سال پرانی تاریخ میں مشاعروں کے حوالے سے شاعرات کا تذکرہ دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اردو مشاعروں کی یہ قدیم روایت آزادیِ وطن کے بعد ٹوٹی جب روایت پرست اور قدامت پسند معاشرے کے تار و پود بکھر گئے، تہذیبی قدریں اُتھل پتھل ہوگئیں؛ سماجی، اخلاقی اور مذہبی پابندیوں کے تار چرمرا گئے۔ اس وقت مشاعروں میں شاعرات کی غزل سرائی کی طرح پڑی۔

شاہدہ بیگم نکہت دہلی کی پہلی خاتون تھیں جو انیس سو پچاس، پچپن کے عرصہ میں یہاں کے مشاعروں میں شاعری کے حوالے سے متعارف ہوئیں۔ وہ ریاست رامپور کی رہنے والی تھیں۔ ان کی شخصیت نہایت پرکشش اور آواز بہت خوبصورت تھی۔ جب غزل سرا ہوتیں تو پورا پنڈال ہمہ تن گوش ہوجاتا اور ہر چہار طرف شعلے سے لپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ شاہدہ بیگم نکہت دس پندرہ سال تک دہلی اور اس کے قرب و جوار کے

مشاعروں پر تنِ تنہا چھائی رہیں، اپنے وقت کے مشہور صحافی مولانا عبدالباقی ایم۔ اے سے شادی کر کے شاہدہ نکہت باقی ہو گئیں۔ گھریلو ذمہ داریوں نے اُن کی شاعری کو متاثر کیا اور وہ دھیرے دھیرے گوشہ نشین ہو گئیں۔

۱۹۹۸ء میں انھوں نے دہلی میں داعیِ اجل کو لبّیک کہا۔

نمونۂ کلام:

غزل

اگر اس میکدے میں مبتلائے غم بھی پیتے ہیں
تو ساقی یہ رہے ملحوظ آنسو ہم بھی پیتے ہیں

ہماری موج ہے عادت نہیں ہے روز پینے کی
کبھی برسوں نہیں پیتے کبھی پیہم بھی پیتے ہیں

خدا مالک ہے اب جیسی بھی گزرے پیرِ میخانہ
کسی کا نام لے کر تو بھی پی اور ہم بھی پیتے ہیں

نظر ساقی کی جانب چشمِ تر ٹوٹا سا پیمانہ
بایں صورت، بایں حالت، بایں عالم بھی پیتے ہیں

برائے ترکِ غم تو پینے والے ہیں بہت لیکن
تمھارے دور میں دوا ک برائے غم بھی پیتے ہیں

پیے لیتی ہوں نکہتؔ جیسی ہو ساقی کے کہنے سے
وہ کہتا ہے کہ پی بھی لے، مریضِ غم بھی پیتے ہیں

○

دستور ہے جس کا پاسِ وفا، ہے شرم جسے خودداری کی
وہ چشمِ عنایت کا منکر شرمندۂ احساں کیا ہوگا

مانوسِ حوادث ہیں واقف دریائے الم کی شورش سے
آسودۂ ساحل جو ہیں انھیں اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

جب قصۂ حاضر کو دنیا ترتیب کی زینت بخشے گی
اس زرد اثر افسانے کا، جُز درد کے عنواں کیا ہوگا

تدبیر چمن بندی ہی جہاں ، افسردہ تخیل ہے نکہت
تزئینِ گلستاں کب ہوگی، شادابِ گلستاں کیا ہوگا

□□

شبانہ نذیر

ڈاکٹر شبانہ نذیر اردو کے مشہور شاعر و ادیب جناب رفعت سروش کی صاحبزادی ہیں۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۵۴ء کو پیدا ہوئیں۔ گھر کے خالص شعری و ادبی ماحول نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو تحریک دی۔ رفعت سروش صاحب ایک اچھے نثر نگار اور کامیاب ریڈیو ڈرامہ نگار ہیں لیکن شبانہ نے ان کی شعری روایت کو اپنایا اور طالب علمی کے زمانے سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ شعری صلاح و مشورے کے لیے باپ جیسے شاعر سے بہتر استاد اور کون ملتا چنانچہ شبانہ نے رفعت سروش صاحب کا تلمذ اختیار کیا۔

شبانہ نذیر درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اور حکومتِ دہلی کے ایک اسکول میں پرنسپل ہیں اس لیے مشاعروں اور دوسری ادبی سرگرمیوں سے دور رہتی ہیں۔ صرف مخصوص شعری نشستوں میں شرکت کرتی ہیں۔ ''اردو میں اوپیرا: ۱۹۴۷ء کے بعد'' ان کے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا جس پر شبانہ نذیر کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ اس کے علاوہ ''نذرِ رفعت سروش'' نامی کتاب انھوں نے مرتب کی۔ شبانہ نذیر کا پہلا شعری مجموعہ ''میرے خیال میں'' زیرِ طباعت ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

وہم کی پرچھائیوں سے دل کو بہلاتے نہیں
اہلِ دانش اس فریبِ شوق میں آتے نہیں
مضطرب رکھتی ہے ہر لمحہ سفر کی آرزو
ہم وہ راہی ہیں جو منزل پر سکوں پاتے نہیں
آب گینوں کی طرح ان کی حفاظت فرض ہے
ٹوٹ جاتے ہیں جو رشتے پھر نمو پاتے نہیں
چھوڑ کر اک تیرے در کو در بہ در جائیں تو کیوں
ہر کسی کے سامنے ہم ہاتھ پھیلاتے نہیں
حوصلہ دیکھا ہمارا زندگی کے شیشہ گر
گر نہ ہوتا عزم تو پتھر سے ٹکراتے نہیں
گردشِ دوراں نہ لے ہم بیکسوں کا امتحاں
اہلِ دل آلام کی یورش سے گھبراتے نہیں
اے شبانہ خار زارِ زندگی ہے اور ہم
چل پڑے جب، پاؤں کے چھالوں سے گھبراتے نہیں

○

فقط لفظوں سے کیوں، پھولوں ستاروں سے غزل لکھیں
جو ہنستے ہیں سدا اُن آبشاروں سے غزل لکھیں
لبِ دریا اِدھر ہیں پھول اور اس سمت ہیں کانٹے
ملا کر خار و گل دونوں کناروں سے غزل لکھیں
ہر اک احساس کو الفاظ مل جائیں یہ ناممکن
زباں جو بن نہ پائے ان اشاروں سے غزل لکھیں

خوشی نے پھول برسائی بہاریں آگئیں لیکن
ابھی مغموم ہیں جو ان نظاروں سے غزل لکھیں
لہو میں ڈوب کر ابھرے نئی تہذیب کے منظر
گلوں کو چھوڑ کر ہم شعلہ زاروں سے غزل لکھیں
جدا ہوتے ہوئے سورج کے غم سے آشنا ہوکر
شفق کے ڈوبتے رنگیں نظاروں سے غزل لکھیں
شبانہ اپنی کشتی ہے ابھی طوفاں کی بانہوں میں
جہاں کشتی رُکے گی ان کناروں سے غزل لکھیں

○

در کھول کے زنداں کے ہر قید اٹھادی ہے
لیکن میرے ہونٹوں پہ اک مہر لگادی ہے
اے اہلِ چمن پوچھو کیا سوچ کے مالی نے
کانٹوں کو دُلارا ہے پھولوں کو سزا دی ہے
صحراؤں سے ہم گزرے کانٹوں کو لہو دے کر
ہر موڑ پہ منزل کے اک شمع جلادی ہے
پھر شاخِ نشیمن سے اٹھے گا دھواں برسوں
گل چیں نے گلستاں میں پھر آگ لگادی ہے
اے اہلِ غرض تم نے تعمیر تو کی لیکن
ہر دل میں تعصب کی دیوار اٹھادی ہے
تعبیر ملے شاید اب کل کے مورخ کو
ہم نے نئے خوابوں کی تصویر سجادی ہے
احسان شبانہ ہے یہ اہلِ گلستاں کا
ہم جیسے دیوانوں کو کانٹوں کی قبا دی ہے

○

دشمنی کیجیے دوستی کی طرح
دوستی کیجیے بندگی کی طرح
کتنی ہر کیف سرمست یادوں کا رنگ
گھل گیا رات میں چاندنی کی طرح
خود ہی یزداں صفت خود ہی شیطاں نفس
ہے عجوبہ کوئی آدمی کی طرح
کیا خبر تھی کہ ایسے بچھڑ جائیں گے
ہم ملیں گے کبھی اجنبی کی طرح
اے شبانہ کہاں لے چلی ہے خرد
آگہی آئی ہے گمرہی کی طرح

کیوں؟

لفظ لبوں پر پھول کی صورت کیوں کھلتے ہیں؟
حرف قلم کی نوکِ زباں تک کیوں آتے ہیں؟
ذہن میں بیٹھے بیٹھے اچانک
کوئی خیال چمک جاتا ہے
بھولے بسرے لوگ کبھی خوابوں میں آ کر
کیوں ماضی کو دہراتے ہیں؟
کیوں اپنے بچپن سے کٹ کر
بھول کے اپنی نادانی کو
جی نہیں سکتے آزادی سے
کیوں؟ آخر کیوں؟

کیوں ایسا ہوتا ہے آخر!
شاید انساں پہلے دن پہلے لمحے سے
آخری دن اور آخری دم تک
ہوش و حواس کے زندانوں میں
جیتا ہے اک مجبوری سے
کیا اک دن ایسا آئے گا
ہم جب چاہیں مر جائیں
اور مر کر پھر زندہ ہو جائیں

کاش ایسا نہ ہو

میرے آنگن میں دو پھول ہیں
مسکراتے ہوئے گنگناتے ہوئے
ان کی خوشبو سے مہکا ہے میرا چمن
ان کے نغموں سے آباد ہے پیار کی انجمن
یہ مہکتے ہوئے پھول ہیں زندگی کے امیں
ان کو یہ ہے یقیں
ہر نئی صبح ہوگی زیادہ حسیں
ان کے ہونٹوں پہ لکھے ہیں نغمے نئے دور کے
ان کی آنکھوں میں ہیں خواب دنیا کی تعمیر کے
اور میں
اور میں زہر آلود ماحول کو دیکھ کر
دل ہی دل میں ہی مغموم و رنجور ہوں
ان پہ سایہ نہ پڑ جائے نفرت کی تہذیب کا

ان کے خوابوں کو ڈس لے نہ آ کر کوئی ناگ تخریب کا

سوچتی ہوں

سوچتی ہوں اگر جنگ کی آندھیاں

ساتھ لے آئیں تخریب کی بجلیاں

پھر اُجڑ جائیں گے پیار کے گلستاں

پھول بے رنگ ہو کر بکھر جائیں گے

نفرتوں نے اڑائیں جو چنگاریاں

پھول نازک بہت ہیں جھلس جائیں گے

کاش ایسا نہ ہو

کاش ایسا نہ ہو

میں محبت کی تازہ ہواؤں کی مشتاق ہوں

اپنے آنگن کے پھولوں کی نازک ہنسی کے لیے

ساری دنیا کے پھولوں کی نازک ہنسی کے لیے

امن کے واسطے،

زندگی کے لیے

زندگی کے لیے

□□

عفّت زرّیں

ڈاکٹر عفت زرّیں معتبر غزل گو شاعر جناب مشیر جھنجھانوی مرحوم کی صاحبزادی ہیں۔ نسیم مخموری کی طرح غزل کی روایت ان کو بھی میراث میں ملی ہے، جسے وہ خوبصورتی اور بڑے سلیقے سے نباہ رہی ہیں۔ عفت زرّیں ۱۰/اکتوبر ۱۹۵۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔

دہلی کی سرزمین سے ابھرنے والی چند شاعرات میں سے غیر معمولی تعلیم یافتہ اور خلاق ذہن کی مالک ہیں۔ ایم۔اے کرکے ''فورٹ ولیم کالج کی نثری داستانیں'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ عفت زرّیں کا یہ تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ عفت زرّیں گرچہ بنیادی طور پر شاعرہ ہیں لیکن تحقیقی کاموں کا خاص شعور رکھتی ہیں۔ ''لکھنؤ کا دبستانِ نثر'' اور ''بیسویں صدی میں اردو غزل: نوکلاسیکل شعراء'' ان کی تحقیقی تصانیف ہیں جو ادبی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے حضرتِ مشیر جھنجھانوی کا شعری مجموعہ 'انفاسِ غزل' بھی مرتب کیا ہے۔

عفت زرّیں طالب علمی کے زمانے سے شعر کہہ رہی ہیں۔ شاعری میں مشیر صاحب ان کے استاد تھے۔ مشاعروں میں پسند کیا جانے والا خوبصورت ترنم ہے لیکن اس کے باوجود مشاعروں سے دور رہتی ہیں اور مخصوص شعری نشستوں میں ہی شرکت کرتی ہیں۔

’’بے ساحل دریا‘‘عفت زرّیں کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آ کر مقبول ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام:

غزل

پھول رشتوں کے محبت کے چمن چھوڑ گئے
کتنے مجبور تھے جو اپنا وطن چھوڑ گئے

اب تبسم کے لیے ہم کو ترسنا ہوگا
حادثے وقت کے ماتھے پہ شکن چھوڑ گئے

آنے والوں کے لیے رات قیامت ہوگی
کارواں شا کے دامن میں تھکن چھوڑ گئے

میرے ورثے میں نہ دولت ہے نہ جاگیر کوئی
میرے اجداد زمانے میں چلن چھوڑ گئے

میری حسّاس طبیعت کا اثر ہے زرّیں
پھول کانٹے تو نہ تھے پھر بھی چبھن چھوڑ گئے

○

کارواں سُنت مسافر کو سزا دیتا ہے
زرد پتے کو ہر اک پیڑ گرا دیتا ہے

اپنی آنکھوں کو وہ بے وجہ سزا دیتا ہے
گیلے ایندھن کو اگر کوئی ہوا دیتا ہے

اب میرے بس میں کہاں ہے کہ میں واپس آؤں
میرا ماضی مجھے بیکار صدا دیتا ہے

کس لیے تونے بجھا ڈالے سلگتے سپنے
کس لیے اب انھیں رہ رہ کے ہوا دیتا ہے

زندگی ہم نے بنائی ہے عمل سے لیکن
ہم بھی کہتے ہیں یہ ہی سب کو خدا دیتا ہے
ایک بہتا ہوا تنکا بھی اہم ہے زرّیںؔ
اپنی رفتار سے دریا کا پتا دیتا ہے

○

بارشِ اشک بظاہر تو سہانی ہوگی
ہاں مگر عمر سمندر میں گنوانی ہوگی
مشعلیں ساتھ رکھو رات بھیانک ہے بہت
آگ جنگل میں بہر گام جلانی ہوگی
میں مصور ہوں میرے فن کا تقاضا ہے یہی
مجھ کو دشمن کی بھی تصویر بنانی ہوگی
یوں تو پتھر کی بھی قسمت ہے حسین تاج محل
اپنی تقدیر مگر آپ بنانی ہوگی
آج تو زخم کے پھولوں کی مہک ہے تازہ
کل تم آئے بھی تو ہر بات پرانی ہوگی
مجھ کو احساس کے پیکر میں نہ ڈھونڈو لوگو!
میری آواز تمھیں ڈھونڈ کے لانی ہوگی
ہم نے ہر عہد سے سمجھوتہ کیا ہے زرّیںؔ
کچھ بھی ہو اب تو ہر اک بات نبھانی ہوگی

○

ہم جو اوڑھے ہوئے احساس کی چادر نکلے
جن کو انسان سمجھتے تھے وہ پتھر نکلے
غیر ممکن ہے نہ مل جائے ہمیں ان کا جواب
ایسے الفاظ جو ذہنوں سے باہر نکلے

خشک موسم تھا مگر ڈوب گئے اہلِ زمیں
ہم نے پتھر جو ہٹائے تو سمندر نکلے

بیعتِ دست یزیدی مجھے منظور نہیں
مری اس بات پہ ہر سمت سے خنجر نکلے

بستیاں بھی تو درندوں سے نہیں ہیں محفوظ
گھر سے نکلے بھی کوئی شخص تو کیوں کر نکلے

جبر تہذیب کی تاریخ یہی ہے اب تک
ایک دیوار گرائی تو کئی گھر نکلے

ان کے چہرے بھی نظر آئے دھندلے زرّیں
آئینہ خانوں سے جو لوگ سنور کر نکلے

○

دور تک پھیلے رہے تنہائیوں کے سلسلے
آنسوؤں کی دھند میں پرچھائیوں کے سلسلے

ایک تو ساون کا موسم اس پہ ماضی کی پھوار
زخم تازہ کر گئے پروائیوں کے سلسلے

ڈوبتے جاتے ہیں ساحل گرتے جاتے ہیں مکاں
بڑھ رہے ہیں ہر طرف انگنائیوں کے سلسلے

سطحِ دریا سے نہ گہرائی کا اندازہ ہوا
ڈوب کر ہم کو ملے گہرائیوں کے سلسلے

آج دنیا کہہ رہی ہے جن کو زرّیں دیوتا
ان کے ماضی میں بھی ہیں رسوائیوں کے سلسلے

○

آبلے سوکھ چکے پھر بھی کسک باقی ہے
دل کے ہر زخم میں یادوں کی مہک باقی ہے

چھوڑ دوں کیسے بھلا اپنے بزرگوں کا چلن
میری رگ، رگ میں ابھی ان کا نمک باقی ہے
جن کے سائے میں بہل جاتا تھا بچپن اکثر
میرے احساس میں اب تک وہ دھنک باقی ہے
تم کو آنا ہے تو آجاؤ بصد شوق یہاں
اب بھی حالات میں ہلکی سی لچک باقی ہے
بند ہوتی نہیں پلکیں مری صدیاں گزریں
خواب تو ٹوٹ چکے صرف چمک باقی ہے
دل کی دھڑکن مری آواز انا ہے زرّیں
میرے ہر لفظ میں لہجہ کی کھنک باقی ہے

مسعودہ حیات

گنور ضلع بدایوں کا ایک ایسا چھوٹا سا قصبہ ہے جو آج بھی پچھلی صدی کی دہلیز پر کھڑا ہوا اکیسویں صدی کی روشنی کا منتظر ہے۔ مسعودہ حیات ۱۵ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو اسی قصبے کے ایک متوسط، روایت پسند اور ذی علم گھرانے میں پیدا ہوئیں اور یہیں ہوش سنبھالا۔ شاعری ان کے گھر کے شعری و ادبی ماحول کی دین ہے۔ ان کے بڑے بھائی شاعر تھے، جن کی وجہ سے گھر میں شعر و شاعری کا چلن تھا۔ مسعودہ حیات نے شاعری شروع کی تو جناب ابر احسنی گنوری کا تلمذ اختیار کیا۔

گنور کے روایتی اور گھٹے ہوئے ماحول میں ان کی شاعری گھر کی چار دیواری تک ہی محدود رہی لیکن دہلی میں مستقل رہائش اختیار کرنے اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی شاعری پردوں سے باہر آئی اور شہرت اور مقبولیت کے پر لگا کر اُڑنے لگی۔

مسعودہ حیات اپنے خوبصورت ترنم اور سلیقے سے کہی ہوئی غزلوں کی وجہ سے تین چار دہوں تک مشاعروں کی مقبول شاعرہ رہی ہیں یہی ان کے Genuine شاعرہ ہونے کی ایک دلیل ہے ورنہ گزشتہ صدی کے نصف آخر سے اردو مشاعروں کے اسٹیج پر ''مانگے کا اُجالا لے کر'' بہت سی شاعرات اُبھریں اور ''زادِ راہ'' ختم ہونے پر چند ہی

سالوں میں قصۂ پارینہ بن گئیں۔

''بوئے سمن'' مسعودہ حیات کا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۸۱ء میں جمال پرنٹنگ پریس میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

خوشبو سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
شیشہ کہیں ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
احساسِ محبت سے کسی گوشۂ دل میں
جب چوٹ ابھر آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
پُر کیف ہوا میں جو کسی پیڑ کے نیچے
آنچل مرا لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
چھونے سے کبھی بادِ صبا کے مرے تن میں
اک برق سی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سر رکھ کے جو پتھر پہ کبھی راہِ الم میں
کچھ نیند سی آجائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب شامِ ملاقات پڑوسی کے مکاں سے
آواز کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب شانہ بھی کرنے نہ اٹھے ہاتھ ہمارا
اور زلف سنور جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

○

ہم ظلم و ستم چاہیں ہم جور و جفا مانگیں
اب اس کے سوا تجھ سے مانگیں بھی تو کیا مانگیں

تو خوب جفائیں کر تو خوب سزائیں دے
ہم اپنی وفاؤں کا اتنا ہی صلا مانگیں
دل کانپ اٹھا اپنا سُرخی سے بہاروں کی
ہم برگِ حنا سے اب کیا رنگِ حنا مانگیں
اس بے خودیٔ دل کا پوچھے نہ کوئی عالم
ہم اُس کے ہی کوچے میں اور اس کا پتا مانگیں
کوئی کسی انساں پہ پھر جبر نہ کر پائے
دُنیا میں حیات ایسی ہم آب و ہوا مانگیں

○

ناداں ہیں وہی جن کو عداوت سی لگے ہے
ہم کو تری ہر بات عنایت سی لگے ہے
شکوہ سا لگے ہے نہ شکایت سی لگے ہے
اس لب پہ ہر اک بات محبت سی لگے ہے
کس کس کو تری آڑ میں سب لوٹ رہے ہیں
یہ تو ہمیں بے نام سیاست سی لگے ہے
بہتر ہے ترے سامنے ہم لب ہی نہ کھولیں
ہر بات تجھے آج شکایت سی لگے ہے
کہتے ہیں تمھیں اب نہیں احساس کسی کا
یہ بات ہمیں اک نئی تہمت سی لگے ہے
اک موڑ پہ تو نے جو مرا ساتھ دیا تھا
ہر موڑ پہ اب تیری رفاقت سی لگے ہے
تپتے ہوئے صحرا میں کہاں چین جگر کو
ہاں سایۂ دامن میں تو راحت سی لگے ہے

شاید مرا احساس ہی سب کچھ ہے کہ دنیا
صحرا سی لگے ہے کبھی جنت سی لگے ہے
پھولوں کی مہک ہے نہ شگوفوں کی لطافت
پھیلی ہوئی ہر سو تری نکہت سی لگے ہے
کیا کہیے حیات آج ہے وہ دورِ جنوں خیز
چہرے پہ ہر اک فرد کے وحشت سی لگے ہے

○

خالی شرابِ عشق سے ساغر کبھی نہ تھے
ایسے تو خشک دل کے سمندر کبھی نہ تھے
جو سنگِ احتساب یگانوں کے پاس ہیں
دشمن کے ہاتھ میں بھی وہ پتھر کبھی نہ تھے
کس سمت جا رہے ہیں انھیں خود پتا نہیں
یوں بے خبر تو راہ سے رہبر کبھی نہ تھے
دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا زخمی ہے روح بھی
اتنے تو تیز وقت کے نشتر کبھی نہ تھے
ملتا نہیں کہیں بھی در و بام کا نشاں
ہم گھر میں رہ کے اتنے تو بے گھر کبھی نہ تھے
ہر سمت خاک و خوں ہے ہر اک لحظہ برق و باد
ایسی تباہیوں کے تو منظر کبھی نہ تھے
آمادۂ عتاب انھیں کس نے کر دیا
وہ تو مری نظر میں ستم گر کبھی نہ تھے
دریا کو چھوڑ کر جو بیاباں کا رُخ کریں
ایسے کسی نگر میں شناور کبھی نہ تھے

ہم جیسے مخلصوں کو بھی در سے اُٹھا دیا
اتنے عجیب آپ کے تیور کبھی نہ تھے
کیا جانے کیا ہوئیں وہ حسیں شوخیاں حیاتؔ
ایسے نڈھال پھول سے پیکر کبھی نہ تھے

○

گھر سے جو شخص بھی نکلے وہ سنبھل کر نکلے
جانے کس موڑ پہ کس ہاتھ میں خنجر نکلے
کچھ عجب رنگ میں ہم آج سفر پر نکلے
دور تک دیکھنے اس شہر کے دل بر نکلے
یوں تو خوش رنگ ہیں ہر سمت مری دیواریں
کوئی تو تازہ ہواؤں کے لیے در نکلے
معجزہ بن گئی کیا آج مری تشنہ لبی
ایک قطرے کے تلے کتنے سمندر نکلے
گھر گیا ہو جو فصیلوں کو اُٹھا کر خود ہی
کیسے اب اپنے حصاروں سے وہ باہر نکلے
رہبرو! تم نے تو منزل کا پتا بھی نہ دیا
تم سے بہتر تو مری راہ کے پتھر نکلے
عمر بھر ذہن میں چبھتا رہا اک نشترِ غم
جتنے احساس تھے سب میرا مقدر نکلے
اس سے پہلے تو نہ دیکھے تھے یہ اندازِ دگر
وقت آیا تو عجب آپ کے تیور نکلے
بھر نہ جائیں ترے بخشے ہوئے یہ زخمِ جگر
زخم کاوی کے لیے پھر کوئی نشتر نکلے
تم سے چھوڑی نہ گئی راہِ وفا پھر بھی حیاتؔ
کتنے بے درد ملے، کتنے ستم گر نکلے

○

وہ ہم سے لاکھ محبت میں بدگماں سے رہے
ہم اُن کے ساتھ مگر پھر بھی نقدِ جاں سے رہے
لگی ہیں شعلہ بیانی کی تہمتیں اکثر
ہم اُن کے شہر میں ہر چند بے زباں سے رہے
تمازتِ غمِ دوراں ہمیں جلا نہ سکی
ترے خیال کے ہر سمت سائباں سے رہے
اسی زمین کے ذرّوں میں کھو گئے اب ہم
کہ جس زمیں پہ کبھی بن کے آسماں سے رہے
حیاتؔ کس کو تھا الہام جورِ پنہاں کا
کہ اپنے دل پہ بظاہر وہ مہرباں سے رہے

□□

نسیم مخموری

عجب اتفاق ہے کہ تقسیمِ وطن کے بعد دہلی کے ادبی منظرنامے پر ابھرنے اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے والے کچھ شعراء حضرات کی ادبی روایت اور شعری میراث ان کی اولادِ نرینہ کو پہنچنے کی بجائے ان کی اولادِ اُنثیٰ کو پہنچی جس نے اُس ادبی میراث اور شعری روایت کو اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ بخوبی قائم رکھا اور قائم رکھے ہوئے ہے۔

حضرتِ مخمور دہلوی مرحوم بھی اُن شاعروں میں سے ہیں جن کی ادبی اور شعری روایت اور میراث ان کی صاحبزادی کو پہنچی۔ نسیم مخموری جناب مخمور دہلوی کی صاحبزادی ہیں اور اپنے باپ کی شعری و ادبی روایت کو بڑے سلیقے سے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ نسیم مخموری ۹/اپریل ۱۹۴۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں لیکن ان کے بچپن کا ابتدائی حصہ پٹودی (ہریانہ) میں گزرا جہاں ان کے والد نواب پٹودی کے دربار میں ملازم تھے اور آٹوموبائل انچارج کے عہدے پر فائز تھے۔ پٹودی میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اسکول وغیرہ کا کوئی رواج نہیں تھا۔ لیکن گھر میں ماں باپ کی خصوصی توجہ نے نسیم کو تعلیم سے بے بہرہ نہیں رہنے دیا۔

نسیم مخموری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز نثر سے کیا۔ ابتداء میں بچوں کے لیے کہانیاں

لکھیں، لیکن گھر میں ہمہ وقت غزل کے چرچے اور شاعرانہ ماحول کی وجہ سے یہ نثر نگاری پنپ نہیں سکی اور شاعری کے کلبلاتے ہوئے سوتے شعروں کی شکل میں رسنے لگے۔ مخمور صاحب نے نسیم کی شاعری کو نہ صرف سراہا بلکہ پہلی غزل پر باقاعدہ اصلاح بھی دی۔ پرسوز ترنم اور موثر اظہارِ بیان حضرت مخمور دہلوی کی شاعری کی اہم اور بنیادی خوبیاں تھیں۔ جناب مخمور کی شاعری کی یہ دونوں خوبیاں نسیم کو وراثت میں ملی ہیں۔ سماعت پر خوشگوار اور دیرپا تاثر مرتب کرنے والا عمدہ ترنم اور دلوں کو گدگدا دینے والے اشعار نسیم مخموری کی شاعری کی خوبیاں ہیں۔ یہ خوبیاں مشاعروں میں مقبول ہونے کے لیے کافی ہیں، لیکن نسیم مخموری اپنے مزاج کی سادگی اور معصومیت کی وجہ سے مشاعروں کے ہنگاموں سے دور رہتی ہیں۔

نسیم مخموری کے اب تک دو شعری مجموعے "صدف" اور "مسافتِ ہجراں" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ "مخمور دہلوی: حیات و شاعری" کے عنوان سے نسیم نے مخمور صاحب پر نثر میں ایک کتاب بھی مرتب کی ہے جس میں مخمور صاحب کی شاعری اور شخصیت پر مشہور قلمکاروں کے مضامین شامل ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

میری مٹّی میں تمازت کے خزانے کیا تھے
بجھتی آنکھوں میں کبھی خواب سہانے کیا تھے

اے مرے شہر بتا تونے تو سب دیکھا ہے
میرا بچپن مرے آباء کے زمانے کیا تھے

میں نہیں تھی تو یہ پھر کون تھا ریزہ ریزہ
تیری تعمیر میں آثار پرانے کیا تھے

لے گیا کیوں مری خوشبو کو چرا کر موسم
اک سوا اس کے مرے پاس خزانے کیا تھے

جسم پر ہو کوئی چہرہ تو میں پہچان سکوں
وہ نہ مٹی تھے نہ پتھر تھے نہ جانے کیا تھے
اس نے صندل کی مہک چھوڑ دی ہاتھوں میں مرے
اس کے لکھے ہوئے الفاظ نہ جانے کیا تھے
میں تھی پتھر تو کبھی توڑ کے دیکھا ہوتا
عمر بھر مجھ کو سمجھنے کے بہانے کیا تھے

○

گلاب کی رُت سے جاکے پوچھو، تھے پر مرے پاس تتلیوں کے
مگر وہ چشمِ زدن کہ تو بہ پہاڑ ٹوٹے تھے بدلیوں کے
وہ سارا الزام سر پہ لے کر خود اپنی قاتل ٹھہر چکی تھی
ہزار ڈھونڈو مری قبا پر نشاں ملیں گے نہ انگلیوں کے
قصور کس کا تھا کون جانے نہ ہم ہی سمجھے نہ تم پہ ظاہر
کسی طلب کا وجود ہیں ہم شگاف کہتے ہیں پسلیوں کے
نہ جانے کب بے صدا ہوا وہ نہ جانے کب بے ضرر ہوا وہ
اکیلا تن اس طرح تھا اس کا ہوں پر جدا جیسے تتلیوں کے
ہزار آنکھوں کے تیز نشتر مرے بدن میں چبھے ہوئے ہیں
رقیب آنکھیں سما گئی ہیں لگے ہیں تل مجھ پہ پتلیوں کے
وہ ایسا پتھر تھا جس کے اندر ہزار موسم چھپے ہوئے تھے
حسین لفظوں کے سچے موتی اسیر تھے اس کی انگلیوں کے
نسیم ہی تھی جو چل رہی تھی تھکن کے احساس کو سمیٹے
حسین خوشبو سے بکروں کو تو ناز اٹھانے تھے بجلیوں کے

○

اس طرح مجھ سے مخاطب ہے صداقت میری
زخم احساس کو دیتی ہے بصارت میری

اس نے مٹی کے کھلونے کی طرح توڑ دیا
کیوں خموشی کو نہ سمجھا وہ عبادت میری

میں جزیرے کی طرح گھر گئی طوفانوں میں
بے بسی لے گئی آنکھوں سے بصارت میری

جانے کب سمجھے گا کوئی مری آنکھوں کی زباں
جانے الفاظ سے کب ہوگی وضاحت میری

اپنے چہرے کو بھی دیکھوں ترے آئینے میں
تیرا مفہوم نظر آئے عبارت میری

روح میں پھر تجھے محسوس کیا ہے میں نے
پھر تجھے ڈھونڈنے نکلی ہے صداقت میری

کوئی سورج تو مری فکر میں نکلا ہوگا
آج تک مجھ کو جلاتی ہے تمازت میری

خاک ہو کر بھی رہوں تیری گزرگاہوں میں
فخر کرنا بھی سکھا دے گی قناعت میری

منتظر جس کے لیے روح کا سناٹا رہا
اُسی آواز کو ترسی ہے سماعت میری

تیرے احساس میں ڈوبی ہوئی خوشبو ہے نسیم
پھوٹ نکلے گی زمیں سے بھی صداقت میری

O

کوئی آواز ہو ٹوٹی ہوئی دیواروں سے
فکر جلنے لگی الفاظ کے انگاروں سے

دامنِ زیست میں داغوں کے سوا کچھ بھی نہیں
کیا خریدے گا کوئی شہر کے بازاروں سے

کیسا آسیب زدہ ہوگیا دنیا کا چلن
ڈر سا لگتا ہے مجھے اپنی ہی دیواروں سے
کون رویا تھا یہاں کس نے صدائیں دی تھیں
رات پھر پوچھ رہی تھی مری دیواروں سے
غم کو سینے سے لگا کر بھی رہی شاد نسیم
زندگی بوجھ ہے اٹھتی نہیں بیماروں سے

○

گئی رُتوں کے ہمارے ذمہ یہ کیسے کیسے حساب نکلے
شجر وفاؤں کے ہم نے بوئے کدورتوں کے عذاب نکلے
یہ کیسی صحرا سی زندگی ہے یہ پیاس کیسی ہے چاہتوں کی
پلٹ کے دیکھا تو ہر قدم پر محبتوں کے سراب نکلے
بس اک نظر میں متاعِ ہستی میں اِس کے قدموں پہ وار دوں گی
کبھی شبِ غم کی خامشی میں اگر مرا ماہتاب نکلے
سنی تھیں چہروں کی داستانیں مگر نقابوں کی زد میں دیکھا
کسی کا مفہوم پڑھ سکوں میں کوئی تو چہرہ کتاب نکلے
نسیم سچ ہے یہ زندگی تو طویل کانٹوں کی رہ گزر ہے
رضا کا پیکر بنوں خدایا جو زندگی کا جواب نکلے

○

تو ملے یا نہ ملے ذکر تو تیرا ہوگا
ہم سے تنہا نہ شبِ غم کا سویرا ہوگا
وہ جو ایک شخص پریشاں ہے جدا ہے تم سے
اس کو کچھ اور ہی حالات نے گھیرا ہوگا
اس گھڑی اپنی نگاہوں میں بسا لے مجھ کو
کل خدا جانے کہاں اپنا بسیرا ہوگا

تم سے محرومی کا احساس جلائے گا مجھے
تم ہی یاد آؤ گے جس دم کوئی میرا ہوگا
شام آئے تو سمجھنا کہ ہمارے دل میں
یاس کا درد جدائی کا اندھیرا ہوگا
اس لیے جلتی ہوں ہر شام کی تنہائی میں
سوچتی ہوں تری راہوں میں اندھیرا ہوگا
کس کی خوشبو لیے پھرتی ہے زمانے میں نسیم
گل کے پردے سے سخن پھر وہی تیرا ہوگا

□□

نسیم نیازی

نسیم اکبرآبادی آگرہ میں پیدا ہوئیں، بریلی کے مشہور خانوادۂ تصوف میں بیعت
ہیں جس کے بانی حضرت شاہ قطبِ عالم نیاز بے نیاز بریلوی تھے، اس نسبت سے وہ اپنے
نام کے ساتھ نیازی لکھتی ہیں۔ پچھلے چالیس پینتالیس سال سے دہلی میں مقیم ہیں اور اب
دہلی اُن کا وطنِ ثانی ہے۔ اس شہر کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی میں بہت محرک اور فعال
ہیں اور خواتین کی فلاح و بہبود سے متعلق بہت سی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔

سیاسی، سماجی اور فلاحی کاموں کے ساتھ نسیم کو شاعری کا بھی شوق ہے، گرچہ وہ پچھلے
تیس پینتیس برسوں سے باقاعدہ شاعری کر رہی ہیں لیکن غیر ادبی مصروفیتوں اور مشغلوں
نے اُن کی شاعری کو گہنائے رکھا اور اردو والوں کے سامنے آنے نہیں دیا، لیکن اب اُن
کا کلام اکثر رسالوں میں نظر آنے لگا ہے اور وہ مشاعروں و شعری نشستوں میں باقاعدہ
شرکت کر کے اپنی شاعری کا احساس کرانے لگی ہیں۔

شعر کہنے والی اکثر خواتین نظم و غزل کے دائروں تک ہی محدود رہتی ہیں اور حمد و نعت
کے کوچے کا رُخ نہیں کرتیں لیکن نسیم نیازی نے حمدیہ، نعتیہ اور منقبتیہ شاعری بھی کی ہے۔
نسیم کی شاعری کا یہ رُخ اُس بے پناہ عقیدت کی دین ہے جو ان کو اپنے پیر و مرشد سے
ہے۔ اسی عقیدت اور پیر و مرشد سے نسبت کا اثر ہے کہ اُن کے اکثر اشعار تصوف کے

رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں اور نسیم پر ایک صوفی شاعرہ کا گمان ہوتا ہے۔

''مہک''نسیم نیازی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو اردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے ۲۰۰۱ء میں منصۂ شہود پر آیا۔

نمونۂ کلام:

غزل

تو بھی وا کے درشن کر
آنکھ سے کالا چشمہ پھینک

چاند کا ٹیکا ماتھے پہ
اپنے جیون کا ابھیشیک

دور اندھیرے ہوتے ہیں
وا چوکھٹ پہ ماتھا ٹیک

شہرِ بریلی ہم تو چلے
کہا دیکھیں تلون کی ٹھیک

سگرا جگ وا کی سنتان
چاہے بد ہوجائے نیک

تپ کے کندن جیسا بن
پریم بھٹی میں من کو سینک

مت کہیو کاہو سے نسیم
دیکھی کس کی صورت ایک

○

ہم نے اشکوں سے ترا نام لکھا پانی پر
یوں سرِ شام جلایا ہے دِیا پانی پر

بھیگی پلکوں پہ اُبھرتے گئے یادوں کے نقوش
دیکھتے دیکھتے اک شہر بسا پانی پر
نئے موسم کی خبر خشک زمینوں کے لیے
تیرتا آتا ہے پتہ جو ہرا پانی پر
منحصر چار عناصر پہ ہے انساں کا وجود
نقش مٹی کا بنا آگ ہوا پانی پر
کسی زردار کے آگے نہ پسارا دامن
ایک خوددار کئی روز جیا پانی پر
کون گزرا ہے الجھتا ہوا موجوں سے نسیم
دور تک کس کے ہیں نقشِ کفِ پا پانی پر

○

سب کا اپنا اپنا منشاء سب کی اپنی سوچ
لفظوں کی شطرنج بچھا کر میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
ایک جگہ ٹھہرے ہی نہیں ہے ہر سو اُڑتی پھرتی ہے
رنگ برنگے پنکھوں والی کیسی انوکھی تتلی سوچ
تجھ سے مجھ سے کچھ امیدیں یہ الفاظ بھی رکھتے ہیں
کون پڑھے گا ان کی زباں کو کس کی ہے اتنی گہری سوچ
ہم ایسے دیوانوں کا اب ہوش میں آنا ناممکن
اپنی تو یونہی کٹ جائے گی اے ناصح تو اپنی سوچ
دھیان رہے ان آئینوں پہ گرد نہ جمنے پائے نسیم
ذہن نظر دل صاف رکھو یہ پھر نہ رہے گی دُھندلی سوچ

○

خواب جھٹک پلکوں سے پرانے آنے والے پل کی سوچ
پلکوں کی میلی چادر میں لپٹی ہوئی اجلی سوچ

میرؔ اور غالبؔ جیسے شاعر روز نہیں پیدا ہوتے
لفظوں کا بیوپار بہت ہے فکر کہاں کی کیسی سوچ
اِس دنیا کے رشتے ناطے مانا ہیں خود غرض بہت
سب نے اپنی اپنی سوچی لیکن تو تو سب کی سوچ
آج ہوا یہ کل کیا ہوگا کس نے کیا یہ کون کرے گا
آج تلک سب جس نے کیا ہے وہی کرے گا کل بھی سوچ
دیوانہ یہ ہوش کی باتیں کر ہی نہیں سکتا ہے نسیمؔ
دیوانے سے مت پوچھو یہ اس کی کہاں ہے اپنی سوچ

○

تو مرا کوئی نہیں ہے تو پھر ایسا کیوں ہے
دل ترے نام کو سنتے ہی دھڑکتا کیوں ہے
راستے اور بھی منزل کی طرف جاتے ہیں
میرے قدموں کے لیے ایک ہی رستہ کیوں ہے
کیا میں اپنے یہ خد و خال بھلا بیٹھی ہوں
آئینہ اس نے مرے سامنے رکھا کیوں ہے
ذہن میں اس کے یقیناً میں کہیں ہوں موجود
غیر کے خط میں مری سمت اشارہ کیوں ہے
بیتے موسم کی طرح تو بھی بھلا دے اے نسیمؔ
جو تجھے بھول گیا اس کی تمنا کیوں ہے

○

دل کا موسم ہے عجب تجھ سے ملاقات کے بعد
جیسے جلتا ہوا جنگل کوئی برسات کے بعد
تلخیٔ ہجر کا افسانہ سنانے کے لیے
کتنی راتیں ہیں ترے قرب کی اک رات کے بعد

پہلی بار آئینہ سچ بول رہا ہو جیسے
اپنی پہچان ہوئی تجھ سے ملاقات کے بعد
ہم تو سمجھے تھے اُسے دشمنِ دل قاتلِ جاں
کیا کہیں بدلی ہوئی صورتِ حالات کے بعد
روبرو تیرے زباں پر تو نہ لائے لیکن
ہم نے سوچیں کئی باتیں تری ہر بات کے بعد
دل نے طے کی ہے رفاقت کی یہ منزل تنہا
ہوش تو چھوڑ گیا ساتھ ترے ساتھ کے بعد

□□

نفیس بانو شمع

تجارت جیسے کل وقتی، صبر آزما اور پُر خطر پیشے سے تعلق رکھنے والی نفیس بانو شمع کی تخلیقی صلاحیتیں نظم ونثر دونوں کا روپ دھارتی ہیں، وہ شاعرہ بھی ہیں اور ادیبہ بھی۔ ''جنت سے نکالی ہوئی حوا'' (۱۹۹۸ء) شگفتہ اور سلیس نثر کا حامل ان کا مشہور سوانحی ناول ہے جو بہت دنوں تک اردو اخبارات اور رسائل میں موضوعِ بحث رہا۔

نفیس بانو شمع ۱۶ر مئی ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئیں۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ زمانۂ طالب علمی سے نظم ونثر میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر رہی ہیں۔ شاعری میں تلمیذ الرحمٰن ہیں۔ مطالعہ اور مشقِ سخن سے اپنی تربیت خود کی۔ مشاعروں کی دنیا ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی اس لیے مخصوص شعری نشستوں میں ہی شرکت کرتی ہیں۔

پہلا شعری مجموعہ '' کائنات پھر سناٹا'' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''سماج'' (ناول) ۱۹۸۶ء اور '' غیبی اشارے'' (پیش گوئیاں) ۲۰۰۲ء نفیس بانو شمع کی نثری تصانیف ہیں جو اب تک شائع ہو چکی ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

عظمت کا احساس کھنڈر میں زندہ ہے
مر کر بھی فنکار ہنر میں زندہ ہے
جانے والا جا بھی چکا اور قدموں کی
آہٹ اب تک راہگزر میں زندہ ہے
جب بھی دیکھوں لگتا ہے میرا بچپن
اک اُڑتی تتلی کے پر میں زندہ ہے
اک اک شے سے وابستہ ہے یاد اس کی
اب تک اس کی خوشبو گھر میں زندہ ہے
آج بھی اس کی یادوں کا ہر پل اے شمع
جیون کے خاموش سفر میں زندہ ہے

○

جو اوجھل ہے نگاہوں سے وہ منظر دیکھ سکتی ہوں
میں اب پرچھائیوں میں تیرا پیکر دیکھ سکتی ہوں
کسی کے ہجر نے بخشی ہے ایسی روشنی مجھ کو
میں تنہائی ترے چہرے کو چھوکر دیکھ سکتی ہوں
جو اک خاموش صحرا کی طرح معلوم ہوتی ہیں
میں ان آنکھوں میں پوشیدہ سمندر دیکھ سکتی ہوں
جدا ہوتے ہوئے وہ اپنی آنکھیں دے گیا مجھ کو
کہ اب میں خود کو آئینہ ہٹا کر دیکھ سکتی ہوں
بھرم اپنے سفر کا ہم سفر کوئی نہ رکھ پایا
ترے ہمراہ بھی کچھ دور چل کر دیکھ سکتی ہوں

○

سایہ مرا بن جائے مرے ساتھ رہے وہ
میں خود سے کروں بات تو چاہوں کہ سنے وہ
خاکہ ہوں تو پھر میری کوئی شکل ابھار لے
تصویر ہوں تو مجھ میں کوئی رنگ بھرے وہ
آجائے تو تنہائی کے اس شیلف سے نکلوں
کھل جاؤں کتابوں کی طرح اور پڑھے وہ
وہ خواب تھا جب تک تو رہا پھول کی صورت
اب ٹوٹ کے ہر پل مری آنکھوں میں چبھے وہ
میں شمع کہاں اب بھی انھیں بھول سکی ہوں
لوگوں نے بتایا ہے مجھے بھول گئے وہ

○

روح کی پیاس کو قطرے کا دلاسہ دیدے
میں نے کب تجھ سے کہا ہے مجھے دریا دیدے
لذتِ درد سے محروم نہ ہو جاؤں کہیں
وقت سے کہنا مجھے پھر کوئی صدقہ دیدے
اب تو اس آئینہ خانے میں بھی دم گھٹتا ہے
میرے مالک مجھے اک دوسرا چہرہ دیدے
زندگی تجھ سے میں کچھ اور نہ مانگوں گی، اگر
میرا بچپن، میری سکھیاں، مری گڑیا دیدے
کھوکھلے رشتوں کی اس بھیڑ میں تنہا ہوں بہت
اب مجھے میرا کوئی چاہنے والا دیدے
شمع خود سے مری پہچان تو کچھ رہ جائے
تو میرے حال کو ماضی کا حوالہ دیدے

○

خوش فہمیاں بہت تھیں وہ منظر بھی آئے گا
جو شخص جا چکا ہے پلٹ کر بھی آئے گا

بربادیوں پہ میری بہت خوش نہ ہو کہ اب
ان آندھیوں کی زد میں ترا گھر بھی آئے گا

مٹّی کا جسم لے کے چلے ہو تو سوچ لو
اک روز راستے میں سمندر بھی آئے گا

میں ایسے دیکھتی ہوں ہر اک رات چاند کو
جیسے وہ آسماں سے زمیں پر بھی آئے گا

دنیا کے اس سلوک کا غم شمع کس لیے
جب آئینہ ہو کوئی تو پتھر بھی آئے گا

○

شہرِ طرب میں بے چینی کے پہلو کون خریدے گا
دشتِ جاں کی خاطر غم کے آہو کون خریدے گا

طبلے کی ہر تھاپ پہ خوش ہیں، سب لیکن رقّاصہ کے
پاؤں رقص میں ٹوٹ گئے تو، گھنگھرو کون خریدے گا

جسم سبھی صندل جیسے ہوں چہرے ہوں پھولوں کی طرح
اس عالم میں موسمِ گل سے خوشبو کون خریدے گا

جس بستی کے ہر آنگن میں چاند اور سورج اُگتے ہیں
اس بستی میں رات ہوئی تو جگنو کون خریدے گا

اب میں شمع یہ سوچ رہی ہوں سیم و زر کی بارش میں
اِس پتّھر بستی میں میرے آنسو کون خریدے گا

□□

نگار عظیم

کہانی کار، نثر نگار اور شاعرہ نگار عظیم جو شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھنے اور تخلیقی قلم سنبھالنے سے پہلے ملکہ مہر تھیں ۱۹۵۱ء میں میرٹھ کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئیں جہاں علم و ادب کی جڑیں بہت گہری تھیں اور شعر و شاعری کا بازار گرم تھا۔ ان کے والد ثروت میرٹھی علمِ عروض کے ماہر اور کلاسیکی غزل کے ایک اچھے شاعر تھے۔ شاعری گرچہ شاعر باپ سے ورثہ میں ملی لیکن ان کی شاعری ان کے آرٹسٹ شوہر جناب عبدالعظیم صدیقی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے جنھوں نے نگار عظیم کا میلانِ طبع دیکھ کر ان کو نثر لکھنے کے ساتھ شعر کہنے کی بھی ترغیب دی۔

نگار عظیم ایم۔اے، پی ایچ ڈی ہیں۔ اسکول کی سطح پر درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ عام شاعرات کے برعکس مشاعروں کی دنیا سے دور رہتی ہیں۔ ان کی اب تک صرف چار نثری کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں جن میں دو افسانوی مجموعے ''عکس'' (۱۹۹۰ء)، ''گہن'' (۱۹۹۹ء)، ''منٹو کا سرمایۂ فن (۲۰۰۲ء) اور ''ہرچرن چاؤلہ: فن و شخصیت'' (۲۰۰۳ء) شامل ہیں۔

نمونۂ کلام:

غزل

جنونِ دل کا ابھی ترجمان باقی ہے
لبوں کو سی لیا لیکن زبان باقی ہے
گئی رُتوں کا ابھی تک نشان باقی ہے
گلی میں ایک شکستہ مکان باقی ہے
نہ پوچھیے ابھی عنواں میرے فسانے کا
یہ ابتدا ہے ابھی داستان باقی ہے
ڈبو دیا تھا کبھی جس کو تند طوفاں نے
اسی سفینے کا اک بادبان باقی ہے
ہزار بار زمانے نے کروٹیں بدلیں
ہمارے سر پہ وہی آسمان باقی ہے
اک آشیانے پہ بجلی گری تو رونا کیا
ہمارے واسطے سارا جہان باقی ہے
نگار خانۂ دل میں بسی ہے ویرانی
مکیں چلا گیا لیکن مکان باقی ہے

○

گزر گیا جو زمانہ عجیب لگتا ہے
گئی رُتوں کا فسانہ عجیب لگتا ہے
تم اپنے ساتھ ہی لے جاؤ اپنی یادوں کو
کہ چشمِ نم کا چھپانا عجیب لگتا ہے
نہ ہاں نہ ہوں نہ کوئی سلسلہ نگاہوں کا
یہ خامشی کا فسانہ عجیب لگتا ہے

ہر ایک زخم میرا پھول بن گیا شاید
کہ اب بہار کا آنا عجیب لگتا ہے
کسی کے پیار کا شعلہ بجھا دیا تھا نگار
وہ شعلہ پھر سے جگانا عجیب لگتا ہے

○

تقدیر کے خطوط میں الجھی ہوئی ہوں میں
خود اپنے واسطے ہی پہیلی ہوئی ہوں میں
یہ رنگ روپ پہلے تو ایسا نہ تھا میرا
اس زندگی کی دھوپ سے میلی ہوئی ہوں میں
کرتو دیا ہے اس نے مجھے دل بدر مگر
کاجل سی اس کی آنکھ میں پھیلی ہوئی ہوں میں
کس کی گلی کا جھونکا مجھے آ کے چھوگیا
اس موسمِ خزاں میں بھی مہکی ہوئی ہوں میں
اس کی نظر میں کتنی تمازت تھی اے نگار
مدت ہوئی پر آج بھی پگھلی ہوئی ہوں میں

○

اب کہاں عشق کا زمانہ ہے
ہر طرف جنگ کا فسانہ ہے
دوستی کیا ہوئی وہ برسوں کی
اب میرا گھر تیرا نشانہ ہے
دیکھ لی نفرتوں کی آگ مگر
بھڑکے شعلوں کو اب بجھانا ہے

کیا خبر کیا ہے مصلحت اس کی
کیا کرشمہ کوئی دکھانا ہے
اس صدی میں نگارؔ جی کر تم
کیا کروگی کہاں ٹھکانا ہے

○

محرومئی نظر نے دلاسے دیے بہت
یوں ہم نے آندھیوں میں جلائے دیے بہت
وہ سلسلے وفاؤں کے سب رائیگاں گئے
اس نے مجھے بساط کے طعنے دیے بہت
دیدہ وری پہ اپنی بہت تھا گماں تمھیں
دیدہ وری نے ہی تمھیں دھوکے دیے بہت
اللہ میری سادگی خود میں نے ہی اسے
غیروں سے رسم وراہ کے موقعے دیے بہت
غم مستقل مزاج تھا ٹس سے نہ مس ہوا
میں نے اسے فرار کے رستے دیے بہت
شعلہ فشاں نہ کیوں میرا لہجہ ہو اے نگارؔ
دنیا نے ہر قدم پہ شرارے دیے بہت

○

تمام عمر کٹی دل کا چاک سینے میں
ہزار بار مرے اک حیات جینے میں
ترا خیال کچھ ایسے نہاں ہے دل میں مرے
کہ جیسے رنگ سمائے کسی نگینے میں

قدم قدم پہ بہاریں پکارتی ہیں مجھے
میں شاد رہتی ہوں زہراب غم کا پینے میں
یہ کسی فضا کا تعارف ہوائیں دیتی ہیں
کہ سارا باغ شرابور ہے پسینے میں
نگآر کیسی شمع جل رہی ہے محفل میں
کہ لَو بھڑکتی ہے ہر لمحہ میرے سینے میں

OO

نور جہاں ثروت

ہندوستان میں اردو اخبارات و رسائل اور خاص طور پر روزناموں کی - Male
Dominated صحافتی دنیا میں سب سے پہلا قدم رکھنے اور اردو صحافت کی خاتونِ اول
کہلائی جانے والی نور جہاں ثروت پرانی دہلی کے قدامت پرست گھرانے اور اخلاقی،
مذہبی وسماجی بندشوں میں جکڑے ہوئے ماحول سے نکل کر دہلی کے شعری وادبی منظرنامے
پر ابھرنے والی پہلی شاعرہ بھی ہے۔ گرچہ تسنیم مخموری کو دہلی کے شعری منظرنامے پر ابھرنے
والی پہلی دہلوی شاعرہ کہا جاتا ہے لیکن تسنیم کی پیدائش اور تربیت پٹودی میں ہوئی جہاں ان
کے والد جناب مخمور دہلوی نواب پٹودی کے دربار سے وابستہ تھے۔ نور جہاں ثروت ان
معنوں میں خالصتاً دہلی والی ہیں کہ ان کی پیدائش اور تمام تر تعلیم وتربیت اسی شہر میں
ہوئی۔

نور جہاں ثروت کی شاعری ان کے والد کے اعلیٰ شعری ذوق کی دین ہے۔ ان کے
والد فضل الرحمٰن صاحب مرحوم پشتینی دہلی والے تھے اور اردو شعر وادب پر گہری نگاہ رکھتے
تھے۔ خود شعر گو نہیں تھے لیکن بلا کے شعر اور شاعر نواز تھے۔ فضل صاحب کی شعر وادب
سے غیر معمولی دلچسپی، شعراء کرام سے دوستی اور گھر میں آئے دن شعری نشستوں نے
نور جہاں کی تخلیقی صلاحیتوں کو متاثر کیا اور اوائلِ عمر میں تنگ بندیوں نے جنم لینا شروع

کر دیا۔ تک بندیوں کا سلسلہ اسکول کی سطح تک جاری رہا، کالج اور یونیورسٹی میں پہنچ کر یہ تک بندی با قاعدہ شعر گوئی میں ڈھل گئی۔

۱۹۴۹ء میں متولد نور جہاں ثروت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ دہلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کی ڈگری لے کر کچھ عرصہ تک ذاکر حسین کالج کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہیں۔ اُس کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اردو سیل اور ریڈیو براڈ کاسٹنگ کے تجربات سے گزر کر ۱۹۸۰ء میں جب دہلی سے روزنامہ قومی آواز کی اشاعت شروع ہوئی تو اس کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئیں، اس وقت تک اردو روزناموں کی صحافت خواتین کے لیے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی اور اردو اخبارات میں خاتون ورکنگ جرنلسٹ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ثروت نے اپنی خداداد ذہانت و قابلیت اور صلاحیت سے نہ صرف دلّی کے صحافتی حلقوں میں اپنی شناخت قائم کی بلکہ قومی آواز کے ادارے میں جہاں ایک سے ایک تجربہ کار اور منجھا ہوا صحافی موجود تھا، قلیل عرصہ میں اپنے لیے ایک مقام بھی پیدا کر لیا۔

۱۹۸۶ء میں جب لیبر یونین کے ہنگاموں کی وجہ سے ''قومی آواز'' کی اشاعت بند ہوئی اور انقلاب پبلی کیشنز لمٹیڈ بمبئی نے ایک اچھے اخبار کی کمی کو پورا کرنے کے لیے دہلی سے روزنامہ انقلاب کی اشاعت شروع کی تو نور جہاں ثروت دہلی ایڈیٹر کے طور پر انقلاب سے وابستہ ہو گئیں۔ دہلی اور اس کے قرب و جوار کی اردو دنیا ''انقلاب'' کو راس نہیں آئی اور دو سال کے بعد ہی بند ہو گیا لیکن وہ دہلی بیورو چیف کے طور پر آج بھی روزنامہ انقلاب سے وابستہ ہیں۔

ثروت تلمیذ الرحمٰن ہیں، مشاعروں میں دیگر شاعرات کے برعکس تحت میں پڑھتی ہیں۔ تحت میں پڑھنے والی شاعرات عام طور پر مشاعروں میں پسند نہیں کی جاتیں لیکن وہ مشاعروں کی مقبول شاعرہ ہیں اور ملک و بیرونی ممالک کے مشاعروں میں اپنی فکر اور لہجے کی انفرادیت سے شعر فہم سامعین پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''بے نام شجر'' چند برس قبل منصۂ شہود پر آیا جس کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔

نمونۂ کلام:

غزل

وہ وفا کیش تھا دل زخموں کا محشر نکلا
حال اس کا تو مرے حال سے بدتر نکلا

خوف اتنا تھا کہ خوابوں نے چرالی آنکھیں
ذہن کے بند دریچوں سے نہ منظر نکلا

کربِ تنہائی کا عالم تھا کہ رشتوں کا فریب
عمر بھر گھر میں رہا، پھر بھی وہ بے گھر نکلا

میں نے سمجھا تھا محبت کا مسافر جس کو
وہ بھی میری ہی طرح میل کا پتھر نکلا

آگہی نے یہ عجب رنگ دکھایا ثروتؔ
پیکرِ نور بھی ظلمت کا سمندر نکلا

○

پیاس جو بجھ نہ سکی اس کی نشانی ہوگی
ریت پر لکھی ہوئی میری کہانی ہوگی

وقت الفاظ کا مفہوم بدل دیتا ہے
دیکھتے دیکھتے ہر بات پرانی ہوگی

کر گئی جو مری پلکوں کے ستارے روشن
وہ بکھرتے ہوئے سورج کی نشانی ہوگی

پھر اندھیرے میں نہ کھو جائے کہیں اس کی صدا
دل کے آنگن میں نئی شمع جلانی ہوگی

اپنے خوابوں کی طرح شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھول
چن رہی ہوں کوئی تصویر سجانی ہوگی

بے زباں کر گیا مجھ کو تو سوالوں کا ہجوم
زندگی آج تجھے بات بنانی ہوگی
کر رہی ہے جو مرے عکس کو دھندلا ثرؔوت
میں نے دنیا کی کوئی بات نہ مانی ہوگی

○

رفاقتوں نے دیے ہیں مجھ کو، عداوتوں کے عتاب سارے
مرے ہی دل پر ہوئے ہیں نازل محبتوں کے عذاب سارے
خوشی کی محفل نہ راس آئی ہزار چاہا کہ مسکرائیں
تپش سے غم کی جھلس گئے ہیں شگفتگی کے گلاب سارے
یہی ہے تدبیر حسن گلشن، عوض گلوں کے ملے ہیں کانٹے
عجیب قسمت کا ہے کرشمہ، گنہ بنے ہیں ثواب سارے
غرور سے سر اٹھا رہے تھے، وہ جشنِ ہستی منا رہے تھے
ہوا نے کھینچا جب اپنا دامن، ہوا ہوئے پھر حباب سارے
وہ خوشبوؤں کا لباس پہنے ملا کچھ ایسے کہ ایک پل میں
پڑے ہوئے تھے جو جسم و جاں پر اُتر گئے وہ نقاب سارے
سوال سادہ سا زندگی سے کیا تھا ہم نے بھی ایک ثرؔوت
وہ پتھروں کی ہوئی ہے بارش کہ مل گئے ہیں جواب سارے

○

مرے ماضی کی وہ تصویر دکھاتا ہے مجھے
آبگینوں کی قطاروں میں سجاتا ہے مجھے
وقت کے بند دریچوں سے نہ جانے کیوں کر
ایک جھونکا ہے ہوا کا کہ بلاتا ہے مجھے
مدتیں گزریں بھلائے ہوئے اس کو لیکن
ہاں، خیال اب بھی کبھی آ کے ستاتا ہے مجھے

اس کے ہاتھوں کا میں شہکار ہوں اب کیا کیجیے
سوکھی مٹی سے وہ فنکار بناتا ہے مجھے

وادیٔ جاں ہے کہ سمٹا ہوا صحرا ثروتؔ
کوئی سورج ہے کہ ذرّوں میں چھپاتا ہے مجھے

○

کبھی کتابِ زیست ورق ورق، کوئی سلسلہ ہی نہ مل سکا
کسی ذات کا کسی نام سے کوئی رابطہ ہی نہ مل سکا
کوئی خواب تھا کہ خیال تھا وہ سرور تھا کہ سراب تھا
کھلی آنکھ دیکھا جو غور سے، کوئی فیصلہ ہی نہ مل سکا
نہ تھی دور منزلِ آرزو دلِ خوش گماں کا قصور کیا
سرِ راہ ایسا غبار تھا ہمیں راستہ ہی نہ مل سکا
عجب ابتدا ہوئی عشق کی کہ مزاج ایسا بدل گیا
کہیں اور دل کو لگا سکیں ہمیں حوصلہ ہی نہ مل سکا
کہو ثروتؔ اب بھی اکیلی ہو، نئی راہ تم نے چنی تھی کیا
کسی رہ نما کا گلہ ہے یا کوئی قافلہ ہی نہ مل سکا

شہرِ ادراک

تلخیاں جب بڑھیں
شہرِ ادراک کی
سارے رشتے کسی بھیڑ میں کھو گئے
قربتیں ذہن خلاق کی یوں بڑھیں
ایک تصویر ابھری، مگر مٹ گئی
قربتیں ــــــ

فاصلے ــــ !
چاہتیں ــــ
نفرتیں ــــ !!
ذہن سادہ میں پلتی رہیں روز و شب
اور پھر ایک دن
سارے رشتے، سبھی قربتیں
اور ہم
جانے کس موڑ پر
کس اندھیرے بھنور میں بکھرتے گئے۔

پسِ آئینہ

وہ لڑکی آج جو خاموش ہے اتنی
کبھی ہونٹوں سے اس کے
پھول جھڑتے تھے
شرارت پتلیوں میں رقص کرتی تھی
مباحث روز استدلال پر عش عش کیا کرتے
وہ چنچل، خوبصورت، خوش ادا
بہار صبح کا وہ
ایک خوش احساس جھونکا تھی
ابھی تک نام پر اس کے
ہزاروں دل دھڑکتے ہیں
وہ کیا تھی کیا بتاؤں میں
متانت اس کا شیوہ تھا

ملاحت کی علامت تھی
کسی ساتھی، کسی دمساز کی
خواہش نہ تھی اس کو
وہ رشتوں کے سرابوں سے
ہمیشہ دور رہتی تھی
وہی جو وقت کی ویران سرحد پر
نجانے کب سے یوں افسردہ بیٹھی ہے
کسی سے کچھ نہیں کہتی۔

مآخذ

(شعرائے متقدمین ومتاخرین کے کوائف اور نمونۂ کلام حاصل کرنے کے لیے جن کتابوں سے مدد لی گئی)

	کتاب	سنہ	مصنف/مرتب
۱۔	یہ تھی دہلی	(۱۹۷۵ء)	طالب دہلوی
۲۔	میر مہدی مجروح حیات وتصانیف	(۱۹۹۹ء)	ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی
۳۔	تذکرۂ سائل	(۱۹۷۵ء)	مولانا واصف دہلوی
۴۔	خاندانِ لوہارو کے شعراء	(۱۹۸۱ء)	حمیدہ سلطان احمد
۵۔	بیخود دہلوی	(۱۹۸۰ء)	مرتبہ: ڈاکٹر کامل قریشی
۶۔	دیوانِ راسخ	(۱۹۳۷ء)	مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلوی
۷۔	دیوانِ ہاجر		ہاجر دہلوی
۸۔	خمستان کیفی		چندر بھان کیفی دہلوی
۹۔	آصف علی اور ارونا آصف علی	(۱۹۹۹ء)	ڈاکٹر خلیق انجم
۱۰۔	دیر وحرم	(۱۹۵۴ء)	شنکر لال شنکر کا شعری مجموعہ، مرتبہ ساحر ہوشیار پوری
۱۱۔	نکہتِ گل	(۱۹۵۷ء)	علیم اختر مظفر نگری
۱۲۔	خدنگِ ناز	(۱۹۶۴ء)	شیر سنگھ جین ناز دہلوی، مرتبہ طالب دہلوی
۱۳۔	کتاب نما	(دسمبر ۱۹۹۲ء)	غلام ربانی تاباں نمبر
۱۴۔	سازِ جنوں	(۱۹۶۸ء)	آزردہ دہلوی
۱۵۔	حرف وصدا	(۱۹۸۲ء)	ہیرا لال فلک دہلوی
۱۶۔	متاعِ زندگی	(۱۹۶۹ء)	صدرالدین احمد صدر دہلوی
۱۷۔	دلّی حرف حرف چہرے	(۱۹۹۷ء)	عظیم اختر
۱۸۔	دلّی میری بستی میرے لوگ	(۲۰۰۰ء)	عظیم اختر